و بینک لمیٹڈ

THE MUSLIM CO-O

Administrative Office (w
Share & Recovery Dept 6
Golden Jubilee Technical Institu
Phones 6448993, 644897
Fax No 6448977, Chairman :

"A leading progressive bank where cu

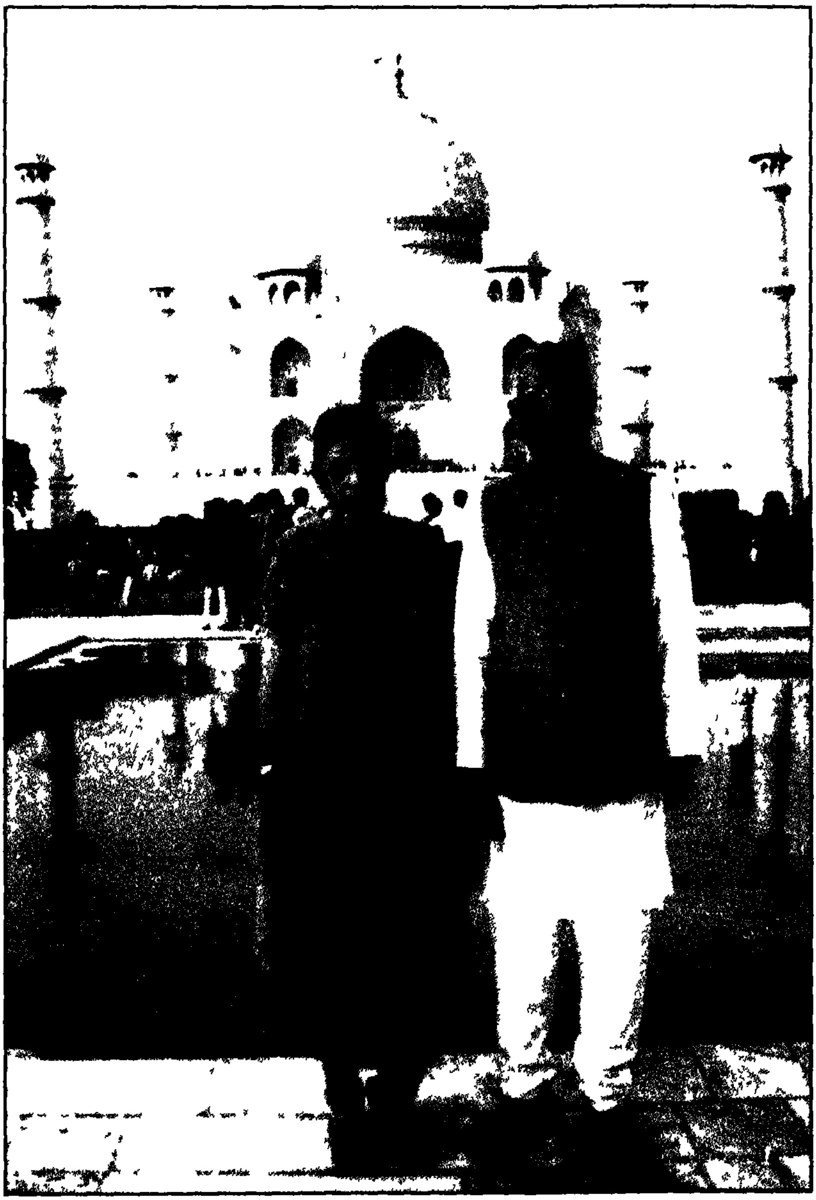
FINANCIAL POSITION AS

Share Capital	
Reserve & Other Funds	
Deposits	
Advances	
No of members	
Net Profit as on 31-3-200	
Dividened paid 2000-2001	12%
Rebate Paid 2000-2001	7% to 9%
Bonus paid 2000-2001	11 69%
No of Branches	17 + 1
Audit Class	" A "

- Higher rates of interest on all types of deposits than the rate of interest offered by the commercial & nationalised banks.
- Various schemes of deposits to suit all pockets
- Safe Deposit Locker facilities at our Camp, Mominpura, Wanorie & Kondhwa Branches.
- On-line computerised services at all branches.
- An excellent and prompt service to our customers
- New Branches opening shortly at Mal
  & Bhiwandi at Thane District.

BOARD OF DIRECTORS

Mr P A. Inamdar	- Chairman	Mr M F.A
Mr Imtiyaz L Shikilkar	- Director	Mr Shafi
Mr Arif Gulab Bagwan	- Director	Mr Ayub
Ms Mumtaz Z Sayed	- Director	Mr Md
Mr Riyaz Ahmed Kazi	- Director	Mr Sali
Mr Ab. Qayyum B Shaikh	- Director	Mr Alim
Mr Luqman H Khan	- Staff Director	Mr Yus
Mrs Noorjahan N Kazi	- Director	Mr Vijay
Mr Aslam A.R. Bagwan	- Director	Mr Abd
Mr Chand Sardar Shaikh	-Co-opted	Mr Abd
Mr Imtiaz S A. Mulla	-Staff Director	Mr Maz



نظم ہم سے ہے غزل ہے ہم سے — سارا تخلیقی عمل ہے ہم سے

فکر و فن کے ہیں شہنشہ ہم بھی — شعر کا تاج محل ہے ہم سے

(نذیر فتح پوری)



کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر خلیق انجم اور علی سردار جعفری، آر این ڈی پونہ میں غالب کی دو صد سالہ تقاریب کے جلسہ میں



کالی داس گپتا رضا، علی سردار جعفری، نادرہ ببّر شولاپور میں۔ "یہ منظر اب نہ دیکھیں گے کبھی ہم"



۲۱/ مارچ ۲۰۰۱ء کو "پدم شری ایوارڈ" حاصل کرنے سے پہلے ہی رضا صاحب اپنے مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔
بعد از مرگ، ان کی بیگم محترمہ ساوتری اور بیٹی ریتا ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے۔

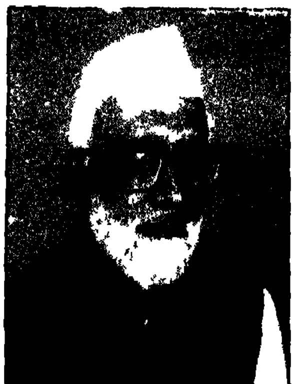


لندن میں عالمی اُردو کانفرنس کا ایک منظر

جس کے دم سے منظروں میں جان تھی   اب وہی پس منظروں میں جا بسے

(نذیر)





مرتّبین

نذیر فتح پوری

امین حزیں

سنجے گوڑبولے





لندن میں قرۃ العین حیدر،
رضا صاحب کو غالب ایوارڈ پیش کرتے ہوئے۔



سماعت ہے ہواؤں کی جہاں تک
مری آوار پہنچے گی وہاں تک
(مدیر فتح پوری)
(لندن کی عالمی اُردو کانفرنس سے حطاب کرتے ہوئے)



رضا صاحب کے بیروبی کے مکاں کی بیٹھک میں ایک محفلِ مشاعرہ۔ (دائیں سے) ظفراللہ عاصی، رضا صاحب، ایک مہمان، رضا صاحب کا بیٹا وِمل۔ (اوپر صوفے پر دائیں سے) جسٹس چانن سنگھ شفق، وجے ارون کلام پڑھتے ہوئے۔ (نیچے ریکارڈنگ کرتے ہوئے) چمن لال چمن



کالی داس گپتا رضا، "پنجاب شرومنی ایوارڈ" حاصل کرتے ہوئے۔ (فروری ۲۰۰۱ء)



ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ساتھ کالی داس گپتا رضا آگرہ میں میکش اکبر آبادی ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے۔

اشاعت کا اکیسواں سال

اَسباق

پونہ (مہاراشٹر)

جولائی ۲۰۰۱ء سے مارچ ۲۰۰۲ء تک

فون 6687138

بہ یاد

کالی داس گپتا رضا

مُدیر

نذیر فتح پوری

معاون مدیر

امینِ حزیں

معاونین

عبدالاحد ساز ۔ دلدار ہاشمی

کمپیوٹر کمپوزنگ

مدنی گرافکس، 6361178

زرِ سالانہ	عام 80 روپئے	
لائبریریوں سے	100	روپئے
خصوصی تعاون	200	روپئے
لائف ممبر شپ	2000	روپئے

اس شمارے کی قیمت -/Rs. 200

مُشیرانِ خصوصی

بھگوان کھلنانی ساقی	پونہ
ترنّم ریاض	دہلی
اقبال حمید	پونہ
عبدالحمید خاں ساٹے ۔	پونہ
دیپک قمر	میرٹھ
فراغ روہوی	کلکتہ
کلیم ضیاء	ممبئی
کوثر صدیقی	بھوپال
فاروق انجینئر	جے پور
آکھی جیت جوتی	پونہ

پرنٹر، پبلیشر اور پروپرائٹر

نذیر فتح پوری نے پربھات پریس پونہ سے چھپواکر وِماں درش، لوہ گاؤں روڈ، پونہ سے شائع کیا

پتہ

سائرہ منزل، 230 / B - 102، وِماں درش، سنجے پارک، لوہ گاؤں روڈ، پونہ نمبر 411 032، مہاراشٹر (بھارت)

ڈاکٹر اُدے سرن ارمانؔ کی تصانیف

Urdu Poet and writer

Recipient of seven literary awards, Member of I V C S London

مسلمان کا مندر (ہندی ناول)

آشیرواد (ہندی ناول)

ساز و آواز (شعری مجموعہ)

راز و نیاز (شعری مجموعہ)

ارمانِ دل (اُردو قطعات)

آئینے (اُردو قطعات)

ماں سرودور (افسانوی مجموعہ) (انعام یافتہ، انگریزی، ہندی، اُردو تینوں رسالوں میں)

ہر بار کہا دل نے (افسانوی مجموعہ) (انعام یافتہ)

دھوپ کے ٹکڑے (افسانوی مجموعہ) (انعام یافتہ)

ذرّہ ذرّہ سورج (افسانوی مجموعہ) (انعام یافتہ)

کرنوں کے پدچِہ (ہندی مضامین)

میٹھے بول (ہندی قطعات)

ملنے کا پتہ

Udai Palace, Station Road, Bilari,

Dist Moradabad, (U P) Pin 202411

فہرست

اداریہ

گفت باہمی

علامہ کالی داس گپتا رضا کی پہلی برسی کے موقع پر "اسباق" کی جانب سے علامہ کالی داس گپتا رضا نمبر شائع کیا جارہا ہے۔ اس سے بڑھ کر ہم انہیں اور کیا خراج عقیدت پیش کرسکتے ہیں۔ نمبر میں شامل بعض مضامین و مقالات میں کہیں کہیں یکسانیت نظر آئے گی جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر لکھنے والوں نے رضا صاحب پر پہلی بار قلم اُٹھایا ہے۔ لہٰذا پیدائش کی تاریخ، جائے پیدائش، تعلیم، آبائی وطن، مشرقی افریقہ میں ان کا قیام، غالب، "دیوانِ غالب تاریخی ترتیب سے"، چکبست اور جوش ملسیانی پر ان کے وقیع تحقیقی کاموں کا حوالہ ہر مضمون میں ملتا ہے۔ ان کی شرافت اور ادب نوازی کے تذکرے بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔ ہم نے بھی یہی چاہا ہے کہ ان کی کتابوں پر تو کبھی بھی لکھا جاسکتا ہے لیکن ان کی باتیں، ان کی یادیں جو ذہنوں میں محفوظ ہیں ان کو پہلے سپردِ قرطاس کے حوالے کرکے شائع کردیا جائے۔ ہمارے یہاں چونکہ فنکاروں کو بھلا دینے کا عام رواج ہے، دو چار برسوں بعد ہمارے بڑے سے بڑے فنکار کو بھی ماضی کی کتاب کا ایک باب بناکر الماری میں بند کردیا جاتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ اس لیے ہم نے اکثر مضامین میں رضا صاحب کی ان باتوں کو محفوظ کیا ہے جو ذہنوں اور دلوں میں محفوظ تھیں۔ ان کے ادبی سفر کے حالات بھی فرمائش کرکے لکھے گئے ہیں، تاہم ان کے ادے پور اور جودھپور کے سفری حالات اور آگرہ کا سفر نامہ کوشش کے باوجود ہم حاصل نہ کرسکے۔

ہم نے اس نمبر کو اپنے طور پر کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ رضا صاحب کے فکر و فن کی تمام جہتوں کو الگ الگ ابواب میں پیش کرکے 'رضا فہمی' کے لیے نئے راستے بھی فراہم کیے ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہم نے رضا فہمی کے سلسلے کی ابتدا کی ہے۔ اس مکالمے کو آگے بڑھانے کے وقیع امکانات موجود ہیں جن پر کام کیا جاسکتا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کام ضرور ہوگا۔

نمبر کی اشاعت کے لیے جن حضرات نے تعاون فراہم کیا ہے ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

رضا صاحب کے فکر و فن پر غیر مطبوعہ مضامین اب بھی محفوظ ہیں جنہیں ہم "اسباق" کی آئندہ اشاعتوں میں شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔

رضا صاحب کی اہلیہ کے گزر جانے کے بعد ان کے علمی ادبی سرمایے کا کیا ہوگا اس کا علم کسی کو نہیں لیکن اس کی پامالی کا احساس کرکے دل مضطرب ہے۔

فقط نذیر فتحپوری

انتساب



ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

کے نام

مُرتّبین

علامہ کالی داس گپتا رضا ایک نظر میں

نام	کالی داس	جائے پیدائش	مکند پور، ضلع جالندھر، پنجاب
سن ولادت	۲۵ر اگست ۱۹۲۵ء	گوت	متل، گپتا
تخلص	رضاؔ	شریک حیات	ساوتری گپتا
اولاد	ومل گپتا، ریتا گپتا	تلمذ	ابوالفصاحت لبھو رام جوش ملسیانی جانشین داغؔ

تعلیم میٹریکولیشن (پنجاب یونیورسٹی)۔ سینئر کیمبرج (لندن)۔ لندن کے متعدد اکاؤنٹس امتحانات بیرسٹری (لنکز ان لندن)۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو فارسی کی تعلیم۔ ادیب فاضل اور منشی فاضل تک

تصانیف شعلہ خاموش (مجموعہ کلام)، شورش پنہاں (مجموعہ کلام)، شاخ گل (مجموعہ کلام)، اُجالے (نعتیہ کلام)، گیت اور سخن، شعورِ غم (رثائی کلام)، شعاع جاوید (رباعیات)، دی سائلنٹ فلیم (انگریزی شاعری)، اوڈ ٹو ایسٹ ونڈز (انگریزی شاعری)، غزل گلاب (غزلیات)، نظم سمندر (نظمیں)، قدسی الٰہ آبادی اور نعت قدسی، ہندوستانی مشرقی افریقہ میں، علی سردار جعفری اپنی نظموں کی نظر میں، سہو و سراغ، فرہنگ عارفاں، بہار اُردو گلشن مشرقی افریقہ میں، منثورات جوش ملسیانی، مکتوبات جوش ملسیانی، جوش ملسیانی انتخابِ کلام، چکبست اور باقیاتِ چکبست، کلیات چکبست، مقالات چکبست، چکبست کچھ بازدید کچھ پیش رفت، انتخابِ آتش و غالب از چکبست، متعلقات غالب، آبِ حیات میں ترجمہ غالب، دعائے صباح، غالبیات چند عنوانات، دیوان غالب (۱۸۴۱ء) عکسی، دیوان غالب (۱۸۶۲ء) عکسی، دیوان غالب متداول تاریخی ترتیب سے، غالبؔ دروں خانہ، غالب کی بعض تصانیف، پنج آہنگ میں مکاتیب غالب، غالبیات چند شخصی اور غیر شخصی حوالے، اسد اللہ خاں غالب مرد، غالب کا ایک مشاق شاگرد، بالمکند بے صبرؔ حیات اور انتخابِ تصانیف، غالبیات کچھ مطالعے اور مشاہدے، دیوانِ غالب کامل نسخہ گپتا رضاؔ (پانچواں ایڈیشن، باتصویر)، انتخابِ رقعات و اشعار غالب، اقبال کی خامیاں، غبار کارواں، آسماں اکیلا (ہندی)، جہان استاد داغ دہلوی، احترام (نعتیہ)، کمالِ باکمال، رسالہ استادِ شاعری، غالب مختصر کوائف و شرح منتخب اشعار، یگانے بیگانے، حرفِ مدعا، ابھی تازہ مادھو (مجموعہ غزلیات رضاؔ)، انتخاب غزلیات فراقؔ، ذوقؔ دہلوی مختصر کوائف۔ مستند کلام، رفتگاں کے ساتھ، غالبیات متفرق مضامین، اہم - غیر اہم، حرف گیر، توضیحیں (میرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، داغؔ)

آخری سفر ۳۱ر مارچ ۲۰۰۱ء بمقام دہلی۔ شریک حیات کی موت ۱۴ر جنوری ۲۰۰۲ء

کالی داس گپتا رضا کے فکر و فن پر خصوصی رسائل کی اشاعت (۱) دہلی کے رسالے "تناظر" نے آٹھ سو صفحات کا نمبر شائع کیا۔ (۲) ماہنامہ "شاعر" ممبئی نے وقیع گوشہ شائع کیا۔ (۳) ماہنامہ "سہیل" (گیا، بہار) نے گوشہ شائع کیا۔ (۴) ماہنامہ "طلوع افکار" کراچی پاکستان نے اہم گوشہ شائع کیا۔ (۵) سہ ماہی "ترسیل" ممبئی نے گوشہ شائع کیا۔ (۶) سہ ماہی "سفیر اردو" لیوٹن نے گوشہ شائع کیا۔

بعد از مرگ (۱) ماہنامہ "آجکل" دہلی نے گوشہ شائع کیا۔ (۲) ماہنامہ "ایوان اردو" دہلی نے گوشہ شائع کیا۔ (۳) ہفت روزہ "ہماری زباں" دہلی نے اپنے چار شماروں میں رضا نمبر شائع کیا۔ (۴) سہ ماہی "سفیر اردو" لیوٹن نے گوشہ شائع کیا۔ (۵) رہنمائے تعلیم دہلی نے نمبر شائع کیا۔

فکر و فن پر شائع شدہ کتابیں

۱ کالی داس گپتا رضا تصنیف و تالیف و شعر کی روشنی میں از ظفر ادیب۔ ۲ نارش ادب کالی داس گپتا رضا از ڈاکٹر تارا چرن رستوگی۔ ۳ شاعر خوش نما از قمر جلال آبادی۔ ۴ ایک نابغہ جو ابھی پورا پہچانا نہیں گیا۔ انگریزی The Genius not Fully Known از پی کے کھاون۔ ۵ کالی داس گپتا ایک کبھی نہ تھکنے والا فنکار۔ انگریزی A Tireless Pen از سرسوتی سرن کیف۔ ۶ ذکر رضا (نظم) از عابد مامدوی۔ ۷ رضا اور غالبیات از شیں کاف نظام۔ پیشکش ساحر شیوی۔ ۸ شعریات گپتا رضا از متر نکودری۔ ۹ کالی داس گپتا رضا بحیثیت ماہر غالب و غالبیات از ظفر ادیب مؤلف ساحر شیوی۔ ۱۰ گپتا رضا شخص اور شاعر از ساحر شیوی۔ ۱۱ دانشور گپتا رضا از اعجاز سیمابی۔ ۱۲ جہاں گپتا رضا از مدیر فتح پوری۔ ۱۳ متعلقات کالی داس گپتا رضا از ساحر شیوی۔

بعد از مرگ ۱ محقق غالب کالی داس گپتا رضا از محمد عارف خاں۔ ثاقب صدیقی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ ۲

۳ کالی داس گپتا رضا کی موضوعاتی یادداشتیں از مدیر فتح پوری غیر مطبوعہ۔

کالی داس گپتا رضا کے فکر و فن پر Ph D کے لیے لکھے گئے مقالے

۱ کالی داس گپتا رضا حیات اور کارنامے از ڈاکٹر راہی قریشی، گلبرگہ۔ ۲ کالی داس گپتا رضا بطور غالب شناس از عظمت رباب۔ گورنمنٹ کالج، لاہور۔ ۳ کالی داس گپتا رضا بطور شاعر از نرگس مفتی گورنمنٹ کالج لاہور

ایوارڈ (۱) صف اوّل کا غالب ایوارڈ ۱۹۸۹ء (دہلی)۔ (۲) کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ ۱۹۹۶ء (دہلی اردو اکادمی)۔ (۳) سراج اورنگ آبادی ایوارڈ ۱۹۹۷ء (مہاراشٹر اردو اکادمی)۔ (۴) عالمی فروغ ادب ایوارڈ دوحہ قطر (۱۹۹۹ء)۔ (۵) میکش اکبر آبادی ایوارڈ ۲۰۰۰ء (آگرہ)۔ (۶) پنجاب شرومنی ایوارڈ (۲۰۰۱ء) (۷) پدم شری ایوارڈ (۲۰۰۱ء)

☆☆☆

کہتے ہیں اہل علم تجھے غائبانہ کیا

صفحہ

کہتے ہیں اہلِ علم تجھے غائبانہ کیا !

☆ شمس الرحمٰن فاروقی رانی منڈی، الٰہ آباد، یوپی

علامہ رضا صاحب کی تحقیق کا امتیازی وصف ان کے حقائق اور نتائج کی صحت اور ان کی تلاش و دور رسی تھی۔ ہم میں سے اکثر کا کہنا تھا کہ کالی داس گپتا رضا اگر کسی واقعے کی تصدیق کر دیں یا اس کی تاریخ متعین کر دیں تو پھر کسی مزید حوالے کی ضرورت نہیں۔ رضا صاحب اعلیٰ درجے کے نثر نگار بھی تھے اور انھوں نے بعض شخصی اور سوانحی خاکے بھی خوب لکھے ہیں۔ شاعری کے میدان میں وہ محتاط کلاسیکی تھے۔ زبان و بیان کے معاملوں میں خاص کر وہ کلاسیکی اصولوں کے قائل تھے۔ لیکن روایت کو وہ مردہ چادر کی طرح اوڑھے نہیں رہتے تھے۔ انھیں زمانہ حاضر میں خاندانِ داغ کا سب سے تابندہ رکن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

علامہ رضا کی ایک خاص صفت ان کی فیاضی اور ضرورت مند ادیبوں کے ساتھ ان کے سلوک تھے جو وہ پوشیدہ طور پر کرتے رہتے تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بھی ہندوستان میں اپنی نوعیت کا سب سے وسیع اور بہترین کتب خانہ تھا۔ کاش وہ انمول سرمایہ ان کے بعد محفوظ رہ جائے۔ (شب خون الٰہ آباد)

☆ سیّد حنیف احمد نقوی دال منڈی، وارانسی، یوپی

مکرمی تسلیم

نوازش نامہ ۱۲ر مئی موصول ہوا۔ رضا صاحب کا انتقال واقعی ایک بڑا ادبی سانحہ ہے۔ وہ اپنی ذات سے اردو کے سیکولر کردار کی ایک زندہ شہادت تھے۔ غالب پر انھوں نے جو کام کیا ہے وہ اس قدر وقیع ہے کہ غالب شناسوں کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی فہرست بھی ان کے نام کی شمولیت کے بغیر مکمل نہ سمجھی جائے گی۔ میرے اور ان کے درمیان مراسلت اور تعلقاتِ باہمی کا سلسلہ بیس بائیس سال سے قائم تھا۔ بعض معاملات میں اختلاف کے باوجود میں نے انھیں بحیثیت مجموعی وسیع القلب اور فراخ دل پایا۔ غالبیات اور کلاسیکی ادب کا جو نادر الوجود ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا اس سے استفادے کے سلسلہ میں وہ ہمہ وقت ہر قسم کی مدد اور تعاون کے لیے تیار رہتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ موتیا بند کی بڑھتی ہوئی شکایت اور گردن کی تکلیف کی وجہ سے فی الوقت ان کے متعلق مفصل اظہار خیال سے معذور ہوں۔ خدا کرے کہ اسباق کا یہ خاص نمبر جس کی تیاری میں آپ مصروف ہیں ہر طرح سے رضا صاحب کے شایانِ شان ہو اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق معلومات کے نقطۂ نظر سے دستاویزی حیثیت کا حامل قرار پائے۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ (4-6-2001)

☆ پروفیسر جگن ناتھ آزاد   جموں کشمیر

محت مکرم   آداب

"مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے"۔

سب سے پہلے تو اس حط میں آپ سے کالی داس گپتا رصا کے انتقال پُر ملال کی تعریت کر رہا ہوں۔ میری دعا ہے کہ ان کے عقیدے کے مطابق حداوند کریم ان کا شامل حال ہو۔

آپ کے ساتھ ان کے بہت گہرے مراسم تھے۔ میرے ساتھ حط وکتابت تھی۔ ملاقات صرف ایک ہی بار ہوئی۔ نیشنل کونسل آف اردو کی میٹنگ میں۔ (10-4-2001)

دوسرا خط

کالی داس گپتا رصا کے انتقال پر ملال کی حریں احبارات میں دیکھ چکا تھا۔ ان کے انتقال سے حو صدمہ ہوا ہے وہ لفظوں میں نہیں آسکتا۔ یہ اردو ادب، اردو اور اردو والوں کا بہت بڑا نقصان ہے۔ (30-4-2001)

☆ عتیق احمد عتیق   مدیر توارن، نیاپورہ، مالیگاؤں

مدیر صاحب   ہدیۂ صبر واستقامت

رضا صاحب بھی دفعتاً بچھڑ گئے۔ اس کا بھی حد درجہ ملال ہوا اور ہے۔ پونہ کی ملاقات میں چند باتیں لکھی بھی ہوئی تھیں حو طے تھیں لیکن ادبی طور پر دور رس ہوتے ہوئے بھی بڑے کام کی تھیں۔ حو شاید اپنے ساتھ ہی وہ لیتے گئے۔ حیر ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے لیکن ادب میں وہ ایک ایسا حلا چھوڑ گئے ہیں حس کی بھرپائی نہ ہو سکے گی۔

بہر حال، "مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ" پر ہی اکتفا کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ اللہ بس اور باقی ہوس۔

شریک غم عتیق احمد عتیق۔ یکم اپریل ۲۰۰۱ء

☆ باقر مہدی   روی درشن کارٹر روڈ، باندرہ، ممبئی ۵۰

محترمی! تسلیم و پیار

اسباق کا یہ شمارہ میں اپنی بیماری کی وجہ سے پڑھ بھی نہیں سکا تھا کہ حضرت کالی داس گپتا رضا کی وفات کی حبر آئی۔ بڑا افسوس ہوا۔ مرحوم سے ۱۴ر جنوری کو ملاقات ہوئی تھی۔ اب ایسا "حاتم صفت" محقق پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ میرے ان سے ذاتی مراسم تو نہیں تھے مگر پھر بھی انھوں نے میرے لیے آخری جملہ کہا تھا، کہ "آپ کی شرکت سے سیمینار کا وقار بڑھ گیا ہے"۔ کسی نے آج تک میرے لیے یہ نہیں کہا تھا۔ دو ایک بار کے علاوہ میں ان کی حدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ افسوس صد افسوس۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ آپ کا مخلص، باقر مہدی۔ ۳۱ر مارچ ۲۰۰۱ء

☆ ابراہیم اشک ممبئی

اب ممبئی میں ایسا کوئی نہیں رہا جس سے ادب میں رہنمائی حاصل کی جاسکے۔ رضا صاحب ہمارے لیے آخری شمع کی طرح تھے، ان کے جانے کے بعد اب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ میں دعاگو ہوں کہ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ آپ اپنے کو اکیلا نہ سمجھیں۔ فقط ابراہیم اشک

☆ سیّد ظفر ہاشمی گلشن، احمد آباد

برادرم مدیر صاحب ! السلام علیکم

گرامی نامہ موصول ہوا۔ کالی داس گپتا رضا کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھی تھی۔ افسوس ہوا تھا۔ وہ ایک سچے عاشق اردو تھے۔ انھوں نے اردو کی بے لوث خدمت کی ہے۔ وہ ایک دانشور تھے۔ ان کے تحقیقی کارناموں سے اردو زبان و ادب مالا مال ہوا ہے۔ ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی، آپ سے تو گہرے مراسم تھے اور اسی نسبت سے ان کی موت آپ کا ذاتی المیہ ہے۔ جتنا بھی دکھ کریں کم ہوگا، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے۔ ویسے آپ نے اپنی محبت اور قدر دانی سے انھیں بھی سرشار کیا ہے۔ آپ اپنی تحریروں سے ان کی شخصیت کو جلا بخشتے رہے ہیں۔ فقط ظفر ہاشمی

☆ انور شمیم انور ۴۹۳، چک حاجی پورہ۔ فیروز آباد۔ یوپی

علامہ کالی داس گپتا رضا سے متعلق آپ جو نمبر ترتیب دے رہے ہیں، یہ پڑھ کر آسودگی بخش احساس میسر آیا۔ میرے دل میں ان کا انتہائی احترام ہے۔ ان کی کئی ادبی نوازشیں بھی ہوئی ہیں مجھ پر۔ ان کے انتقال سے اردو دنیا ایک عظیم مجاہد اور قابل احترام کرم فرما سے محروم ہوئی ہے۔ ان کی آپ سے دیرینہ قدر دانی اور محبتوں کے پیش نظر یہ سوچا جاسکتا ہے کہ آپ اسباق کے علامہ کالی داس گپتا رضا نمبر کے وسیلے سے ان کی ہمہ جہت شخصیت اور فن پر بھرپور جائزہ صحیح معنوں میں پیش کریں گے۔ انور شمیم انور۔ ۸ جون ۲۰۰۱ء

☆ شبیر فراز فتح پوری فتح پور شیخاواٹی، راجستھان

برادرم مدیر فتح پوری صاحب سلام مسنون

کالی داس گپتا رضا کے انتقال کی خبر سن کر اور پڑھ کر بڑا دکھ ہوا۔ اردو کا ایک ستون گر گیا۔ چند اشعار ان کی نذر کرتا ہوں ۔

جن راستوں سے ہو گے وہ شوریدہ سر گیا — اک باب جستجو کا نیا کھول کر گیا
سودائی تیرا عشق میں حد سے گزر گیا — لیکن خرد کی منزلیں آساں کر گیا

دامن میں تیری زلف کی خوشبو لیے ہوئے جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا

یوں تو دنیا میں لوگ آتے اور جاتے رہے ہیں لیکن رضا صاحب جیسی صنعت کے لوگ ہمارے لیے یوں بھی معتبر ہیں کہ ادب کے حوالے سے اور اردو زبان کے فروغ کے حوالے سے جو کام وہ کر کے گئے ہیں اس کی مثال موجود نہیں ہے۔ آئندہ کوں ایسا ہوگا۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

☆ ایڈووکیٹ بشارت فروغ شاہ باد گیٹ، رام پور، یوپی

محترم مدیر صاحب السلام علیکم

کالی داس گپتا رضا کے انتقال سے مجھے بے حد صدمہ ہوا جب ۲۲ر مارچ کو لکھنؤ ٹی وی کی خبروں میں یہ خبر سنی۔ پھر آپ کے تو استاد تھے۔ آپ کو جتنا صدمہ ہوا ہو کم ہے۔ آپ کے دل و دماغ کو سکون ہو جائے تو آپ مجھے ان کی تصانیف کی تفصیلات سے سنہ اشاعت ارسال کر دیجئے تاکہ وفیات مشاہیر اردو میں تفصیل سے میں دے سکوں۔

☆ شکیل شفائی غازی آباد، یوپی

مدیر صاحب محترم السلام علیکم

حلقۂ تشنگان ادب دہلی کے زیر اہتمام ہونے والے سالانہ مشاعرے کی صدارت جناب کالیداس گپتا رضا (مرحوم) مورخہ ۲۱ر مارچ کو کرنے والے تھے۔ میں بہت مشتاق تھا ملاقات کا۔ مارچ کی آخری تاریخوں کی مصروفیت کے باوجود راجندر ہال پہنچا۔ چند احباب سوگوار چہرے لیے ایک جگہ دکھائی دیے۔ ماحول نہایت پر آشوب تھا۔ میں سیماب سلطانپوری کے قریب گیا جو ہاتھ میں ایک ہیر لیے کسی مجھ جیسے طویل قامت شخص کا انتظار کر رہے تھے کہ اسے مناسب اونچی جگہ پر لگا دیا جائے۔ میں نے ہیر پڑھا اور میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ مشاعرے کے ملتوی ہونے کی وجہ وہی سانحہ تھا جس کا سوگ سارا عالم منا رہا ہے۔ آپ سے ان کی قربت اور وابستگی اور آپ کے تئیں ان کی محبت۔ کتنا زبردست زلزلہ ذہن و دل میں آیا ہوگا۔ مارچ کے شمارے میں آپ کے برادر خورد کے انتقال کی خبر پڑھی۔ ساری افسوسناک خبریں۔ اللہ رحم فرمائے۔ اپنے غم میں ہمیں برابر کا شریک جانیں۔ باتیں ساری رسمی ہیں۔ غم، غم ہوتا ہے اور اس کی ضرب صاحب غم ہی محسوس کر سکتا ہے۔ کہتے ہیں غم بانٹنے سے کم اور خوشی بانٹنے سے بڑھتی ہے۔ آپ کے غم میں ہماری شرکت ممکن ہے۔ اس بوجھ کو کم کر سکے۔ خداوند عالم آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ بقول رضا صاحب ؎ مرحوم کو انشاء اللہ ضرور جوار رحمت میں قیام عطا ہوگا۔

☆ نصر قریشی ۷۷۶، پٹیا بہادر گنج، الہ آباد، یوپی

برادر عزیز القدر مدیر صاحب سلام مسنون

ہمارے دور کا عظیم محقق، نقاد، دانشور، شاعر اور محب اردو جناب کالی داس گپتا رضا کا سانحۂ ارتحال اردو زبان و ادب کے اس پیمبری وقت میں بہت ہی بڑا صدمہ ہے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر اردو زبان کی خدمت کی۔ انھیں جو بھی اعزازات ملے وہ ان کے ہر طرح سے حقدار تھے۔ آخری اعزاز بھی ان کے شایانِ شان تھا۔ مرتے مرتے اردو زبان و ادب کی تشہیر کا سبب بنے۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں ان کے نام کے ساتھ اردو زبان کا بھی نام لیا گیا۔

آپ ان سے بہت قریب تھے اور وہ آپ کے رسالے کے لیے بھی مددگاروں میں تھے۔ میرے خیال میں اسباق کا رضا نمبر نکلنا چاہیے۔ جہاں استاد داغ دہلوی اسباق کا ایک شمارہ میرے پاس ہے جسے رضا صاحب نے حسن محققانہ اور عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے، وہ ان کا ہی حصہ تھا۔

☆ معظم علی، سکریٹری راجستھان اُردو اکادمی سبھاش مارگ، جے پور، راجستھان

محترم جناب مدیر فتح پوری صاحب سلام مسنون

واقعی یہ پوری اردو دنیا کے لیے المناک خبر ہے کہ کالی داس گپتا رضا صاحب ہمارے بیچ نہیں رہے۔ ان کے جانے سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا بھرپانا مشکل ہی نہیں ناممکن لگتا ہے۔ گپتا صاحب کی شخصیت اپنے آپ میں انجمن تھی۔ موصوف سے میری آخری ملاقات آگرہ میں ہوئی تھی۔ جہاں انھیں میکش اکبر آبادی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اس جلسے میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شامل تھا اور شب میں جو نشست میکش صاحب کے گھر پر منعقد ہوئی تھی اس میں رضا صاحب کی شاعری کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ۲۲ر مارچ ۲۰۰۱ء کی صبح محترم ندا فاضلی صاحب سے ٹیلی فون پر یہ المناک خبر سنی تو کافی دیر تک یقین ہی نہیں آیا۔ پھر ان کے گھر پر فون کیا تو ان کے نوکر سے اس سانحہ کا پتہ چلا۔ آپ کے اور رضا صاحب کے تعلقات جگ، ظاہر تھے۔ وہ آپ سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ''اسباق'' ان کی محبت اور نوازشوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ گپتا صاحب کے چلے جانے سے آپ کا ذاتی نقصان ہوا ہے، میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ آپ نے مضمون ارسال کیا ہے نوازش۔ انشاء اللہ آنے والے شمارہ میں شائع کیا جائے گا۔ یونہ کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں مطلع کیجئے گا۔

☆ صابر ارشاد عثمانی ۵۴ر لیہام ویلے، لندن

جناب مدیر فتح پوری تسلیمات

جناب ساحرؔ شیوی کے توسط سے آپ کا سہ ماہی جریدہ "اسباق" ملا۔ انھوں نے یہ کہتے ہوئے دیا کہ اس میں یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی کی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ سے آپ کو خط لکھنا واجب ہو گیا۔ جب ورق گردانی کر رہا تھا جیسے ہی کالی داس گپتا رضا "علامہ اقبال (دیدہ و شنیدہ)" کے مضمون پر نظر پڑی اس کو اسی وقت پڑھ ڈالا۔ فوراً احساس ہوا کہ اب تو خط لکھنا فرض ہو گیا۔ جناب کالی داس گپتا رضا کے انتقال سانحہ نے ہر شخص کو غمناک کر دیا۔ آپ کی تحریریں دیکھنے کے بعد اندازہ ہو گیا کہ آپ بھی ان کی معاونت اور قربت سے محروم ہو گئے۔ ہم لوگ بھی جن سے حال ہی میں ملاقات صرف علیک سلیک والی ہوئی تھی، اس کو بھی بے حد اس کا ملال ہے کہ ہم لوگ بھی ایک مشفق و مہرباں شخصیت سے محروم ہو گئے۔ "اسباق" میں جب اقبال پر مضمون پڑھا تو اس کا احساس ہوا کہ نوجوانی ہی سے کالی داس گپتا رضا کا ادبی شعور اقبال جیسی ہستی کے سایہ میں پروان چڑھا۔ ان ہی عناصر کے کرشمات تھے کہ ان کا اردو ادب میں ایک مقام قائم ہو گیا۔ آپ تو خیر ان کے پیروکاروں میں سے تھے۔ میری ملاقات تو مختصر سے بھی کم تھی۔ جب وہ یہاں ہماری یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی کی کانفرنس میں تشریف لائے تھے۔ ان کا قیام ساحرؔ شیوی صاحب کے دولت کدہ پر لیوٹن میں جو لندن سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر تھا۔ میں تو منتظمین میں سے تھا، ان کی قربت سے محروم رہا۔ میری اصلی ملاقات تو صرف ٹیلی فون کے توسط سے ہوئی۔ پھر بھی ان کے مزاج کی خوش طبعی کا اندازہ ہو گیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ آپ ذہین شخص ہیں۔ میں نے کہا کیا یہ افواہ دشمنوں نے اڑائی ہے۔ کہنے لگے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ مشفق خواجہ کے دوست ہیں اور وہ بہت ذہین شخص ہیں اور وہ میرے بہت عزیز دوست بھی ہیں۔ میں نے کہا یہاں تک تو صحیح ہے۔ یہ سن کر قہقہہ لگایا۔ کہنے لگے وہاں تک بھی صحیح ہے۔ پھر کہنے لگے آپ لوگ اردو کی جس طرح خدمت کر رہے ہیں، میں نے اپنے بھائی یشپال گپتا، چمن لال چمن، سوہن راہی، گلشن کھنہ سے کہہ دیا ہے۔ اردو ٹرسٹ اور یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی کو مالی تعاون میں پیش پیش رہیں اور مجھے بھی مت بھولیے گا۔ ان الفاظ سے ہم سے جدا ہوئے ہیں۔ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اردو کے اہم خدمتگار کو بھلا دیا جائے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اردو زبان و ادب سے کس قدر لگن تھی۔

جب میں نے ساحر شیوی صاحب کی مرتب کردہ 'کالی داس گپتا رضا شخص اور شاعری" میں محمد ایوب واقف صاحب کا انٹرویو 'کالی داس گپتا رضا سے ایک ملاقات" پڑھا، اس میں انھوں نے کہا ہے "اقبال پر صحیح معنوں میں ابھی تک تحقیقی کام ہوا ہی نہیں ہے" اپنا ارادہ بھی ظاہر کیا "میں نے دانستہ اقبال پر کم لکھا ہے۔ اب شاید لکھوں"۔ یہ انٹرویو جون ۱۹۸۲ء میں لیا گیا تھا۔ اگر ان کی تحریر اقبال پر تکمیل تک پہنچ گئی ہے تو میں ممنون ہوں گا۔ اس کا کیا عنوان ہے اور کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے؟۔ آپ کا خیر اندیش صابر ارشاد عثمانی

☆☆☆

مکالمہ اور نثر کا بہترین سرمایہ

آنند لہر کی تصانیف

۱	انحراف	ڈرامے	حلقۂ فکر و فن، پلاٹ نمبر ۱۹، بخشی نگر، جموں
۲	سُر وان	ڈرامے	جے کے بک ہاؤس، ویر مارگ، جموں توی
۳	تپسوی کون	ڈرامے	ادارہ فکر جدید، 922، کوچا روہیلا، دریا گنج، نئی دہلی 110002
۴	اگلی عید سے پہلے	ناول	جے کے بک ہاؤس، ویر مارگ، جموں توی
۵	سرحد کے اس پار	افسانوی مجموعہ	سیمانت پرکاشن، 922، روہیلا اسٹریٹ، دریا گنج، نئی دہلی 110002

ساہتیہ اکادمی کی قابلِ مطالعہ کتابیں

نئی کتابیں

☆ روسی کلاسک یوگینی اینگس — پوشکن — ترجمہ حدیجہ عظیم — 150 روپے
☆ ملیالم دادا کا ہاتھی — وائکم محمد بشیر — ترجمہ حیدر جعفر سید — 40 روپے
☆ ہندی کہانیاں آزادی مبارک — کملیشور — ترجمہ خورشید عالم — 50 روپے
☆ اندھیرے میں سلگتے حروف — سرجیت پاتر — ترجمہ طراز کومل — 50 روپے
☆ آزادی کے بعد اردو فکشن (سیمینار) مرتب ابو الکلام قاسمی — 150 روپے
☆ عصری ہندوستانی کہانیاں (جلد ۴) مرتب مغنی تبسم، طراز کومل — 200 روپے
☆ میراجی (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) — شافع قدوائی — 25 روپے
☆ فرحت اللہ بیگ (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) — نامی انصاری — 25 روپے
☆ عرش ملسیانی (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) — ویریندر پرشاد سکسینہ — 25 روپے
☆ خلیل الرحمٰن اعظمی (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) مہتاب حیدر نقوی — 25 روپے

تصانیف مولانا ابو الکلام آزاد تذکرہ (چوتھا ایڈیشن) — 100 روپے

☆ ترجمان القرآن چار جلدوں میں — 600 روپے
☆ خطوط ابو الکلام آزاد — مرتب مالک رام — 100 روپے
☆ غبارِ خاطر — مرتب مالک رام — 100 روپے
☆ خطبات آزاد — مرتب مالک رام — 80 روپے

فکشن

☆ اناکارینا (دو جلدوں میں) — لیو تالستائے — مترجم حدیجہ عظیم — 500 روپے
☆ پہاڑ پر آگ (انگریزی انعام یافتہ) انیتا دیسائی — مترجم م م راجندر — 80 روپے
☆ زندگی نامہ (ہندی انعام یافتہ) کرشنا سوبتی — مترجم حیدر جعفری سیّد — 225 روپے
☆ سانپ اور رسّی (انگریزی انعام یافتہ) راجا راؤ — مترجم طراز کومل — 180 روپے
☆ اردھ ناریشور (ہندی انعام یافتہ) وشنو پربھاکر — مترجم خورشید عالم — 200 روپے
☆ راجندر سنگھ بیدی کے بہترین افسانے (انگریزی) — مرتب گوپی چند نارنگ — 80 روپے
☆ کرشن چندر کے بہترین افسانے (انگریزی) — مرتب گوپی چند نارنگ — 80 روپے
☆ موہن سنگھ کے بہترین افسانے — مرتب گوپی چند نارنگ — 150 روپے
☆ پاکستانی کہانیاں — مرتب انتظار حسین، آصف فرخی — 150 روپے
☆ سندھی کہانیاں — مرتب بھیشم ساہنی — 200 روپے

مسلم قانون (جلد اول) سید امیر علی صفحات 762، قیمت 265روپے	قومی زبان ریڈاے احمد صفحات 253، قیمت 76روپے
زبان اور قواعد رشید حسن خاں صفحات 503، قیمت 120روپے	معاشیات رضیہ نظامی صفحات 381، قیمت 87روپے
اُڑیسہ میں اُردو حفیظ اللہ نیولپوری صفحات 504، قیمت 157روپے	تذکرۃ البلاد والحکّام میر حسن علی کرمانی صفحات 385، قیمت 126روپے
اُردو خوش نویسی ایس چشتی - ایس صدیقی صفحات 136، قیمت 105روپے	زراعتی انکشافات پروفیسر محمد شفیع صفحات 260، قیمت 192روپے
مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کی انتظام حکومت ہاروں خاں شیروانی صفحات 290، قیمت 82روپے	جانباز ساتھی (بچوں کا ناول) وکیل نجیب صفحات 200، قیمت 42روپے

نوٹ اس کے علاوہ اصطلاحات، ادبیات، تاریخ، سائنس، طب و بچوں کے ادب پر بے شمار کتابیں موجود ہیں۔

طالب علموں و اساتذہ کے لیے 40% رعایت۔

مکتوبات بنام گپتا رضاؔ

(۱) امریکہ سے ڈاکٹر گیان چند کے تین خطوط

مجی کالی داس گپتا صاحب، نمستے 15-9-2000

آپ کی کچھ کتابوں پر حصّہ حصّہ کچھ مشاہدات ملفوف کررہا ہوں۔ مختار الدین احمد کے اصرار پر ان کی مرتبہ ذاکر صاحب کے خط نمبر ۳ اور نمبر ۴ پر تفصیلی مشاہدات بھیجے تھے۔ انھوں نے جلد ۳ کے مشاہدات کتاب نما میں چھپوا دیے۔ شاید جلد ۴ کے بھی چھپوالیں۔ آپ میرے پہلے کے بھیجے ہوئے اور موجودہ مشاہدات کو، چاہیں تو "اسباق" پونا میں چھپوادیں۔

میں جولائی کے شروع میں کینیڈا گیا تھا۔ وہاں بھوپال سے آفاق احمد آیا تھا۔ اس نے ازخود کہا کہ حنیف نقوی کو کالی داس گپتا صاحب اور سردار جعفری کے بارے میں اس انداز سے نہیں لکھنا چاہیے تھا، ان کی بزرگی کا تو خیال کرتے۔ خلیق انجم دو مہینوں سے ہماری زبان کے پرچے مجھے سمندری ڈاک سے بھیجنے لگے ہیں۔ یکم مارچ تا ۸/ جون کے پرچے تین دن پہلے ملے۔ ان میں چراغ دیر سے متعلق آپ کا دو قسطی مضمون دیکھا۔ حنیف کا مضمون میں نے نہیں دیکھا ہے نہ حنیف کو اس کے بارے میں کچھ لکھا۔ آپ کے مضمون سے حنیف کی تحریر کا کچھ اندازہ ہوا۔ آپ نے معقول جواب لکھا ہے۔

میں نے قاضی صاحب پر اپنی کتاب کا پہلا مسودہ مکمل کرلیا ہے۔ ابھی ان کی سوانح اور مضامین کے بارے میں کچھ اور معلومات اکٹھی کررہا ہوں۔ اس لیے پہلے دو ابواب کو چھوڑ کر آگے کی صاف نقل کروں گا۔

کیا آپ کے پاس قاضی صاحب کا یہ مضمون ہے۔

"بادِ مخالف کی اوّلین روایت"۔ مشمولہ اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن مسلیبی جلد ۱، ۱۹۴۸ء۔ مرتب اے اے فیضی بمبئی، نہیں ہو تو انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کو فون کرکے اس کی نقل حاصل کیجئے۔ مجھے اس مضمون کا صرف شرحی حصہ چاہیے۔ مثنوی کا متن نہیں۔ صرف یہ لکھ کر بھیجئے کہ متن میں کیا اختلاف نسخ بھی دیا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں عبد الستار دلوی کو یوسف ناظم کی معرفت لکھا کیونکہ مجھے دلوی کا رہائشی پتا معلوم نہیں۔ دلوی کا کوئی جواب نہیں آیا۔ آپ مجھے دو چیزیں اور دیجئے خواجہ احمد فاروقی کے مرتبہ تذکرہ سرور کے آخری تین چار مضمون پر نو دس قطعات تاریخ ہیں۔ مجھے ان صفحات کا عکس درکار ہے۔ دوسری چیز یہ ہے قاضی صاحب نے ۱۹۶۱ء میں رسالہ تحقیق نکالا جس کا محض ایک شمارہ نکلا۔ مجھے اس کا عکس مشفق خواجہ نے بھیجا لیکن اس میں احمد بہمن یار کا جو طویل مضمون املائے فارسی ہے، وہ نہیں بھیجا۔ اگر آپ کے پاس رسالہ تحقیق ہو تو اس میں سے یہ مضمون دیکھ کر چند سطروں میں مجھے اس کا نچوڑ بھیج دیجئے! پھر پورا مضمون جسے ورق کے دونوں طرف فوٹو کرلیجئے تاکہ ڈاک کا کرایہ زیادہ نہ ہو، بس یہی کام ہیں۔

یکم اور ۸/ جون ۲۰۰۰ء کے ہماری زبان میں کسی کا میری کتاب "قاضی عبد الودود بحیثیت مرتب متن" کے خلاف تبصرہ ہے۔ جس طرح مجھے لکھنے کا حق ہے اسی طرح دوسروں کو بھی میرے خلاف اظہار خیال

کا حق ہے۔ میرے ناشر ایجوکیشنل دہلی نے قاضی اور رسدر ناتھ اشک کی کتاب کی طباعت میں بہت غلطیاں کیں۔ میں نے دونوں کا غلط نامہ بنا کر بھیجا۔ انھوں نے دونوں کا پروف مجھے بھیجا۔ میں نے اس کی تصحیح کر کے بھیج دیا۔ معلوم نہیں کتنے مہینے ہوگئے۔ ناشر نے آج تک غلط نامہ نہیں چھاپا۔ کمپیوٹر کے کمپوزر نے مثنوی گلزار نسیم کے ساتھ اپنی طرف سے "مثنویات شوق" کا اضافہ کر دیا تھا۔ ہماری زباں کے مضمون نگار نے اسی کی گرفت کی۔ کتاب نما میں شاہجہاںپور سے کسی غیر معروف شخص کا مضمون میرے تبصرہ رشید حسن خاں کے متعلق آیا ہے۔ میں نے رشید حسن خاں کی کتاب پر مضمون لکھا تھا۔ مجھ حسن کا کہنا ہے کہ یہ معترضانہ مضمون رشید حسن خاں ہی کا لکھا ہوا ہے جو انھوں نے کسی دوسرے کے نام سے لکھا ہے۔ میں یہ نہیں مان سکتا۔ رشید حسن خاں نے مثنوی سحر البیان میرے نام معنون کی ہے۔ لیکن کتاب نما کے مضمون میں جس طرح میرے پرانے مضامین کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ اس غیر معروف شخص سے متوقع نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ معلومات رشید حسن خاں سے گفتگو میں ملی ہوں گی۔

لاہور کے نسخۂ خواجہ کے سلسلے میں آپ کو تحسین جوالی کا کتابچہ اور معین الرحمان کا جوابی کتابچہ اور مجلہ تحریر و تحسین آپ کو بھی ملی ہوں گی۔ میں نے اس سلسلے میں سب کچھ تفصیل سے پڑھا اور اس پر مضمون لکھنا چاہتا تھا۔ مشفق خواجہ سے فون پر بات ہوئی۔ اس نے مجھے روک دیا کہ آپ کیوں اس جھمیلے میں پڑتے ہیں۔ مشفق نے یہ بھی بتایا کہ قدرتِ نقوی نے ایک کتابچہ "مالِ مسروقہ" کے نام سے تحسین کی حمایت میں لکھا ہے۔ مشفق کو جب وہ مل جائے گا تو وہ مجھے بھیجیں گے۔ میں نے تحسین کی کتاب کے آخر میں مختلف نسخوں کے صفحات کے جو عکس دیکھے ہیں ان کی یکسانی سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ سارے نسخے ایک ہیں۔ تحسین کے مطبوعہ نسخے میں ص ۲۲ کی تہہ میں جس طرح لائبریری کے accession no کو مٹایا ہے اس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ نسخہ لاہور ہی ہے۔ میں نے رضا لائبریری کو لکھ کر آٹوگراف میں سے چھ سات معلومات منگائی ہیں۔ ان کے آنے اور قدرت نقوی کا کتابچہ آنے کے بعد میں لکھوں گا ضرور۔ میں کسی کے اعتراض سے نہیں ڈرتا۔ علمی اعتبار سے جو صحیح معلوم ہو اس کا اظہار ضرور کروں گا۔ میرے خلاف جو مضامین آ رہے ہیں انھوں نے مجھے اور پختہ بنا دیا ہے۔ میں کسی کی پروا کیے بغیر قاضی صاحب کی کتاب میں اپنے فیصلے بے باکی سے لکھوں گا۔

آپ سے میں نے ذیل کی چیزیں چاہی ہیں (۱) بادِ مخالف کی روایت کا نثری حصہ۔ اگر آپ کو آسانی مل سکے۔ (۲) عمدۂ منتخبہ کے آخر کے تیس چار صفحوں کا عکس جس میں نو دس تاریخیں دی ہیں۔ (۳) قاضی صاحب کے رسالہ تحقیق کے مضمون املائے فارسی کا عکس یا چند سطور میں اس کا نچوڑ۔

۳ راگست کو ہرنیا کا آپریشن ہوا تھا۔ میں ایک مہینے میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ آپ کی اور اہلیہ صاحبہ کی صحت کا کیا حال ہے؟

مخلص گیان چند

(۲)

محی مستے

آپ کا ۲۹ر نومبر کا کرم نامہ بروقت ملا تھا۔ میں گفتی سے واقف نہ تھا۔ میں نے یہ کتاب دیکھی بھی نہ تھی۔ برسوں پہلے یعنی ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوا، میں نے ان کے لیے لکھا تھا۔ ایک لفظ یاد نہ تھا۔ میں انتظار میں رہا کہ کتاب مل جائے تو دیکھ کر لکھوں۔ پھر ہندوستان میں ڈاک کی ہڑتال ہوگئی۔ ابھی تک ادھر سے تو کوئی چٹھی نہیں آئی۔ آج ہند کے لیے پہلا خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ میں نے گفتی دیکھی۔ اس میں ہر صنف کے کچھ نام مثال کے طور پر دے دیے ہیں، کل نام نہیں۔ رشید حسن خاں تدوین کے میدان میں بے شبہ بے ہمتا ہیں۔ ان کا نام شامل کر دیا۔ آپ کا نام لکھتا تو پھر آپ کی سطح کے متعدد محقق تھے نثار احمد فاروقی، خلیق انجم (غالب کے خطوط) ابو محمد سحر، مسعود حسین خاں، محمود الٰہی، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، معین الرحمٰن، حنیف نقوی، عابد پیشاوری، تنویر علوی وغیرہ۔ میں بہت جھگڑے میں پڑ جاتا۔ دیکھئے محققوں میں غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، جمیل جالبی (بہترین تاریخ ادب) کے نام بھی نہیں۔ محققوں کے نام کا باقی رہنا بہت محدود سطح پر ہے۔

آپ نے کتابوں کے ڈھیر لگا دیے ہیں لیکن اگست یا ستمبر ۲۰۰۰ء میں نارنگ یہاں آئے تو کہتے تھے کہ کالی داس گپتا کی صرف دیوانِ غالب کامل کا نام باقی رہے گا۔ یا شاید یہ کہا تھا کہ اس کتاب کی وجہ سے نام لیا جائے گا۔ دیکھیے میں نے نقادوں میں صرف تین نام لیے ہیں سرور، احتشام، شمس الرحمٰن فاروقی۔ نارنگ مجھے کھا جائیں گے۔ محمد حسن، عقیل رضوی بھی دعوے دار ہوں گے۔ میں نے دو اہم نام کلیم الدین احمد اور حسن عسکری چھوڑ دیے۔ پاکستان کے وزیر آغا کا نام بھی آنا چاہیے تھا۔ آپ نے کتاب "دیوانِ غالب" نسخۂ خواجہ "تجزیہ و تحسین" دیکھی۔ اس میں ص ۸۳ر پر ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں

"آج غالبیات میں ڈاکٹر سیّد معین الدین اور کالی داس گپتا رضا یہی دو نام سر فہرست رہیں گے بلکہ اس دو ناموں میں بھی محض ایک نام کا انتخاب کرنا ہو تو میرے خیال میں، وہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب ہی کا نام ہوگا"۔ ص ۸۴۔۸۳

میں نے نارنگ سے یہ بھی کہا تھا کہ کالی داس کی کتابوں میں دیوانِ غالب کے علاوہ کلیاتِ چکبست کا نام بھی باقی رہے گا۔ مجھے تو اپنے بارے میں بھی بہت شبہ ہے۔ آپ کا نام تو ایک شعبۂ اختصاصی 'غالبیات' کی وجہ سے لیا جائے گا۔ میں تو تحقیق میں generalist ہوں۔ صرف نصابی ضرورتوں کے لیے میری کتابیں اردو کی نثری داستانیں اور تحقیق کا فن کو طلبہ دیکھ لیں گے۔ اس تنگ دائرے کے باہر کوئی نام نہ لے گا حالانکہ تفسیر غالب، اردو کی ادبی تاریخیں اور قاضی عبد الودود ایک مفصل مطالعہ کا بھی کہیں ذکر ہونا چاہیے۔ کئی سال میں نے ایک غزل کے دو تین شعر کہے تھے۔ میرے پاس لکھے نہیں۔ مطلع میں نے تارا چرن رستوگی کو لکھا۔ صحیح یاد نہیں کہ کیا تھا، کچھ یوں تھا

ریگ زار ہستی میں جلد ہی کھو جاؤں گا
صرف تاریخ ادب میں نام بن کر آؤں گا

شعر اس سے زیادہ چست تھا۔ تارا چرن نے مجھے لکھا کہ "آپ کا نام تاریخ ادب میں نہیں آئے گا کیونکہ آپ ہندو ہیں۔ تو realistic ہو کر رہے۔ آپ جو چھوٹی چھوٹی کتابوں کا انبار لگا رہے ہیں ان میں شاید ہی کسی کو بقائے دوام مل سکے۔ محققوں کے لیے میدان بہت تنگ ہے۔ ایک مٹھی بھر جگہ مل جائے تو غنیمت ہے۔ ساری شہرت تخلیق کاروں کے لیے ہے۔ مسعود حسن رضوی آخر عمر میں ناامیدی میں مجھ سے کہتے تھے کہ بعد میں کون ہمارا نام لے گا۔ آپ سے ملا تھا تو آپ نے بھی کچھ ایسا ہی کہا تھا۔ عمر کے آخر میں علیگڑھ میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں سے ملا تو انھوں نے بھی اور خود یہی کہا کہ کوئی اب بھی ہمیں نہیں پوچھتا، بعد میں تو کون نام لے گا۔ اچھا اب یہ بات بند۔

"عمدۂ منتخبہ" کے آخری اوراق کے لیے ممنوں ہوں۔ احمد بخش یار کا مضموں یقیناً لغت نامہ میں شامل ہے۔ میں اسے اس لیے دیکھنا چاہتا تھا کہ دیکھوں قاضی صاحب کے املا پر اس کا کتنا اثر پڑا ہے۔ رسالہ تحقیق مشفق خواجہ کے پاس بھی ہے، مختار الدین احمد کے پاس بھی۔ مختار صاحب کو لکھوں گا کہ ایک صفحے میں اس کی سفارشات کا نچوڑ لکھ دیں۔ آپ اس کتاب کے لیے پریشان نہ ہوں۔ اگر کہیں سے بآسانی بادِ مخالف کی اولیں روایت ملے تو مثنوی کا متن چھوڑ کر صرف شرح بھیج دیجیے۔ اگر مثنوی کے فٹ نوٹ میں انھوں نے کچھ تبصرے دیے ہوں تو ایک دو اہم تبصرے لکھ دیجئے۔

آپ اپنی کتابوں پر میرے تبصرے کہیں چھپوانا چاہیں تو چھپوادیں۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ فروری ۲۰۰۱ء تک قاضی صاحب کی کتاب سے فارغ ہو جاؤں گا۔ پھر اپنی کتاب اردو مثنوی میں ترمیم و تنسیخ کر کے نئے ایڈیشن کے لیے تیار کروں گا۔ اس دفعہ مختصر مثنویوں اور پس منظر کے باب کو نکال دوں گا۔ دو تین مہینے میں یہ کام کر کے آپ کی کتابوں پر ایک مفصل مضموں تقریباً ۳۰ صفحوں کا لکھ دوں گا۔ اور جیسا کہ میں نے اشک کے ساتھ کیا ہے، اسی طرح آپ پر لکھے ہوئے پرانے مضامیں اور نئے مضموں کو ملا کر کتابی شکل دوں گا اور اشاعت کے لیے آپ کے حوالے کر دوں گا۔ کوشش کروں گا کہ تبصروں کو پھیلا کر سوا سو، ڈیڑھ سو صفحوں کی کتاب تیار کر دوں۔

اب آپ مجھے دو چھوٹی چھوٹی معلومات فراہم کیجئے۔

(۱) مدیر یاری کی کتاب مکتوباتِ اقبال میں مدیر یاری کا یہ تبصرہ کس صفحے پر ہے 'مسلمانوں کو محکوموں کا محکوم بننا کبھی گوارا نہ ہوگا۔ یہ ص ۵۵ اور ۶۵ کے درمیان ہونا چاہیے۔

(۲) آپ کے پاس ماہِ نو اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء ہے۔ اس کے ص ۳۱۳ پر لکھا ہے "مسلمانوں نے سینہ پر ایک ہزار سال سے زیادہ حکومت کی فرماں روائی حیثیت سے ان کو وہ فوقیت حاصل تھی کہ حس

سے انکار کی کسی کو تاب نہ تھی"۔ مجھے اس قول کے مصنف کا نام چاہیے۔ اگر ماہ نو آپ کے پاس نہ ہو تو پریشان نہ ہوں۔ میں مشفق خواجہ کو لکھ کر پوچھ لوں گا۔

Parbinso کی وجہ سے یہ ہو گیا ہے کہ میں بہت آہستہ لکھنے لگا ہوں۔ انگلیوں میں پکڑتی نہیں رہی۔ آہستہ آہستہ آگے کو چلتی ہیں۔

اب اجازت۔ قاضی صاحب کی کتاب کا کام آگے بڑھاؤں گا۔

مخلص گیان چند

۲ر دسمبر ۲۰۰۰ء

☆☆☆

(۳)

یاد نہیں کہ میں کن کتابوں پر بیشتر لکھ کر بھیج چکا ہوں۔ اس وقت چند شاذ مشاہدات

۱ تفہیم غالب کے دو حرف ص ۱۲- آپ کا یہ تنقیدی مشاہدہ خوب ہے "غالب جتنے ترقی یافتہ ذہن کے مالک تھے، اس کا عہد اتنی ہی زوال پذیر ذہنیت جی رہا تھا"۔ ص ۱۳ر پر مصرعٔ تاریخ میں سہو کتابت سے ہاتف کی جگہ "ہاطف" چھپ گیا ہے۔ مضمون چند قطعات و اشعار منسوب بہ غالب، دوسری جگہ بھی آچکا ہے لیکن یہاں حسن تفصیل سے ہے، دوسری جگہ نہیں۔ ص ۲۴ر پر لکھا ہے "اس قطعے کی تحلیص" میرا خیال ہے کہ یہ سہو کتابت ہے تلخیص کا۔ لغت میں تحلیص کے معنی پاک کرنا، چھڑا دیے ہیں۔ سور کا قطعہ قطعہ منسوب بہ غالب سے ضرور کچھ تعلق رکھتا ہے۔ یہ پورا مضمون انتساب کی تصحیح کے نقطہ نظر سے نہایت اہم تحقیق ہے۔ اسی طرح کا "لیکن اس سے کم اہم" اگلا مضمون ہے ص ۲۸ر پر۔ جس نے نظیر کا عیسوی سنہ ۴۹-۱۹۴۸ء چھپ گیا ہے بجائے ۴۹-۱۸۴۸ء کے۔ آپ نے جس نے نظیر اور مجمع الاشعار کی جو تحقیق و تصریح کی ہے اس سے پہلے کسی اور نے نہ کی ہوگی۔ غالب کا ایک یا شاگرد ذاکر آپ نے خوب تلاش کیا۔ غالب کے شاہ نصیر کا شاگرد نہ ہونے کی آپ کی ص ۶۷ کی دلیل شافی ہے۔ چراغ دیر کا ترجمہ خوب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے آخر میں غالب کے قیام بنارس کی تحقیق اچھی ہے۔ مناقشہ غالب و ذوق میں یہ شعر بہت چونکا دینے والا ہے، مصرعہ بر ردیف اردوئے شعر گرہ۔ میں نے اس مجموعے کے بقیہ مضمون بھی دیکھے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ کتابچہ تحقیق غالب میں اپنے حجم سے کہیں زیادہ وزنی اور اہم ہے۔

غالب اور غالبیات کے بارے میں کچھ اور میں نے پہلے مضمون غالب کے چند ابتدائی شعر پر پنسل سے بھی "خوب" لکھ چھوڑا ہے۔ ص ۸ پر آپ کی غزل کے جو دو شعر دیے ہیں، "گھر دے دینا" وہ بہت اچھے ہیں۔ دوسرے مضمون "غالب کا ایک شعر" کے ساتھ بھی میں نے "بہت خوب" لکھ چھوڑا ہے۔ ۳ر اگست

۲۰۰۰ء کو میرا اہر یا کا آپریشن داماد کے شہر میں ہوا تھا۔ اس کے بعد کے پانچ چھ دنوں میں میں نے آپ کی کتابیں پڑھ کر پنسل سے نوٹ لکھ دیے تھے۔ آپ نے "نمایاں ہو گئیں" والے شعر کے قریب المعنی جو دوسروں کے اشعار دیے ہیں میں نے تو پہلے سے نہیں تھے۔

چراغ دیر کے اشعار کا منظوم اردو ترجمہ خوب ہے۔ میں نے آپ کے نثری ترجمے کے خلاف حنیف نقوی کا مضمون نہیں دیکھا لیکن ہماری زبان میں آپ نے جو جوابی مضمون شائع کرایا ہے وہ دیکھا۔ جب تک حنیف کا مضمون نہ دیکھ لوں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ نے فراخ دلی سے کئی جگہ حنیف کی بات مان لی ہے۔ حنیف کا یہ کہنا نامناسب ہے کہ ایسے کمزور ترجمے کو ہماری زباں میں شائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مدیر اتنا بڑا Censor کیسے ہو سکتا ہے۔

مضمون "غالب اور مہر" دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ ماہر غالبیات کے کیا معنی ہیں۔ آپ نے ص ۲۹ ر پر تاریخ کی بھی غیر معمولی واقفیت دکھائی ہے۔ دوسرے مضامین بھی کام کے ہیں۔ طہ انصاری پر مضمون دلچسپ ہے۔ یہ میں پہلے ہی رسالے میں پڑھ چکا ہوں۔ سمرو بیگم پر تحقیق اچھی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ مفتاح التواریخ اور اینٹل بائیوگرافیکل والے بیل (Beal) کی تصنیف ہے۔ قاضی صاحب نے لکھا ہے "مفتاح التواریخ ایک غیر معتبر کتاب پہلی کی لکھی ہوئی ہے۔ زمانۂ تصنیف تیرہویں صدی کا نصف آخر (کتابچہ آوارہ گرد اشعار ص ۳، کامٹ لاٹ)

رفتگاں کے ساتھ اس کتاب میں آپ نے جی رائن جہاں کے مسلماں ہونے پر سوال تو اٹھایا لیکن آخر میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ قاضی عبد الودود اور حنیف نقوی بھی ان کے تبدیلی مذہب کو نہیں مانتے۔ (حنیف کی کتاب جی رائن ص ۳۵۔۳۶۔ حنیف کے ص ۳۵- ۴۴ سے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ دلگیر مسلماں ہو گئے تھے)۔ امرت سکھ دیوانہ کے سلسلے میں آپ نے قاضی عبد الودود کے مضمون نوائے ادب جولائی و اکتوبر (دو قسطیں) ۱۹۵۸ء سے یادداشت نہیں لکھی۔ یہ ان کے مجموعے 'مصحفی اور ان کے اہم معاصرین" میں بھی شامل ہے۔ دیوانِ نوارش پر قاضی صاحب کا مضمون آج کل جولائی ۱۹۶۴ء میں آیا۔ اس میں نوارش کے حالات بھی دیے ہیں۔ یہ مضمون ان کے مجموعے "اردو شعر و ادب" میں بھی شامل ہے۔ مہجور پر ڈاکٹر آغا محمد باقر لکھنو کی ضخیم کتاب ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ میرے پاس موجود ہے۔ یوں تو آپ کی کتاب کا حصہ اول یادداشت کا ہے لیکن اس میں متعلقہ ادیبوں پر کافی مواد آپ نے بہم پہنچا دیا ہے۔ رتن سکھ زخمی پر مضمون مفصل اور تحقیقی ہے۔ بعد کے سات مضامیں یادداشتیں ہیں۔ باقاعدہ مضمون نہیں۔ بہت شور سنتے نہ نکلا۔ یہ شعر آتش کا ہے۔ یاس کے چراغ سخن میں ص ۸۷ پر آتش کے نام سے ہے۔ وہاں پہلا لفظ 'بڑا' ہے، 'بہت' نہیں۔ نسیم دہلوی بہت اچھا مضمون ہے۔ آپ نے ص ۸۶ تا ۸۸ سرقے جیسے توارد کی مثالیں خوب تلاش کیں۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ منتخب ہندو شاعروں پر اپنے مضامین شاعروں کی تاریخی ترتیب سے مرتب کر دیں تو ایک

موضوع کی تذکرہ نما کتاب ہو جائے گی۔ شوق کے سلسلے میں آپ نے تاباں نقوی کی اچھی گرفت کی کہ وہ شوق کو ذوق کا شاگرد سمجھے۔

یگانے بیگانے کے کچھ مضامین پہلے کے پڑھے ہوئے تھے۔ ہیں واقعی سوانحی مضامین۔ "پنڈت نہرو کے ساتھ" خوب ہے۔ آپ نے اتنا وقت ان کے اور دوسرے لیڈروں کے ساتھ بتایا۔ مہاتما گاندھی کو میں بھی دو بار دیکھ چکا ہوں۔ صفدر آہ کے مضمون سے ان کی شخصیت کے بارے میں آگاہی ہوئی۔ کنہیا لال کپور کے مضمون کے سلسلے میں مجھے بھی یہ عرض کرنا ہے کہ ان کے قیامِ پونا کے آخری دنوں میں مجھ سے بھی ان کی خط وکتابت ہوگئی تھی۔ مئی میں یا شاید جون میں میں اور میری بیوی پونا گئے اور آپ کے فلیٹ میں ٹھہرے۔ میں خوش تھا کہ کپور صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوگی لیکن میرے پونا پہنچنے سے پہلے ہی وہ سدھار گئے۔ مجموعے کے آخر کے بعض خاکے معلومات افزا ہیں۔ خطوط آپ کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

"اہم غیر اہم"۔۔ حرفے چند کے آپ کے مطلع کے پہلے مصرع کو یوں کر دیا جائے ع سے اتنا ہی بیش جتنا کم ہے' تو "ہی ہے" کا تنافر دور ہو جائے گا۔ یادداشتوں میں ص ۷ تا ۹ پر جو مشہور شعروں کے مصنف دیے ہیں ان میں سے کچھ کا مجھے علم تھا، کچھ کا آپ کی تحریر سے علم ہوا۔ ص ۹، ہندو شعراء کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ تھا تو پورا کر دیجئے۔ جامع بنانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی تک جن کے بارے میں لکھ چکے ہیں ای کو مدوّن کر دیجئے۔ ۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ اس مجموعے کا غالباً بہترین مضمون ہے۔ میں نے اس سے پہلے نہ فرحت اللہ بیگ کا مضمون پڑھا تھا نہ کریم الدین کی تحریر۔ تاحال اردو اکادمی دہلی کی ۱۹۸۶ء کی تحریر بھی نہیں دیکھی۔ قاضی صاحب کی طرح آپ نے بھی اخباروں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ آئینہ سکندر کی ۱۸۳۳ء کی فائل بہت پرانی ہے۔ آپ نے اس فارسی کے اخبار کے مندرجات کی اتنی تفصیلات دیں اور صفحوں کے صفحوں کا اردو میں ترجمہ کیا، یہ آپ ہی کی ہمت ہے۔ پرانے اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا شاعری اور فکشن کا۔ اخباروں سے سماجی اور سیاسی زندگی کا پتا چلتا ہے۔ اخبارات سے متعلق آپ کے نمونوں میں متعدد دلچسپ خبریں ہیں۔ ص ۹۸ - ۹۹ کا چلتی ہوئی ٹرین میں مشاعرہ دلچسپ ہے۔ ۱۱۸ار گلشن بے خار پر ایک نظر آپ کا پہلا تحقیقی مضمون ہے۔ اگر ابتدا ایسی ہے تو انتہا کیا ہوگی۔ حافظ کی پانچ غزلوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کرنا بڑا جری اقدام ہے۔

کتاب "غالب" غالب کے اشعار کا مطلب کافی سلجھے ہوئے طریقے سے سمجھایا ہے۔ 'انتخاب غزلیاتِ فراق' کا اہم ترین جزو "غزل فراق کا سفر" ہے۔ مجھے فراق کے اتنے سارے استادوں کا علم نہ تھا۔ آپ نے عہد بہ عہد فراق کے کلام کا ارتقاء جو دکھایا ہے اس سے آپ کی تنقیدی نظر کی گہرائی کا پتا چلتا ہے۔ انتخاب اچھا ہے۔ آپ نے اسے عہد بہ عہد مرتب کر کے ارتقا کو واضح کر دیا۔ اس کتاب کے ذریعے ان کی غزلوں کے اچھے شعر بآسانی مل جائیں گے۔

"اچھی باتیں نہ باندھو" کی غزلیں اچھی ہیں۔ آدمی ایک شعر میں پڑھتا ہے تو اس کے انکشافات کے دوسرے شعر کے سائے میں چھپ جاتے ہیں۔ اگر آپ محقق نہ ہوتے تو آپ کی شاعری پر زیادہ توجہ کی جاتی۔ نظم سمندر کو میں نے محض الٹ پلٹ کے دیکھا ہے۔ ہماری دوستی اچھی نظم ہے۔ امرت منتھن میں آپ نے صنعت Onomatopoia کا خوب استعمال کیا۔ Onomatopoia یعنی صوت سے مفہوم کی محاکات کی ہے۔

"جہاں گیتا رضا' اور مدیر   یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ آپ نے بھگت سنگھ کے والدین کو دیکھا ہے اور ان کے گھر کھانا کھایا ہے۔ (ص ۹۵)۔ ص ۹۶ کا حاشیہ "کا مصرع اٹھاتی ہیں" سے شروع ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اس سے پہلے کون سی سطر تھی۔ آپ کے مضمون 'حسینا'، 'درگا دیوی' اور عدل بابا بہت اچھے جاتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صفدر آہ (یگانے بیگانے ص ۸۱) اور عدل بابا (جہاں گیتا رضا ص ۱۱۲ اور ۱۱۷) دونوں یہی جملہ کہتے ہیں "وہ جو سامنے ہری پربت ہے ہمارا مزار وہیں بنے گا"۔ "عدل بابا" کے مضمون کی دوسری قسط دکھائی نہیں دی۔ شاید حسن پر (۳) لکھا ہے وہ دراصل (۲) ہوگی۔ "دانشور گیتا رضا" ص ۱۴۲ میں نے صبا پالی کی نظم "اردو ہے جس کا نام" نہیں دیکھی۔ "متعلقات کالی داس گیتا رضا" بھی جستہ جستہ دیکھ لی۔

آپ سے متعلق یا آپ کی بھیجی ہوئی ۲۰۰۰ء کی اور کتابیں سامنے نہیں۔ یوں بھی میں نے قاضی صاحب پر کتاب کی تبییض کا کام روک کر یہ سطور لکھی ہیں۔

گیان چند

۵ / اکتوبر ۲۰۰۰ء

☆☆☆

اسلام آباد سے پروفیسر اقبال کا ایک خط

لائق احترام، جناب کالی داس جی، نمستے

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

54 برس کے بکھرے ہوئے کاغذات میں سے شب و روز کی تلاش بے حد کے بعد آپ کے تحریر کردہ 6 عدد پوسٹ کارڈ مل سکے۔ پہلا خط آپ نے رانچی (بہار) سے 18/6/47 کو لکھا جو کہ مجھے مکندرپور کے پتے پر ملا۔ میں اس خط کو متاع بے بہا سمجھ کر پاکستان ساتھ لے آیا۔ دوسرا خط 21/1/48، تیسرا 22/2/48، چوتھا 29/2/48، پانچواں 23/8/48 اور چھٹا خط 6/11/48 کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خطوط مجھے سرگودھا میں ملے تھے۔ ان سب کی فوٹو کاپیاں ارسال ہیں تاکہ یہ تصدیق ہو سکے

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ان خطوط کی نقل کے ساتھ ایک لبریز محبت یادگار تحفہ آپ کے معبر پتاجی کے خط کا عکس ہے جو انھوں نے مجھے 5/4/50 کو سرگودھا کے پتے پر لکھا تھا۔ آپ ملاحظہ فرمائیں ایک بے گھر، بے وطن اور بے روزگار نوجوان نے ان خطوط کو کس طرح سنبھالے رکھا۔ آج کل کی نسل کو یہ توفیق کہاں۔ یہ زوال بھی آنا تھا۔ اور، "یہ دن بھی دیکھنے لکھے تھے میری قسمت میں"۔

جناب من! آپ کا 12 جنوری 2001ء کا مراسلہ مجھے 19 جنوری کو ملا۔ خط کے ملتے ہی مکند پور کی فلم میری آنکھوں کے سامنے یوں چلنے لگی جیسے کہ میں ہالی وڈ، لاس اینجلس امریکہ میں ٹریننگ کے دوران مختلف فلمیں دیکھا کرتا تھا۔ اس وقت گاؤں کی لفظی تصویر پیش خدمت ہے

آپ کی دو مرلہ حویلی کے سامنے ایک آڑھتی کی دکان تھی۔ اس کے پہلو میں دو مرلہ مکان دہلی میں ملازم سرداروں کا تھا۔ انھوں نے بعد میں آپ کی حویلی کے ساتھ پکی دیواریں اٹھا کر ایک بڑی حویلی تعمیر کر لی تھی۔ اب دوسری جانب دیکھئے آپ کی حویلی سے ملحق کنواں، ایک چھوٹا پلاٹ، پھر دو تین کپڑے کی دوکانیں [illegible] آپ کی بیٹھک ہوتی تھی۔ [illegible] دکان [illegible] کی تھی جس کے مقابل [illegible] گاؤں [illegible] تھی۔ اسی دکان کے چوبارے میں مولوی مختار حسین ناظر [illegible] پڑھاتے تھے۔ آپ نے لکھا ہے آپ سے ان کے مراسم تھے۔ ہم تو عمروں کو ان باتوں کا علم تھا۔ میں ان سے 1956ء میں ملا تھا۔ تب میں لاہور کے مشہور کالج "دیال سنگھ کالج" میں ادبیات کا استاد تھا۔ اسی چوبارے میں شعر و شاعری کی رم جھم ہوتی۔ اور کبھی کبھار کھانا بھی کھایا جاتا۔ میری شاعری کا آغاز 1944ء سے ہو چکا تھا۔ آپ، ناظر صاحب اور ماسٹر بخت رام جیتن میرے کلام کی اصلاح فرماتے تھے۔ جب ایک روز آپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں شعر کہتا ہوں تو آپ نے مجھے "نام ہے، کام ہے، انجام ہے" کے ردیف قافیے عطا کر کے غزل لکھنے کو کہا۔ دوسرے ہی دن میں غزل لکھ کر آپ کی حویلی میں حاضر ہو گیا۔ اُس غزل کا ایک شعر یہ ہے

جانتا ہوں اک زمانہ کیوں ہے مجھ سے خشمگیں
کوچہ جاناں کا رکھا میں نے کعبہ نام ہے

اس کے بعد آپ نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی، اور میں اقلیم سخن گوئی کا مسافر بن گیا۔ نویں جماعت کے تین شعر ملاحظہ فرمائیں

مطلع دل پر سحاب رنج چھا جانے کو ہے
ایک محویت کا عالم محو ہو جانے کو ہے

غمزدہ اقبال کے دل سے نکلتی ہے دعا
کامیابی، کامیابی، کامیابی دے خدا

سب کے سر پر یا الٰہی ہو ترا دستِ کرم
بس کہ اقبالم دعا پیش کریم و رب کرم

یہ اشعار اسی نظم کے ہیں جو میں نے 1946ء کو میٹرک کے امتحان کے طلباء کی روانگی کے وقت لکھی تھی۔ (گل)

اس کے بعد اصلاح کا سلسلہ جاری رہا۔ آئیے، پھر گاؤں کے اُن بازاروں سے گزرتے ہیں

جہاں اک مرتبہ میں نے بھی قسمت آزمائی تھی
جہاں میری محبت نے شکست فاش کھائی تھی

موہن برادرز کی دکان کے ساتھ ایک غریب رنگریز کا گھر تھا۔ مقابل میں مسجد۔ مسجد کی دیوار کے ساتھ گلی میں رکھارام پنشنر رہتا تھا۔ اسی گلی میں مختار حسین صاحب کے اہل خانہ ایک مکان میں کچھ عرصہ رہے تھے۔ ذرا آگے بڑھیے۔ موہن برادرز کی پرچون کی دکان تھی، اس کے سامنے موچیوں کی دو دکانیں۔ ساتھ ہی حقے اور پیچے بنانے والوں کی دکان۔ ایک شخص خوشی محمد نے بساطی کی دکان بھی کھول لی تھی۔ اس کے ساتھ بدلعل رنگریز کی لوہے کی دکان تھی اور اس کے سامنے انہیں کا تنراب خانہ۔ آگے چلیں تو درزی کی دکان، اسی کے مقابل فیروزدین ماسٹر، رسیوں اور جوتے والے کا اسٹور۔ اسی دکان کے ساتھ والی گلی میں آخری گھر میرا تھا، جو کہ 1937ء میں پختہ بنا تھا اسی پر ہمارے نام کندہ ہیں۔ گلی کی دوسری نکڑ پر بدلعل، گنڈا رام کے بوڑھے پتا رنگریزی کرتے تھے، پھر آگے چار پانچ دکانیں آتی تھیں اور سامنے بسنت رام کا جنرل اسٹور۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر فتح چند کے بڑے بھائی کی کپڑے کی دکان۔ ساتھ ایک لوہے کی دکان۔ اور آگے گانی رام دودھ، دہی، مٹھائی فروش کی ہٹی۔ سامنے "سرائے" جس میں سالانہ باہر کے آئے ہوئے لوگ ڈرامے کرتے۔ سرون کمار کا ڈرامہ میں نے یہیں دیکھا تھا۔ سرائے کے قریب کچا گیٹ، پھر تالاب، اور اردگرد کسانوں کے باڑے۔ آگے تین چار فرلانگ پر پختہ تالاب بڑھ (برگد) اور پیپل کے درخت۔ سامنے حکیم پور نامی گاؤں۔ یہ گاؤں کے اس حصے کی تصویر ہے جس سمت آپ کی حویلی اور میرا غریب خانہ تھا۔ مغرب میں امراء کے مکان، ہسپتال، ماتا جی کا مندر، دو باغ اور آگے "پبلک ہائی اسکول مکند پور"۔ ماسٹر بھگت رام دیل دار نویں جماعت کو پہلا انگریزی کا پیریڈ پڑھاتے تھے۔ چیت رام ہیڈ، II ماسٹر اور گیانی جی III ماسٹر تھے۔ دو استاد اور تھے۔ بعد میں مس موہن لعل میٹرک پاس کر کے ٹیچر مقرر ہوئے۔

ہمارے گاؤں کے چار کوس کے فاصلے پر "نگہ" ایک چھوٹا شہر تھا۔ تھانہ بھی وہیں تھا۔ وہاں چیت رام ہیڈ نے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ آپ نے اپنا دیوان مجھے دیا اور مشاعرہ پڑھنے نگہ بھیجا۔ آپ کی جو نظم میں نے پڑھی تھی اس کا آغاز یوں تھا

جام خدمت کا پیاسا ہوں مجھے اک جام دے   سیکڑوں آلام چاہے گردش ایام دے
جان تک اپنی لٹا دوں میں وطن کے واسطے

شکر ہے میری یادداشت 69 برس کی عمر میں بھی دھندلی نہیں ہوئی۔ گاؤں کی خوش گوار یادیں ہمہ وقت میرے تعاقب میں رہتی ہیں۔ اس غم کو کروٹیں لیتے ہوئے ملاحظہ کریں

سکے کھیتاں کی آہاں دا ایاں اڑتے ہوں ما سی
اکھاں دے وچ آنسیاں رساتاں میرے پنڈ دیاں
یورپ تے امریکہ جا کے میں نے کچھ بھی سکھیا ئیں
میریاں سوچاں دے وچ چمکن ماتاں میرے پنڈ دیاں (گل)

دل چاہتا رہتا ہے کہ ایک بار گاؤں جاؤں۔ اُن دوستوں کو دیکھوں

اس حسن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اُن راستوں، راہوں سے گزروں جو اسکول کو جاتے تھے۔ اُن دونوں مدرسوں کو دیکھوں جن کی تعلیم و تربیت نے مجھے انگلستان، جرمنی اور امریکہ کی اعلیٰ تریں یونیورسٹیوں تک پہنچایا۔ اُن گلیوں کو سلام کروں جن میں ہم ننگے پاؤں آدھی راتوں تک "پٹپل" کھیلا کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے جامن اور پیپل کے درختوں کا سایہ مجھے آج تک یاد کرتا ہوگا۔ معلوم نہیں وہاں کوئی پہچانے والا بھی ہوگا یا نہیں۔ بہر صورت امید ہے میرے ہم عمروں اور ہم عصروں میں جو کہ سبھی 70 - 67 برس کے ہو چکے ہوں گے کوئی تو ہوگا جو گرتی ہوئی دیوار کو آخری بار دیکھے گا۔

1950ء میں کالج کی تعلیم کے دوران میں نے اقبال مکندپوری کی جگہ اپنا نام "اقبال گل" رکھ لیا تھا۔ کوئی بیس برس پروفیسر رہنے کے بعد سول سروس اختیار کرلی۔ اور فیڈرل حکومت کی وزارت تعلیم میں ڈپٹی ایڈوائزر رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوا تو ایک بار پھر جانہ بدوش ہوگیا۔ لیکن ع

"متاعِ درد میں کوئی کمی نہیں آئی"

میرے والد بزرگوار حکیم تھے۔ ان کی وفات 1988ء میں تقریباً 100 سال کی عمر میں ہوئی۔ والدہ مرحومہ 95 برس زندہ رہیں۔ ان کا انتقال 1993ء میں ہوا۔ اب 3 جنوری 2001ء کو قیامت ٹوٹی۔ میرا چھوٹا بھائی جو میرا دست گیر اور خیر خواہ تھا، بہ عارضۂ قلب اچانک 48 برس کی عمر میں ہمیں چھوڑ گیا۔

اُس کو مثلِ طفلک بے دست و پا روتا ہوں میں

سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔ 55 برس زمانے کے گرد باد کا مقابلہ کیا۔ مگر اس صدمے نے میرا وہی حال کر دیا ہے جو عارف کے مرنے پر مرزا غالب کا ہوا تھا۔

برائے لطف و کرم خط لکھتے رہیں۔ زندگی ہے تو ایک دن ملاقات بھی ہو جائے گی۔ اپنی تصویر بھی بھیجیے۔ اور نئی تخلیق بھی۔

مخلص

اقبال گِل

(آپ کا ہم وطن اقبال مکندپوری)

مقالات حصہ اوّل

محققِ بے بدل، شاعرِ خوش فکر، یارِ وضع دار

شمس الرحمٰن فاروقی

کالی داس گپتا رضا کا نام میں نے پہلی بار اس وقت سنا جب ان کا مجموعۂ کلام "شعلۂ خاموش" شائع ہوا تھا۔ سال ۱۹۶۹ء یا ۱۹۶۸ء رہا ہوگا، اس وقت وہ نیروبی میں مقیم تھے۔ کلام کو میں نے نک سکھ سے درست، لیکن کسی خاص تخلیقی زور یا فکری گہرائی سے عاری پایا۔ زبان البتہ بہت صحیح اور بامحاورہ تھی۔ کلام کو دیکھ کر کہیں بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ شاعر کا قیام اردو کے قلبی علاقوں میں نہیں، اور اس کا ذریعۂ معاش تجارت ہے، درس و تدریس اور ادب نہیں۔ نظموں میں اس "نیچرل شاعری" کا اثر ضرور نظر آتا تھا جس کی وکالت محمد حسین آزاد اور حالی وغیرہ نے کی تھی، اور سطحی ترقی پسندی سے بوجھل موضوعات کی بھی کمی نہ تھی۔ لیکن معاشی ناانصافی اور افلاس یا طبقاتی ناہمواری کا ذکر کرتے ہوئے کالی داس گپتا رضا کا لہجہ خطیبانہ انداز سے بہت دور تھا۔ نظموں میں تنوع اور اندازِ غزل میں تازگی نمایاں تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر بھی خوشی ہوئی کہ دور دراز افریقہ میں مقیم ایک شخص اپنی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے اور اپنے تہذیبی ورثے کی باریافت کے توسط سے اپنے وجود کو قوت بخش رہا ہے۔ اس وقت مجھے ان کے بارے میں اور کچھ نہ معلوم تھا، یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ مستقل طور پر نیروبی میں قیام پذیر ہیں یا عارضی طور پر، اور وطن عزیز سے ان کے رشتے کیسے ہیں، مشغلہ کیا ہے، وغیرہ۔ کچھ عرصہ بعد مالک رام مرحوم کی کسی تحریر سے (یا شاید ان سے گفتگو کے دوران) معلوم ہوا کہ رضا صاحب زبان اور تلفظ کی درستی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ اپنے تخلص کو حرف اول مفتوح کے ساتھ نہیں بلکہ مکسور کے ساتھ ادا کرتے ہیں یعنی (Raza) کے بجائے (Riza) کہتے ہیں جو اصل عربی تلفظ ہے، گو کہ اردو میں عام طور پر یہ لفظ حرفِ اوّل کے فتحہ کے ساتھ (Raza) ہی بولا جاتا ہے۔ مجھے اس احتیاط پر مسرت ہوئی، حالانکہ اردو بولنے والے کے لیے عربی تلفظ کی پابندی کیوں ضروری یا مستحسن قرار دی جائے، یہ بات اپنی جگہ پر قائم رہی۔

کالی داس گپتا رضا کا دوسرا مجموعۂ کلام "شورشِ پنہاں" بھی ان کے قیامِ افریقہ کے دوران ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ پہلے اور دوسرے مجموعوں میں نمایاں فرق مجھے یہ نظر آیا کہ شاعر کی دلچسپی "روایتی" جدید موضوعات و مضامین (یعنی وہ موضوعات اور مضامین جنھیں ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جدید قرار دیا جاتا تھا) سے بڑی حد تک ہٹ چکی ہے اور اب وہ ایسے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کرنے لگا ہے جن کو شعر میں ڈھالنے کے لیے پرانے نمونے کافی نہیں، بلکہ شاعر کو اپنی طبیعت کی اُپج اور ذہن کی خلاقی کو بیش از بیش بروئے کار لانا پڑتا ہے۔

چنانچہ اس مجموعے میں ایسے اشعار اور مصرعے کثرت سے تھے جنھیں جدید قرار دیے میں مجھے کوئی تامل نہ ہو سکتا تھا۔

عالم ہیں منجدھار میں اب تک پار اُتر گئے کیا کیا جاہل
تو ماہ کا ہم شکل اگر ہے بھی تو کیا ہے مہتاب کی مانند نکھرنا بھی تو آئے

☆

کوئی طاہر ہمیں کیا کرسکے گا ہم اپنی بھی نگاہوں سے نہاں ہیں
زمانہ کوسوں آگے بڑھ گیا ہے ہم اب بھولی ہوئی اک داستاں ہیں

☆

کہتے ہیں آدمی جسم لے کر ایک دن مٹتا ہے وجود حسیں
ایسا دھندلا مگر ہے میرا وجود جیسے میں نے جسم لیا ہی نہیں

☆

ہم میں گلگشت کی کہاں طاقت یہ بڑے کام تو بڑوں کے ہیں
آپ کے چند حرف دل جوئی ہم کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں

☆

کیا وسعت گلزار ارم میں مری ہستی
مجھ ایسا قفس دوست وہاں رہ نہیں سکتا

آخری شعر پر بے ساختہ میرزا جلال اسیر، بیدل اور میر یاد آئے۔

طائرم زیر فلک از جوش دل تنگی گرفت
دامن ایں خیمۂ کوتاہ را بالا رسید
(جلال اسیر)

ہمت چہ قدر زیر فلک بال کشاید
پست است سقفے کہ دریں خانہ ہوا نیست
(بیدل)

زیرِ فلک رُکا ہے اب جی بہت ہمارا
اس بے فضا قفس میں مطلق ہوا نہیں ہے
(میر)

کیا بہ لحاظ استعارہ و پیکر، اور کیا بہ لحاظ لہجہ، تینوں کلاسیکی استادوں کے شعر غیر معمولی ہیں۔ لیکن یہاں

بنیادی بات یہ ہے کہ بیدل، جلال اسیر اور میر، ان سب کے یہاں انساں کی اولو العزمی اور کائنات پر حاوی ہونے کی تمنا کا مضموں ہے، اور جدید شاعر کے یہاں قفس سے پیار کا مضموں، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عہد جدید میں انسان کو جس طرح آمریت اور پولیس یا فوجی راج کے استبداد میں محبوس رکھا جارہا ہے اس نے ہمارے بنیادی شعور آزادی کو بھی مسخ کردیا ہے۔ اب انساں آزاد رہنا ہی بھول گیا ہے۔ یا یہ معنی بھی ممکن ہیں کہ قید یا بندش میں رہنے والا اکثر اپنے صیاد ہی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ یہ بات عہد حاضر میں Stockholm Syndrome کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک بار دہشت پسندوں نے کچھ لوگوں کو اغوا کر کے سویڈن کے شہر اسٹاک ہوم کی ایک عمارت میں بطور یرغمال قید کردیا۔ یہ قید بہت دن چلی اور آہستہ آہستہ قیدیوں اور ان کے نگہبانوں میں میل جول بڑھنے کے باعث قیدیوں کو اپنے قید کرنے والوں ہی سے یک گونہ ملاطفت اور لگاؤ محسوس ہونے لگا، ہر چند کہ وہ خوب جانتے تھے کہ ان کے نگراں اور پہرے دار سب کے سب ان کے اغواکار ہیں، یا ان کے نمائندے ہیں، اس صورت حال کو عہد جدید کی صفت کہا جاتا ہے۔

نعمت خاں عالی نے قید کی طوالت اور اس کے نتیجے میں واقع ہونے والے زوال حافظہ کے المیے کا ذکر ایک شعر میں بہت خوب کیا ہے ؎

دردا کہ صیاد مرا چندانے
در قفس داشت کہ راہ چمن از یادم رفت

اور غالب نے اس حقیقت کا ایک پہلو انساں کی بے عملی اور کوتاہ بینی پر طنز کے مضموں کی صورت میں بیان کیا ہے ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

لیکن کالی داس گپتا رضا نے اپنے شعر میں انساں کی رزمی اور کائناتی دونوں المیہ صورتِ حالات کا احاطہ کرلیا ہے اور طنز کے پہلو اس پر مستزاد ہیں۔

"شعلۂ خاموش" کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد کالی داس گپتا رضا نے وطن کو مراجعت کی۔ شاعری کا سلسلہ حسب سابق برقرار رہا، لیکن یہاں ان کو غالب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے غالب کی تصنیف کردہ، اور غالب سے متعلق کتابیں بھی جمع کرنا شروع کیں۔ یہ ان کے حسن نیت اور تلاش دور رس کی دلیل ہے کہ انھوں نے جلد ہی غالب، غالبیات اور اردو کے کلاسیکی ادب کی اتنی کتابیں اور مخطوطے جمع کر لیے کہ ان کا کتب خانہ ہندوستاں میں اپنی طرز کا سب سے وقیع ذاتی کتب خانہ ٹھہرا۔

وہ چیز جس نے کالی داس گپتا رضا کو ایک خوش فکر شاعر اور کامیاب مہاجن کے ساتھ ساتھ علامہ کالی داس گپتا رضا بنادیا، وہ غالب سے ان کا شغف، اور تحقیق کے کام سے ان کی مناسبت تھی۔ (علامہ کا خطاب ان

کے نام کے ساتھ سب سے پہلے میں نے استعمال کیا تھا، اور چونکہ یہ بالکل برمحل اور مبنی بر استحقاق تھا، اور خلوص نیت کے ساتھ استعمال کیا گیا تھا، اس لیے بہت جلد مقبول ہو گیا۔ ایک بار مرحوم نے مجھ سے کہا کہ آپ خواہ مخواہ مجھے علامہ بنائے دیتے ہیں، میں علامہ کے لقب کا مستحق کہاں سے ہو سکتا ہوں۔ لوگوں کو مغالطے میں ڈالنا کون سی اچھی بات ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اب تو یہ بات زباں خلق پر آ گئی ہے، نقارۂ خدا بن گئی ہے، اب اس میں میرا کوئی حصہ نہیں۔ وہ ہنس کر چپ ہو رہے۔)

کالی داس گپتا رضا کے تحقیقی کارناموں کا پہلا مجموعہ "سہو و سراغ" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس وقت تک وہ غالب کی "دعائے صباح" اور "متعلقات غالب" شائع کر چکے تھے۔ "سہو و سراغ" نے انھیں اردو کے نمایاں محققین کی صف اول میں لا بٹھایا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ "سہو و سراغ" پڑھنے کے بعد میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ کسی شخص کی تاریخ ولادت و وفات، یا کسی کتاب کی تاریخ اشاعت کے بارے میں رضا جو کہیں گے میں اسے بے چون و چرا مان لوں گا، اور مان ہی نہ لوں گا بلکہ ان کی مقرر کردہ تاریخ کو اوروں کی بیان کردہ تاریخ سے اصح مانوں گا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلیف نہیں کہ آج تک اس فیصلے پر مجھے کوئی تردد نہ ہوا اور نہ ہی اس میدان میں رضا کی کوئی غلطی میری نظر میں آ سکی۔

رضا کی نثر بہت سادہ، پاکیزہ، افراط و تفریط سے پاک، طنز و تعریض کے کانٹوں سے مبرا، اور تعلّی سے معرا تھی۔ ان کے انداز میں قطعیت اور لہجے میں اعتماد کی صلابت ضرور تھی، اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ہمارے زمانے میں مرحوم قاضی عبد الودود صاحب کی نثر بیحد اکتا دینے والی اور ژولیدہ ہوتی تھی۔ ان کی تحریر میں نظم اور در و بست بھی بہت کم ہوتا تھا۔ بزرگوں میں علامہ حافظ محمود شیرانی، اور ذرا بزرگ معاصرین میں مولانا عرشی اور مالک رام کی نثر کو میں وضاحت، کفایت الفاظ کے ساتھ مکمل ترسیل کی قوت، اور متانت کے لحاظ سے مثالی سمجھتا ہوں۔ بعد کے لوگوں میں یہ صفات نثار احمد فاروقی، کالی داس گپتا رضا، اور بڑی حد تک رشید حسن خاں کی تحریروں میں جلوہ گر ہیں۔ رضا کی نثر میں علمی وقار تھا، اور اس وقار کی پشت پناہی کے لیے وہ اپنے گہرے اور وسیع علم کی بیجا نمائش نہ کرتے تھے، بلکہ علمیت ان کے متن سے از خود تراوش کرتی تھی۔ حوالوں اور شواہد کی فضول کثرت ان کے یہاں نہ تھی، لیکن وہ کوئی بات بے دلیل نہ کہتے تھے۔

رضا کی محققانہ تحریروں میں ایک خاص بات میں نے یہ دیکھی کہ وہ ایسے لوگوں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے جن میں جوہر قابل تھا، لیکن کسی نہ کسی وجہ سے انھیں وہ امتیاز اور شہرت نہ ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ ایسے مختفی (marginalized) لوگوں میں بہت سے ہندو تھے اور کئی مسلمان بھی۔ رضا نے ان کا مطول یا موجز ذکر اپنی تحریروں میں کیا اور اس طرح انھوں نے ان پسماندہ ادیبوں کا حق ایک حد تک ادا کیا۔ بعض کے ضمن میں انھوں نے ایسی تفصیلات بھی درج کیں جو عام طور پر، اور سرسری معلومات رکھنے والوں کی نظر سے تو یقیناً اوجھل رہتیں۔ میری طرح بہت سے لوگ جنھیں مختفی لوگوں سے دلچسپی، اور ان کی جستجو رہتی تھی، رضا کی

تحریروں سے بہت مستفید ہوئے۔ بعض نمونے ملاحظہ ہوں

امانت لکھنوی امانت کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ایک غزل، "کیوں ہوں۔ لطافت سے پر اشعار امانت" میں امانت نے اپنے بیسیوں شاگردوں کے تخلص نہایت چابک دستی سے لکھ دیے ہیں۔

گور بخش ادیب قوم کا کہار تھا چونکہ طبیعت موزوں تھی، اس لیے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں خود بخود شعر کہنے لگا۔ جب لالہ بینی پرشاد ظریف نے اس کی طبع کی جولانیاں دیکھیں تو وہ اسے مصحفی کے پاس لے گیا اور اس کی چند غزلیں اصلاح کروائیں جنھیں بعد میں مشاعرے میں خوب پسند کیا گیا اور کافی داد ملی۔ ایک دو دن بعد محمد عیسیٰ تنہا شاگرد مصحفی نے کہا کہ آپ ادیب کو اصلاح نہ دیں اور اسے اپنا شاگرد نہ بنائیں۔ اگر حساب ہر کس و ناکس کو اپنے قریب جگہ دیں گے تو ہمارے مرتبے کے لوگ جنھوں نے اس فن شریف کو سیکھنے میں عمر صرف کی ہے، کہاں جائیں گے؟ مصحفی نے ان کی بات مان لی اور ادیب کو شاگردی سے برطرف کر دیا۔ ایک مدت بعد ترقی کرتے کرتے ادیب نواب سعادت علی خاں کے تام جان (ہوادار) اٹھانے والے کہاروں میں داخل ہو گیا اور اپنی قوم میں ممتاز سمجھا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ نواب صاحب اس کی قابلیت دیکھ کر بہت مہربانی سے پیش آنے لگے، حتیٰ کہ اس سے شعر بھی سنتے تھے اور صاد فرماتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں کے انتقال کے بعد جب نواب غازی الدین حیدر تخت نشین ہوئے تو ادیب نے ان کی شان میں قصیدہ پیش کیا۔ نواب نے اسے ایک دوشالہ اور پانچ اشرفیاں بطور انعام دیں اور اسی دن سے تامجان اٹھانے کی خدمت سے سبکدوش کر کے خزانۂ عامرہ میں محرری کی خدمت سپرد کی اور تنخواہ میں اضافے سے سرفراز کیا۔

منشی مینڈو لال زار لکھنوی تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا، ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا زار فارسی میں عالمانہ قابلیت کے حامل تھے۔ فن شعر میں بھی اساتذہ میں شمار تھا۔ (خود لالہ طوطا رام عاصی کے شاگرد تھے) زار کے شاگردوں میں نظم طباطبائی کے علاوہ گوبند پرشاد فضا، منسی دھر ہمت، کنور جی مدہوش، رائے دولت رام شوق، نومد رائے وقار وغیرہ شامل ہیں۔

رضا کو غالب سے محققانہ دلچسپی ۱۹۷۰ء میں پیدا ہوئی۔ چند ہی برسوں میں انھوں نے غالب سے متعلق تحریروں اور تدوینوں کا قیمتی انبار لگا کر اردو دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موہ لیا۔ غالب کی "دعائے صباح" کو منظر عام پر لانے کے بعد وہ دیوان غالب کی تدوین کی طرف متوجہ ہوئے اور کئی برس کی محنت و تلاش کے بعد انھوں نے "دیوان غالب، کامل تاریخی ترتیب سے" کے زیر عنوان اپنی پہلی کاوش ۱۹۸۸ء میں پیش کی۔ شائع ہوتے ہی اس نسخے کی دھوم مچ گئی۔ عام طور پر خیال تھا کہ مولانا عرشی نے اپنے مدون کردہ دیوان غالب (۱۹۵۷ء طباعت ثانی ۱۹۸۱ء) میں کلام غالب کو تاریخی ترتیب سے درج کر دیا ہے اور اب اس پر اضافہ ممکن نہیں۔ لیکن علامہ رضا نے اپنے تدوین کردہ دیوان غالب میں تین طرح کے اضافے کیے۔ یا تین طرح کی نئی باتیں انجام دیں۔ اول تو یہ کہ انھوں نے ہر غزل / قصیدہ / قطعہ / رباعی وغیرہ کا ممکن سال تصنیف طے کیا۔

دوسری بات یہ کہ انھوں نے کلام کو باعتبار سنہ تصنیف جمع کیا۔ تیسری بات یہ کہ انھوں نے بہت سے کلام کی تاریخ تصنیف کے بارے میں عرشی صاحب مرحوم کی تلاش پر مزید جستجو کی اور اپنے فیصلے کے حق میں دلائل فراہم کیے۔

"دیوانِ غالب، کامل تاریخی ترتیب سے" کے بارے میں رضا کا بیان ہے کہ "اس کا پہلا ایڈیشن، بھاری قیمت ہونے کے باوجود، سال پورا ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا"۔ اس بات کو رضا نے غالب کی اقبال مندی کی دلیل بتایا۔ لیکن ایک سو ساٹھ روپے کی قیمت کے اس دیوان کا اتنی جلد فروخت ہو جانا خود کالی داس گپتا رضا کے کام کی مقبولیت، اور مطالعات غالب کے لیے اس ایڈیشن کی اہمیت اور ضرورت کی بھی دلیل تھا۔ ۱۹۹۱ء میں رضا نے غالب کے متداول دیوان کی تاریخی ترتیب پر مبنی اپنا "دیوان غالب، متداول تاریخی ترتیب سے" شائع کی۔ اب شائقین کلام غالب کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ متداول کلام کے مشمولات کی تاریخ متعین کرنے کے لیے انھیں "دیوانِ غالب، کامل تاریخی ترتیب سے" کی ورق گردانی نہ کرنی پڑے۔ مزید آسانی کے لیے انھوں نے اس دیوان کو ادوار میں تقسیم کر دیا تاکہ بیک نظر یہ بھی پتہ لگ سکے کہ غالب نے کس سال میں کتنے شعر کہے جو متداول دیوان میں شامل کیے گئے۔ تدوین کے اس سلسلۃ الذہب کی آخری اور فطری کڑی یہ تھی کہ غالب کے سارے کلام کو تاریخی اعتبار سے مرتب کر دیا جائے۔ رضا نے یہ کام "دیوانِ غالب، کامل، نسخہ گپتا رضا، تاریخی ترتیب سے" ۱۹۹۵ء میں شائع کر کے انجام دیا۔ اسے انھوں نے ۱۹۸۸ء والے "دیوانِ غالب، کامل تاریخی ترتیب سے" کا تیسرا ایڈیشن بتایا، لیکن یہ ان کی کسر نفسی اور انکسار پسندی تھی۔ (افسوس کہ اس صفت سے آج کے اکثر چھوٹے بڑے ادیب عاری اور بے گانۂ محض ہیں)۔

زیر بحث ایڈیشن کی بعض نئی باتیں حسب ذیل ہیں

۱ غالب کی چار مستند تصویریں شامل کتاب ہیں۔

۲ مشکوک اشعار کو خارج کر دیا ہے، لیکن انھیں مقدمے میں جگہ دے دی گئی ہے تاکہ طالب علم کو آسانی بھی ہو اور کلام غالب میں انھیں شامل بھی نہ قرار دیا جائے۔ مشکوک کلام کا فیصلہ انھوں نے اپنی پوری ذمہ دارانہ تحقیق کے بعد کیا ہے۔

۳ بعض مشمولات کی تاریخ دوبارہ اور صحیح تر، متعین کی گئی ہے۔

۴ اساسی نسخوں کی بعض غزلیں ایسی ہیں جس میں اشعار بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔ ایسے اشعار کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

۵ توقیت غالب، جو اول ایڈیشن میں ۱۷ صفحات پر مشتمل تھی، اب ترمیم و اضافہ کے بعد ۲۸ صفحات میں سمائی ہے۔

کالی داس گپتا رضا نے اس پر بس نہیں کیا۔ دیوانِ غالب کی دو اشاعتوں (ایک ۱۸۴۱ کی اور دوسری

۱۸۶۲ء کی) فوٹو کاپی انھوں نے بالترتیب ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء میں مختصر لیکن کار آمد دیباچوں کے ساتھ شائع کر کے اس دولت بے بہا کو عام کر دیا۔ بالخصوص ۱۸۴۱ء والی اشاعت تو اب اس قدر کمیاب ہے کہ مخطوطے کا حکم رکھتی ہے۔ دنیا بھر میں اس کے پانچ یا سات نسخے موجود ہوں گے، (ان میں سے دو تو خود رضا کے کتب خانے میں ہیں)۔ رضا نے بے دھڑک اسے گھر گھر پہنچانے کا انتظام کر دیا۔

رضا نے ۱۹۹۵ء کے دیوانِ غالب کا دیباچہ ان الفاظ پر ختم کیا تھا کہ اب میری عمر ستر برس کی ہو گئی، لہٰذا اب شاید ہی میں اس دیوان جیسا کوئی بسیط تحقیقی کام کر سکوں۔ وہ "غالب دروں خانہ" (۱۹۸۹ء) اور "غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں" (۱۹۹۰) شائع کر چکے تھے، اور ان دونوں کتابوں میں بعض اچھوتے موضوعات پر انھوں نے قلم اٹھایا تھا۔ پھر ۱۹۹۱ء میں وہ "اسد اللہ خاں غالب مرد" کے عنوان سے ایک مختصر مجموعہ مضامین مزید شائع کر چکے تھے۔ اس کے بعد لکھنے کو بچا ہی کیا ہوگا؟ لیکن انھوں نے "غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں" کے پیش لفظ میں لکھا کہ "جتنا مواد چھپتا جا رہا ہے، تقریباً اتنا ہی نیا مواد جمع ہوتا جا رہا ہے۔" لہٰذا اگر عمر اور صحت وفا کرتی تو خدا جانے ابھی اور کیا کیا جواہر ریزے وہ اپنے کنز علم و حافظہ سے نکال لاتے۔ اس کی ایک مثال ان کی آخری کتاب 'غالبیات، کچھ مطالعے اور مشاہدے' (۱۹۹۸ء) میں نظر آتی ہے۔ کہنے کو تو یہ کتاب ایک سو گیارہ منتشر یادداشتوں کا مجموعہ ہے (اور جیسا کہ میں نے انھیں لکھا بھی تھا، اشاریہ نہ ہونے کے باعث اس کتاب سے استفادہ کرنا آسان نہیں) لیکن ان یادداشتوں کی ندرت اور صاحب یادداشت کی باریک بینی، مطالعے کی وسعت اور جزئیات پر نگاہ کی داد دیئے ہی بنتی ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو

(۱) قاضی عبد الودود مرحوم فرماتے ہیں

(غالب کا) خط ابھی شاد عظیم آبادی، اس صدی کے اوائل میں ایک ماہنامے نے شائع کیا تھا۔ اس کی فارسی، غالب کی فارسی نہیں۔

یہ خط جس کی طرف قاضی صاحب نے اشارہ کیا ہے، "اردوئے معلّٰی"، اکتوبر ۱۹۰۴ء، جلد ۳، نمبر ۴ (ص ۳۸) مرتبہ حسرت موہانی میں شائع ہوا تھا۔ (صفحہ ۹۰)

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ۱۹۰۴ء میں شائع شدہ کسی پرچے پر دسترس ہونا خود ہی مستعد بات ہے، چہ جائیکہ اس کے مشمولات یاد رہنا۔ یہ علامہ رضا ہی جیسوں کے بس کی بات تھی۔ پرانے اساتذہ کے غیر معمولی حافظے اور درک کے بارے میں ہم ضرور پڑھتے ہیں لیکن فی زمانہ ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

علامہ رضا خوش فکر شاعر تو تھے ہی، وہ شاعری کے میدان میں اپنے بزرگوں کا احترام اور ان کا حق ادا کرنا بھی جانتے تھے۔ اپنے استادوں کمال کرتارپوری اور جوش ملسیانی سے انھیں عقیدت اور محبت تھی، اور اس کے بارے میں تفصیلی مضامین لکھ کر انھوں نے اس عقیدت کا اظہار مناسب لفظوں میں کیا۔ مشرقی ادب و تہذیب کے آئین پاس و لحاظ اور شعر فہمی کی صفت سے حصہ وافر کے حامل ہونے کی وجہ سے غالب سے ان کا

تعلق محض کتابی نہ تھا۔ غالب ان کے لیے محض تحقیق کا بے جان موضوع نہ تھے، بلکہ ان کی زندگی کی حقیقت تھے۔ انھوں نے لکھا

"جب ہم کہتے ہیں کہ غالب کی عظمت کو اردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچتا تو لوگ گھبرا کر اس جملے کا مطلب پوچھنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ سری کرشن جی نے گووردھن پربت ایک انگلی پر کیونکر اٹھا لیا تھا، حضور نبی کریم نے انگلی سے مہ کامل کے ٹکڑے کیونکر کردیے تھے، تو اس کا کیا جواب دوں سوائے اس کے کہ لوگوں سے کہوں کہ معنی پوچھ پوچھ کر مجھے دق نہ کرو۔ یہ پیغمبران دین ہیں۔ غالب کو اگرچہ ان پاک ہستیوں سے خاک کے ذرے کے برابر بھی نسبت نہیں، تاہم ایک طرح سے وہ بھی شاعری کا پیغمبر تھا، اس لیے لفظ و معنی کے اوپری جھول میں اس کی عظمت ڈھونڈنا کیسا۔"

کالی داس گپتا رضا سے میرے مراسم ان کی آمد ہندوستان کے بعد ہی قائم ہو گئے تھے، لیکن یہ ربط اس وقت دوستی میں تبدیل ہو گیا جب انھوں نے غالب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ ہم اردو والوں کے عام طور کے برخلاف وہ اپنے بارے میں گفتگو سے گریز کرتے تھے۔ ان کی کئی صفات، مثلاً دوست نوازی، محیری، اردو ادیبوں سے بے لحاظ مذہب و ملت برادرانہ مراسم پر ہمیشہ آمادگی، کاروبار میں ان کا درک اور غیر معمولی کامیابی وغیرہ بہت آہستہ آہستہ مجھ پر عیاں ہوئیں۔ اب ان جیسا کوئی نظر نہیں آتا۔

افسوس از قبیلۂ مجنوں کسے نہ ماند

☆☆☆

29, Chastings Road Alahabad, U P 211 001

کالی داس گپتا رضا : تم جیسے گئے ایسے تو جاتا نہیں کوئی

گوپی چند نارنگ

افسوس جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا کے اچانک انتقال کی خبر جس نے بھی سنی سکتے میں آگیا۔ وہ پوری طرح چاق و چوبند تھے۔ شب و روز کام میں ڈوبے ہوئے تھے۔ غالبیات میں انھوں نے ایک کے بعد ایک کتابوں کا جو تانتا باندھ دیا اور جو نام پیدا کیا وہ کسی کے لیے بھی باعث افتخار ہو سکتا ہے۔ غالب شناسی سے گہری علمی کمٹمنٹ کی وجہ سے ہندوستان پاکستان دونوں ملکوں میں وہ بہت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جناب جمیل الدین عالی اور جناب مشفق خواجہ نے انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے ان کو کھلی پیشکش کی تھی کہ غالب پر وہ جو کچھ بھی لکھیں گے انجمن اسے چھاپے گی۔ غلام رسول مہر، امتیاز علی عرشی، قاضی عبد الودود، اور مالک رام کے بعد کالی داس گپتا رضا غالبیات کا سب سے معتبر نام سمجھے جاتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور محقق بھی۔ ان کے شعری مجموعوں کی تعداد ایک درجن سے کم نہیں۔ تحقیق اگرچہ توجہ تخلیق ہی پر کرتی ہے اور سارا معاملہ شعر و ادب ہی کا ہے، تاہم تخلیق میں تو ایک مصرعے سے بھی مغفرت ہو سکتی ہے لیکن علمی کام میں پوری کی پوری عمر کھپ جاتی ہے تب کہیں جا کر یہ اعتبار حاصل ہوتا ہے۔ کالی داس گپتا رضا ہر چند کہ پچاس، ساٹھ کتابوں کے مصنف و مولف تھے، علمی دنیا میں انھیں وقار و اعتبار ساٹھ برس کی عمر کے بعد حاصل ہونا شروع ہوا یعنی ۱۹۸۸ء میں جب انھوں نے اپنی عمر بھر کی تحقیقات علمیہ پر مبنی "دیوان غالب کامل" شائع کیا۔ اگلے سال ہی ۱۹۸۹ء میں انھیں غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب ایوارڈ دیا گیا۔ مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا سراج اورنگ آبادی ایوارڈ (۱۹۹۷ء) میں ملا۔ دہلی اردو اکیڈمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (۱۹۹۶ء) اور ابھی دو برس پہلے ۱۹۹۹ء میں دوحہ (قطر) کا عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ میری تجویز پر دیے گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ساٹھ ستر برس کی سعی و جستجو کے بعد اب کہیں ان کی زندگی میں بہار آنے لگا تھا اور ان کی قدر افزائی ہونے لگی تھی کہ اچانک بلاوا آگیا۔ ان کا پدم شری ہونا برحق تھا اور مارچ ۲۵ر کو وہ راشٹرپتی بھون اپنا ایوارڈ لینے جانے والے تھے۔ اشوک ہوٹل میں قیام تھا۔ وہیں صبح کو ناشتے کے بعد سینے کے پچھلی طرف شدید درد اٹھا۔ چونکہ کوئی عارضہ تھا ہی نہیں، کسی کا خیال قلب کی طرف نہیں گیا۔ ہومیوپیتھی کا علاج خود کرتے تھے۔ دوا لی جو بے اثر گئی۔ اشوک ہوٹل کے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے انجائنا تشخیص کی۔ اپنی دوا پر بھروسہ بھی عجیب چیز ہے، دوسری دوا جمنا پار اپنے بڑے بھائی کے یہاں سے منگوائی۔ اسی دوران درد نے مزید شدت اختیار کی تو شام تک اسکارٹس اسپتال لے جائے گئے۔ وہاں معائنہ کی کارروائی مکمل کرتے کرتے رات ہو گئی۔ اسی دوران پے بہ پے قلب پر حملہ ہوا۔ نصف شب کے بعد ہنگامی آپریشن کی تیاری کی جا رہی تھی کہ عالم بے ہوشی میں جان، جاں آفریں کے

سپرد کر دی۔ یوں غالبیات کے اُفق پر ایک روشن ستارا ٹوٹا اور یادِ رفتگاں کے غبار میں ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا۔

تم جیسے گئے ایسے تو جاتا نہیں کوئی   رہے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی

کالی داس گپتا رضا سے میرے روابط بہت دیر میں پیدا ہوئے۔ یوں شناسائی تو اس سے تقریباً پینتالیس برس سے تھی۔ جس زمانے میں میں دہلی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کر رہا تھا، کالی داس گپتا رضا مشرقی افریقہ میں تھے۔ ان کا تعلق پنجاب کے ایک اگروال گھرانے سے تھا۔ (پیدائش ۲۵ راگست ۱۹۲۵ء، ملکہ پور، تحصیل نواں شہر، ضلع جالندھر) ادیب فاضل، منشی فاضل کر کے مشرقی افریقہ چلے گئے تھے جہاں اُن کے اقرباء کاروبار کرتے تھے۔ سینئر کیمبرج کا امتحان انھوں نے وہیں سے دیا، وکالت کا ارادہ تھا لیکن اُسے ادھورا چھوڑ دیا۔ اردو کا چسکا پنجاب ہی سے اپنی جان کے ساتھ لگا لائے تھے، جوش ملسیانی کے شاگرد تھے جن کا شمار حلقۂ داغ کے نامی گرامی اساتذہ میں ہوتا تھا۔ شاعری گھٹی میں پڑی ہو تو پھر چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ پانچویں دہائی کے آخری برسوں کا زمانہ تھا کہ مشرقی افریقہ سے ان کی دو انگریزی کتابیں آئیں۔ میں دہلی یونیورسٹی آتے جاتے ہوئے اولڈ سکریٹریٹ میں گاہے لگاہے آج کل کے دفتر میں رُکا کرتا تھا۔ جوش ملیح آبادی پاکستان جا چکے تھے۔ عرش ملسیانی ان کی مسند پر متمکن تھے۔ انھیں کی میز پر رضا صاحب کی کتابوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک اور کتاب "ہندوستانی مشرقی افریقہ میں" بھی اسی زمانے میں منظر عام پر آئی۔ یوں کالی داس گپتا رضا علم و ادب کی دنیا میں داخل ہوئے۔

کچھ مدت کے بعد انھوں نے مشرقی افریقہ کو خیر باد کہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بہت سے ہندوستانیوں نے وہاں کی سکونت ترک کی۔ کچھ لندن کی طرف نکل گئے، کچھ ہندوستان کے اطراف میں پھیل گئے۔ کالی داس گپتا رضا بمبئی میں آکر جم گئے۔ شروع میں شعری مجموعوں نے زور باندھا۔ ایک دو بار میری ان کی ملاقات مالک رام کے یہاں ہوئی۔ پھر کبھی کبھار ان کے خط آنے لگے۔ دہلی کے افسانہ نگار ملراج ورما اور شکتی ورما ان دنوں "ناظر" نکالا کرتے تھے جس کا ایک بسیط نمبر عتیق اللہ تابش نے مرتب کیا تھا۔ اس زمانے میں کالی داس گپتا رضا کی متعدد علمی و تحقیقی تصانیف شائع ہو چکی تھیں۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ "شعاعِ جاوید" ادارۂ ناظر سے زیر اشاعت تھا۔ رضا صاحب کی خواہش تھی کہ کتاب میرے مقدمے کے ساتھ شائع ہو۔ ملراج ورما کے تقاضے اپنی جگہ، ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی اصرار کیا تو میں نے رباعیاں پڑھیں، اچھی لگیں۔ ان کے علمی کام سے شناسائی تو تھی ہی شاعری کا سکہ بھی چل گیا۔ لیکن سچی بات ہے کہ جو لوگ علمی، تنقیدی، تحقیقی میدان میں نام پیدا کر لیتے ہیں اور جن کا اصل میلان علمی کام کی طرف ہوتا ہے، وہ لاکھ قادر الکلام ہوں یا عروض و بدیع و بیان کے ماہر ہوں، اُن کی شاعری کی طرف بالعموم کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس کی مثالیں ایک نہیں کئی ہیں۔ ہر چند کہ بہت سے علماء کو ہمیشہ یہ زعم رہا ہے کہ وہ جید شاعر ہیں لیکن زمانے نے ان کی شاعری کو ہمیشہ واجبی ہی سمجھا۔ کالی داس گپتا رضا اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

کالی داس گپتا رضا کا اصل کارنامہ غالبیات اور متعلقاتِ غالب ہے۔ یوں تو انھوں نے اپنے استاد جوش

ملسیانی کا بھی حق ادا کیا، اُن کے مشورات و مکتوبات کو بھی چھاپا، انتخابِ کلام بھی اور ان کے کتابچے "اقبال کی خامیاں" کو بھی اپنے مقدمے کے ساتھ از سر نو شائع کیا، نیز کلیاتِ چکبست، مقالاتِ چکبست اور باقیاتِ چکبست پر بھی توجہ کی۔ انھوں نے داغ و فراق پر بھی خاصا کام کیا تھا، اور اس وقت وہ قومی اردو کونسل کیلئے کلیات فراق کو کئی جلدوں میں مرتب کر رہے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالبیات پر انھوں نے جو کام کیا، اعلیٰ درجے کی جو کتابیں شائع کیں اور زندگی بھر کی انتھک محنت اور تلاش و جستجو سے انھوں نے غالبیات کا جو نادر ذخیرہ اپنے ذاتی ذخیرے کے طور پر جمع کیا، اس کی وجہ سے اُن کا نام اردو کے صفِ اوّل کے محققوں میں ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔ غالب پر انھوں نے کم و بیش اٹھارہ کتابیں شائع کیں جن میں دیوانِ غالب کی اُن اشاعتوں کے عکسی ایڈیشن بھی ہیں جو غالب کی زندگی میں منظر عام پر آئے تھے لیکن اُن کا سب سے بڑا کارنامہ "دیوانِ غالب کامل" کی اشاعت ہے جس میں انھوں نے امتیاز علی خاں عرشی کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے غالب کے اردو کلام کو تمام و کمال تاریخی ترتیب سے مرتب کردیا ہے۔ غالب کے متداول دیوان میں تقریباً اٹھارہ سو اشعار ہیں۔ نسخۂ رضا میں نسخۂ بھوپال قدیم، نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ شیرانی، گل رعنا اور دوسرے تمام اہم قلمی نسخوں نیز غالب کی زندگی میں چھپے دیوانِ غالب کے پانچوں ایڈیشنوں کو ملا کر غالب کے اردو اشعار کی تعداد چار ہزار دو سو چھبیس تک پہنچا دی ہے۔ نسخۂ رضا کی مدد سے حتمی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ غالب کا کون سا شعر کس زمانے میں کہا گیا اور اس کی مدد سے غالب کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور بہت سے من گھڑت قصوں اور افسانہ وافسوں کا بھی جو غالب کے شارحین اور ناقدین نے اپنی سہولت کیلئے تراش لیے تھے۔ غالبیات کی دنیا میں یہ اس نوع کا کام ہے جس سے اس راہ میں قدم رکھنے والا کوئی بھی شخص صرفِ نظر نہ کر سکے گا۔

جامعہ ملیہ کے ہند و پاک اردو افسانہ سیمینار کے بعد اپریل ۱۹۸۰ء میں جب میں انتظار حسین کے ساتھ بمبئی کے سفر پہ نکلا تھا، کالی داس گپتا رضا کے گھر پر بھی دعوت کا پروگرام تھا۔ انتظار حسین نے ملتے ہی کہا، "ویسے تو کالی داس میں گپتا بھی زائد ہے مگر رضا آپ کس خوشی میں ہیں؟" کالی داس نے جواب میں اپنے نوحوں اور سلاموں کا مجموعہ "شعورِ غم" اُن کے ہاتھ میں تھما دیا! علمیت کے ساتھ ساتھ وہ رواداری، تہذیب و شرافت کا بھی مرقع تھے۔ ایک سچے کھرے انسان، غم گساری، درد مندی، صدق و صفا، اخلاق و انکسار کا پیکر جمیل۔ پچھلے دنوں ایک کے بعد ایک کیسی کیسی شخصیات ہمارے بیچ سے اُٹھ گئیں، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری اور اب کالی داس گپتا رضا۔ اردو اپنے تمول کے باوجود پہلے ہی غریب ہے، ان ہستیوں کے اُٹھ جانے کے بعد اب غریب تر ہے۔ اب تو قد بھی چھوٹے ہوگئے ہیں، شخصیتیں اس سے بھی چھوٹی۔ کیا کیا جاسکتا ہے، آنے والوں پر کیا ذمہ داری ہے کوئی تو سوچتا ہوگا۔ دیکھئے رضا نے انسان کی کیا تصویر پیش کی ہے

دو لمحے کی روشنی میں ڈھل جاؤں گا شدّت کی تپش ہوگی پگھل جاؤں گا
روشن نہ کوئی شمع کہیں کر دینا ہر رنگ میں، میں آپ ہوں، جل جاؤں گا

D - 252 Sarrodaya Enclave N Delhi - 110 017

کالی داس گپتا رضا : ایک دبستان

حسن عباس فطرت

خدا بخشے میرے نانا مرحوم ادب و شعر کے بڑے رسیا تھے اور کبھی کبھی خود بھی شعر کہتے تھے۔ "آبِ حیات" و "یادگار غالب" کے حافظ تھے۔ شام کی چائے پر ہم سب جمع ہوتے تھے۔ چائے کے بعد وہ اپنی گل افشانیاں شروع کر دیتے۔ میرؔ و سوداؔ، ذوقؔ و غالبؔ، مومنؔ و آتشؔ ان کے پسندیدہ شعراء تھے۔ ہم ان کی باتوں کو منہ کھولے ہوئے سنتے۔ بدلے ہوئے زمانے کے مطابق بعض باتیں اَٹ پٹی بھی لگتی تھیں۔ مگر مزہ آتا تھا اور یہی کچھ سنتے سنتے ہمارے سَر میں بھی ادب و شعر کا سودا سا گیا۔ اور کچھ دنوں بعد ہی یعنی نابالغ ہونے کے باوجود ادب کا مطالعہ کر کے اس لائق ہوگئے کہ ان کی بات میں لقمہ دے سکیں۔ کہیں پر سوال کریں اور دبی زباں سے اعتراض بھی۔ ہمیشہ ہی ایسے لوگ جہاں تہاں ہوا کیے ہیں۔ مجنوںؔ گورکھپوری نے اپنی دادی کی فارسی دانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فارسی ادب کے ذوق کا بیج میرے سر میں میری دادی اماں نے بویا۔ آل احمد سرور نے پروفیسر منظور موسوی صاحب کا نام انگریزی ادب سے لگاؤ کو بتاتے ہوئے لیا ہے وہ جو بوڑھے بزرگ کہتے تھے کہ پڑھائی کتنی ہو مگر گڑھائی کے بغیر وہ نامکمل و غیر متحرک رہتی ہے۔ شاید اس کا اشارہ اسی طرف ہے۔ رسمی تعلیم کی اپنی جگہ ہے اپنا مقام ہے لیکن وہ کافی نہیں۔ اس کے پہلو بہ پہلو بزرگوں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی صحبت بھی بہت ضروری ہے۔ گذشتہ زمانے میں بسا اوقات پڑھائی گڑھائی ساتھ چلتی تھی۔ چنانچہ جس وقت علامہ اقبال کے استاد مولوی میر حسین کے بارے میں یہ سوال اُٹھا کہ ان کو شمس العلماء کا خطاب تو دیا ہی جانا چاہیے مگر مشکل یہ ہے کہ ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے تو علامہ اقبال نے بآواز بلند فرمایا کہ میں ان کی جیتی جاگتی بولتی تصنیف ہوں۔ عام طور سے کالی داس گپتا رضا کے بارے میں جب بات ہوتی ہے تو ان کی تحقیق و تدوین، شاعری اور تصنیفات کو گنایا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل بتائی جاتی ہے۔ ان کے کارناموں کو اُجاگر کیا جاتا ہے جو بالکل مناسب اور صحیح ہے مگر دراصل یہ بات بھی بہت ضروری ہے کہ وہ کتنے شعراء ادباء کی گڑھائی میں مددگار ہوئے۔ کتنے لوگ ان کی ادبی گفتگو سے فیض یاب ہوئے۔ ان کے ذوق کی تعمیر ہوئی۔ وہ آگے بڑھے تو بڑھتے چلے گئے۔ میرے خیال سے ان کے اُٹھ جانے کے بعد ان کی تصانیف اور کتابوں سے تو مدتوں استفادہ کیا جاتا رہے گا مگر خود رضاؔ صاحب کی ذات سے، ان کے وجود سے، ان کے علم و آگہی سے جو رو برو، دست بدست اضافہ ہوتا تھا اور وہ نہ جانے کتنی کتابوں سے گراں تر و لا محدود تھا۔ اس کے گم ہو جانے سے جو خسارہ ہوا ہوگا اور ہو رہا ہے اس کی بھرپائی کبھی نہ ہو پائے گی۔

شاعر، ادیب پہلے بھی تھے، اب بھی ہیں، آئندہ بھی رہیں گے مگر ایسی ہستیاں تو جامع علوم و فنوں ہو کر صحن علم و ادب کے پودوں کی آبیاری کریں ان کا وجود اب کم سے کم ہو کر رہ گیا ہے۔ ساری دنیا اپنے میں مگن و مشغول ہے۔ شاعر، محقق، مصنف، ادیب سب اپنے کام میں لگے ہیں۔ کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر ہے تو اپنی شخصیت پر لکھنے لکھانے ورنہ حق المحنت لے کر کسی طالب علم کے لیے پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کرنے کے لیے۔ ہم ہوں، آپ ہوں، ادب کی دنیا میں نووارد یا اس کی گلیوں کے آوارہ گرد یا سال خوردہ۔ کسی کو اب ایسے ٹھکانے نہیں ملتے، افراد نہیں ملتے جہاں وہ جاکر اپنی پیاس بجھا سکیں، کچھ سیکھیں، بحث و گفتگو کریں۔ اپنی کہیں، دوسرے کی سنیں۔ تمام دروازے بند ہیں البتہ کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں کہ بے فیض واصلی کو دور سے دیکھ لیں اور اندر سے کہلا دیں کہ "صاحب گھر میں نہیں ہیں"۔ خواہ صاحب شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھے ہوں۔ گپتا رضا صاحب بہت مصروف تھے۔ پابند وقت، ضبط و نظم کے علام، روزی روٹی کے لیے کبھی کبھی ان کو باہر جانا پڑتا تھا یا دفتر میں مستعد و آمادہ بہ کار ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا، مگر گھر و دفتر کہیں بھی اگر ادب کا کوئی راہ گیر یا آوارہ و محوں ان تک پہونچ جاتا تو اس کی پذیرائی وہ ہمیشہ سیر چشمی و کشادہ پیشانی سے کرتے تھے۔ مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ۔

مجموعہ اضداد اور بھی ہوئے ہیں مگر رضا صاحب جیسے شاید و باید ہوں۔ نذیر احمد کی کہانی پڑھیے، ان کے شاگرد نے لکھی ہے۔ لکھا ہے استاد محترم میرے سامنے ہی روزانہ حسنہ شامی کباب نوش فرماتے تھے مگر کبھی نہ کہا "فرحت اللہ! ایک ٹکڑا تم بھی چکھ لو"۔ مرحوم ڈپٹی نذیر احمد مجبور تو نہ تھے، مگر برا زمانہ دیکھے ہوئے تھے۔ اس سے اہم یہ کہ ان کے "کاروبار" نے ان کو لینا ہی سکھایا تھا۔ اس لیے وہ دینا بھول چکے تھے۔ برخلاف اس کے کالی داس گپتا کا کمال یہ تھا کہ اسی "کاروبار" نے نہ ان کو سخت دل بنایا نہ دام و درم کا غلام۔ نہ مغرور نہ سر پھرا۔ کوئی جان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ ایک شریف، درد مند، عدالت پسند، علم و ادب کا سچا خادم۔ اگر حق و حقیقت کی عینک سے دیکھا جائے تو ان کے ہم پلہ کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ علمی، ادبی شخصیت چھوٹی ہو یا بڑی۔ اسے پاکر ان کی باچھیں کھل جاتی تھیں اور باتوں کا سلسلہ اس طرح چلتا کہ دامن وقت اپنی بکھری ہوئی دھجیوں کو سمیٹتا رہ جاتا۔

گپتا صاحب ایک مخصوص سانچے کے ڈھلے آدمی تھے۔ وہ مختلف علوم و فنوں پر دستگاہ رکھتے تھے جس کا اظہار وہ شاید و باید ہی کیا کرتے تھے اور جس کو معلوم ہوتا وہ تعجب میں پڑ جاتا۔ بیس سال پردیس میں رہ کر بھی وہ دولت کمانے کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ حاصل کرتے رہے اور شاعری و نثر کی صورت میں اسے لوٹاتے رہے۔ علم الاصنام، جیوتش، موسیقی ان کے مخصوص علوم تھے۔ وہ فارسی کے اچھے اسکالر تھے اور عربی کے قدرداں۔ اردو ادب کی تو بات ہی نہ پوچھیے۔ غالبیات سے زیادہ لگاؤ تھا مگر دیگر شعراء کی شاعری کا رس بھی انھوں نے بوند بوند پیا تھا۔ داغ، ذوق، چکبست، آتش، پر تو ان کی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ

ساتھ رثائی ادب پر بھی ان کی گہری اور تفصیلی نظر تھی۔ چھو لال دلگیر کی تبدیلیٔ مذہب پر انھوں نے مسعود حسن رضوی ادیب اور اکبر حیدری سے باقاعدہ ٹکر لی۔ فیصلہ بھی اُنہیں کے حق میں ٹھہرا۔ غالب کی تاریخ ولادت پر ط انصاری سے، علامہ فضل الحق خیر آبادی کے مسئلہ پر مالک رام صاحب سے اختلاف کیا اور ٹھوس دلیلوں اور ثبوت کے ساتھ۔

بمبئی میں کالی داس گپتا رضا صاحب ۱۹۷۰ء میں آئے۔ کچھ ہی دنوں بعد ان کے مقالات "آجکل" میں آنے لگے جنہیں میں شوق سے پڑھتا رہا مگر ملاقات ہوئی ۱۹۷۵ء کے آس پاس جب میں نے اردو "بلٹز" میں مشرقی افریقہ کے ایک ایک ملک کا تاثراتی سفر نامہ لکھنا شروع کیا۔ رضا صاحب کینیا میں برسوں رہ چکے تھے۔ میں نے دو قسطوں میں کینیا، نیروبی، جھیل تماشا کا دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا۔ ماؤماؤ تحریک آزادی، جو موکینیا کی لمبی قید اور پھر رہائی، وہاں کے ہندوستانی مشاہیر وغیرہ۔ اس کے بعد روزنامہ 'انقلاب' بمبئی میں ہر ہفتہ میں نے کتابوں پر تبصرہ شروع کیا۔ کتابیں علم و ادب کی جملہ اصناف ہی نہیں، دیگر علوم و فنون سے متعلق بھی ہوتی تھیں۔ کچھ دنوں بعد رضا صاحب کے ادبی سر رشتہ دار جناب افتخار سیمابی کے ذریعہ مجھے رضا صاحب سے ملاقات کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ مجھے کچھ خاص خوشی یا کشش محسوس نہیں ہوئی۔ بہر حال ملنا طے ہوا تھا تو مل لیے۔ رسمی باتوں کے بعد افریقہ کا ذکر چھڑ گیا۔ پھر کینیا کی باتیں ہوئیں اور ان کے عہد میں موجود شخصیتوں کی۔ انھوں نے اپنی کئی کتابیں بشمول "ہندوستانی مشرقی افریقہ میں" عنایت فرمائیں۔ اور دوبارہ ملاقات کا وعدہ کرکے میں نے رخصت لی۔ نیروبی میں بھی رضا صاحب کی علماء امامیہ سے دوستی رہی اور وہ ان کے علم و اخلاق سے متاثر ہوئے۔ شاید اسی لیے جلد ہی ہم اور وہ گھل مل گئے۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے اپنے کتب خانے کے کارڈ بنانے کا کام مجھے سونپا اور ایک اسسٹنٹ بھی دیا۔ یہ سلسلہ مہینوں چلا۔ "انقلاب" میں ان کی کتابوں پر تبصرے پر معر ثاث ہوئے۔ اس لیے وہ خوش بھی ہوئے۔ گھر پر بھی کئی بار بلوایا۔ اچھی اچھی باتوں کے ساتھ بد بیرائی بھی ہوتی رہی۔ ایک مزے کی بات یہ ہے کہ ان دنوں مجھے کافی فرصت تھی ادھر رضا کا کتب خانہ دیکھتا دوسری طرف امیر خسرو کمیٹی سے منسلک تھا۔ جس کے سکریٹری ط انصاری تھے۔ دن کیسے بیت گیا، رات کیسے ڈھل گئی، پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ رضا صاحب ترقی پسندوں کے کھلے مخالف نہ ہوتے ہوئے بھی ط انصاری کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتے تھے اور میرے سامنے اس کا اظہار بھی کردیتے۔ مگر میں نے کبھی ادھر کا مال ادھر نہیں کیا کہ یہ اپنی فطرت ہی میں نہیں ہے۔ ممکن ہے ظ صاحب سے ان کی مخالفت کی ایک وجہ ان کی آزاد روی، تصنع اور کمال ہوشیاری بھی رہی ہو۔ مزید براں رضا صاحب کی نظر میں ط صاحب کی فارسی کمزور تھی اور ط صاحب کا کہنا تھا کہ غالبیات کے کام میں رضا کو کتاب خانہ جمیل بعد اوی کی خاص مدد حاصل ہے۔ مگر بعد میں وہ رضا صاحب کے قائل ہوگئے اور غالب ایوارڈ کے لیے ان کے نام کو ترجیح دی، مگر بہر حال دونوں کا ملاپ نہیں ہوا جبکہ علی سردار جعفری سے رضا صاحب کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس

کی خوب خوب تعریفیں کرتے تھے۔ ایک بار رضا صاحب نے مجھے ایک مخطوطہ دیا جو عربی نسخ میں کسی اچھے کاتب نے لکھا تھا۔ یہ علامہ فضل الحق خیر آبادی کا کہا ہوا قصیدہ تھا جس میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کی شورش میں اپنی دُکھ بھری کہانی نظم کی تھی۔ میں نے اس کا ترجمہ نہیں خلاصہ مفہوم اردو میں کر کے دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اس کو اپنے مقالہ میں کھپا دیا۔ مگر اس نوٹ کے ساتھ کہ ترجمہ ایک عربی داں نے کیا ہے اور وہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ الغرض اس کے بعد انھوں نے مجھے عربی داں تسلیم کر لیا اور موقع بہ موقع اس کا اظہار بھی کرتے رہے۔ اتفاق سے بعد میں چند مسائل ایسے در پیش آئے کہ میرا ہی جواب ان کو تسلی بخش لگا۔ پھر تو نہ پوچھیے عربی دانی کی کتنی سندیں مجھے دے ڈالیں۔ غالب کی عربی دانی کا مسئلہ آیا۔ خاص کر دعائے صباح کا منظوم اردو ترجمہ جب رضا صاحب کی نظر سے گذرا اس کا گماں تھا کہ غالب عربی کی شُدبُد رکھتے تھے۔ فارسی ترجمہ دیکھ کر انھوں نے اسے اردو کا جامہ پہنا دیا اور بس۔ چونکہ میں دعائے صباح کو مدتوں سے فجر کی نماز کے بعد پڑھتا ہوں، میں نے کئی مقامات پر نشاں لگا کر ان کو بتایا کہ عربی داں ہی اس لفظ کا اردو مبادل لا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ تاریخی شواہد (کمزور) سے بھی ثابت کیا کہ غالبؔ، صہبائی سے کم نہیں تھے۔ بہر حال رضا صاحب بہت کچھ نرم پڑ گئے۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ کاش مَیں نے عربی پڑھی ہوتی اور واقعہ یہ ہے کہ اگر فارسی داں عربی بھی پڑھ لے تو سونے پر سہاگہ ہوتا ہے۔

میرے خیال سے رضا صاحب کی شاعری زندہ و محرک شاعری تھی۔ انھوں نے ہر صنف میں داد سخن دی اور بدلتے ہوئے زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ سے بے خبر نہیں رہے مگر ان کی نثر بھی بہت مضبوط، جاذب اور مستند تھی۔ بقول ایک نقاد، وہ لکھنے کے فن سے واقف تھے خواہ وہ تحقیق ہو یا مقالہ یا ہلکی پھلکی تحریر۔ ان کا خط نہایت پختہ و پاکیزہ تھا۔ غالب ان کی پسند تھے مگر وہ خود بھی ایک محشر خیال تھے۔ زندہ دلی، یار باشی اور چلبلا پن آخر وقت تک ان میں باقی رہا۔ گذشتہ دہائی ان کے ذاتی زندگی کے لیے سخت کشمکش اور رُلا دینے والی تھی۔ اندرونی و بیرونی مصائب میں گھرے تھے وہ مگر وہ تمام خراب دن انھوں نے مسکرا مسکرا کے کاٹ دیے۔ کبھی بھی مایوس و مضمحل دکھائی نہیں دیے۔ نہ خود کبھی اس کا ذکر کیا۔ میرے جیسا کوئی بے چین دوست اگر حال پوچھ بیٹھتا تو اُسی کو تسلی دینے لگتے، سب ٹھیک ہو جائے گا اور اپنے علمی و ادبی مشغلوں میں خلل واقع نہیں ہونے دیا۔ ہر سال دو سال بعد ان کی ایک نئی کتاب چھپ کر باہر آجاتی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ کتابت و طباعت سب بیٹھے بیٹھے ہو جاتی تھی مگر یہی نہیں گپتا صاحب اس کو فروخت کر کے لاگت سے کچھ زائد نکال لینا لازم و واجب سمجھتے تھے تاکہ دوسری کتاب شائع ہو سکے۔ بعض وقت تو ہم سب حیرت زدہ ہو جاتے تھے کیونکہ وہ ہم جیسے کمزور درجے کے دوستوں کو اپنی جملہ مطبوعات مفت عنایت کرتے تھے۔ قیمتی ترین دیوان غالب تاریخی ترتیب کے ساتھ بھی ان کا دیا ہوا میرے پاس ہے۔ ان کی لگ بھگ اسّی فیصد کتابیں میرے کتب خانے میں ہیں۔ کچھ کے بارے میں وہ خود پوچھتے اور میں نفی میں جواب دیتا تو فوراً بھجواتے۔ رضا صاحب پر ان کی زندگی میں چھوٹی

بڑی کئی کتابیں اور نمبر شائع ہوئے۔ میرے خیال میں ان کو اس کی للک اور بہت زیادہ خواہش نہیں تھی مگر اس تعلق سے ان کی دلچسپی فراق کی نصیحت کا نتیجہ تھا۔ وہ بہت دنوں سے ان کو تاکید کرتے تھے۔ اپنی مثال دیتے تھے کہ مجھے دیکھو میں نے اپنے کو پہچانوایا ورنہ قعر گمنامی میں ڈال دیا تھا یاراں طریقت نے اور واقعتاً انھوں نے اس نصیحت کو مان کر اردو ادب پر احسان کیا۔ اردو والوں کو نہال کیا۔ رضا صاحب پر آج اگر میں لکھنا چاہوں اور لکھنا شروع کروں یا ان کی داستان سناؤں تو آپ کیا میری ہی آنکھیں بند ہو جائیں گی اور خاتمہ نہ ہوگا۔ میرے خیال میں یہ مصرعہ غالباً ان پر مکمل طور سے صادق آتا ہے ۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆

Editor Weekly Sadaqat, Post Box No 148, Pune - 411 001

ہم تو راضی بہ رضا ہیں

شمیم طارق

دو ہفتہ کی غیر حاضری کے بعد جب میں واپس ممبئی پہنچا تو بیوی نے خطوط اور پیغامات کے ساتھ یہ خبر بھی دی کہ گیتار ضا صاحب افسوس کر رہے تھے کہ

"شمیم، اتوار کی شام کو لوٹیں گے، اب ان سے ملاقات نہیں ہو سکے گی"۔

مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ وہ میرے سارس جانے اور آنے کی تاریخ سے واقف تھے۔ پھر دل میں خیال آیا کہ شاید ان کا اچانک دلی جانا ہوا ہے اس لیے افسوس کر رہے ہوں گے۔ دو چار روز بعد "پدم تری" ایوارڈ لے کر لوٹیں گے تو بات ہو جائے گی لیکن جب وہ نہیں آئے بلکہ ان کی جگہ ان کے متعلق یہ خبر آئی کہ وہ دنیا ہی سے رخصت ہو گئے ہیں تو ذہن میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک جملہ دستک دینے لگا۔

"مولانا آزاد نے احمد نگر جیل میں قید و بند کے احوال میں لکھا ہے کہ زلیخا (مولانا کی اہلیہ) جو ہمیشہ انہیں الوداع کہنے دروازے تک آیا کرتی تھیں، حسب معمول اس مرتبہ بھی دروازہ تک چھوڑنے آئیں مگر خلاف معمول ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس وقت تو میں ان آنسوؤں کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا لیکن جب جیل میں ان کے انتقال کی خبر پہنچی تو سمجھ گیا کہ وہ اس لیے نہیں رو رہی تھیں کہ میں ان سے جدا ہو رہا تھا بلکہ اس لیے رو رہی تھیں کہ وہ خود مجھ سے جدا ہونے والی تھیں"۔

گیتار ضا صاحب کا افسوس بھی ایسی کیفیت کا مظہر تھا جس کو موت سے پہلے کی کیفیت کہتے ہیں۔ شاید اس وقت وہ خود بھی نہ سمجھے ہوں کہ ملاقات نہ ہونے کی بات وہ کس معنی میں کر رہے ہیں کیونکہ لفظوں اور جملوں کے مفاہیم لغات تک محدود نہیں ہیں۔ یہ محل استعمال کے علاوہ لب و لہجہ اور کیفیت کے اعتبار سے بھی بدلتے رہتے ہیں۔

عام حالات میں اس حقیقت کو گیتار ضا صاحب سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا جنھوں نے لفظوں کی تحقیق میں پوری عمر صرف کر دی تھی پھر بھی مطمئن نہیں تھے۔ ایک مرتبہ میں نے شرارتاً کہہ دیا کہ "ذخیرہ اندوزی بری چیز ہے چاہے وہ کتابوں ہی کی کیوں نہ ہو" تو بہت دیر تک ہنستے رہے کیونکہ وہ عالم ہونے کے علاوہ پشتینی ساہوکار بھی تھے اور اس لفظ کے معنی سے بھی واقف تھے، میرا اشارہ ان آٹھ دس ہزاروں کتابوں کی طرف تھا جو وہ افریقہ میں چھوڑ آئے تھے، اس کے باوجود دوبارہ اتنی ہی کتابیں جمع کر لی تھیں جن میں نایاب مخطوطات اور لغات بھی ہیں۔

ان کتابوں اور مخطوطوں سے تو انھوں نے استفادہ کیا ہی تھا، اپنے اساتذہ کی تعلیمات و اصلاحات کو بھی

سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ آپ استاد یا اساتذہ کا وہ احترام اور ان کے ذکر میں وہ اہتمام میں نے کسی کی زندگی میں نہیں دیکھا جو گیان چند رضا صاحب کی زندگی میں تھا۔ جوش ملسیانی کا ذکر "استادی قبلہ" کہے بغیر نہیں کرتے تھے۔

اسی طرح آپ سے چھوٹوں کے لیے بھی سراپا شفقت تھے۔ ۱۹۹۷ء کے حج کے دوران منیٰ کے خیموں میں قیامت خیز آگ لگ گئی تھی اور افراتفری میں کئی روز تک میں ممبئی فون نہیں کر سکا تھا۔ اس دوران وہ روز فون کر کے بیوی بچوں کو تسلّی دیتے کہ گھبراؤ نہیں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو کہو، بھیج دوں۔

ویسے بھی ان سے گفتگو کے بغیر ہماری سحر نہیں ہوتی تھی۔ باتوں باتوں میں بڑے کام کی بات بتا جاتے تھے۔ ادھر سوال پوچھو، اُدھر جواب حاضر، کبھی کبھی توقف کرنے کو کہتے اور منٹ دو منٹ میں لغت کے الفاظ دہرا دیتے۔ علم کے علاوہ حافظہ بھی غضب کا تھا ان کا۔

کالی داس گپتا رضا کو دنیا محقق، ماہر غالبیات، چکبست کے فن اور حالات زندگی کے ماہر اور شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان دنوں وہ فراقؔ کی نظم و نثر کی کلیات پر کام کر رہے تھے مگر ابھی ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو احاطہ تحریر میں آنے باقی ہیں مثلاً ماہر عروض و قوافی اور زبان داں کی حیثیت سے ان کا جو درجہ ہے اس پر نہیں لکھا گیا ہے۔ تحقیق اور تنقید ہم رشتہ ہیں۔ تحقیق کے ساتھ تخلیق بہت کم لوگوں میں جمع ہوئی ہے، اس پہلو پر بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

ان کی تصنیف و تالیف کی ہوئی کتابوں کی کل تعداد ۶۷ رہے جو شاعری، فن شاعری، سوانح، تذکرے، تحقیق اور شرح سے تعلق رکھتی ہیں لیکن چونکہ ۲۰ سے زائد کتابیں غالبیات کے سلسلے کی ہیں اس لیے چکبست، فراقؔ اور آتش پر اہم کام کرنے کے باوجود ان کی شہرت ماہر غالبیات کی حیثیت سے زیادہ ہے۔

تصنیفات میں (۱) متعلقاتِ غالب۔ (۲) غالبیات چند عنوانات۔ (۳) غالب دروں خانہ۔ (۴) غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں۔ اور تالیفات میں (۱) دعائے صباح۔ (۲) انتخابِ آتش و غالب۔ (۳) دیوان غالب طبع اوّل عکسی۔ (۴) دیوانِ غالب کامل تاریخی ترتیب سے۔ بہت اہم ہیں۔

کہنے کو تو دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے، تالیف ہے، مگر اس کی تیاری میں انھوں نے جس مشقت و دلسوزی کا مظاہرہ کیا ہے وہ کسی تصنیف کی محنت سے کم نہیں ہے۔ یہ ایک کتاب یا دیوان نہیں، ایک کارنامہ ہے اور اس کارنامہ کی انہیں داد بھی بہت مل چکی ہے۔

مگر ایک خاص نکتے کی طرف لوگوں کی کم توجہ ہوئی ہے۔ کسی شاعر کے کلام کی تاریخی ترتیب کو عموماً اس لیے اہم سمجھا جاتا ہے کہ اس سے شاعر کے تدریجی ذہنی ارتقاء کا سراغ لگتا ہے مگر رضا صاحب نے ایک اور وجہ بھی بتائی ہے۔ انھیں کے لفظوں میں "جب تک غالب کے تمام کلام کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ نہ کیا جائے گا ہم نتائج اخذ کرنے میں اکثر ٹھوکریں کھاتے رہیں گے"۔ یہ معمولی نکتہ نہیں ہے اس لیے دیوانِ غالب کامل کی تاریخی ترتیب میں انھوں نے بڑی مشقت جھیلی ہے۔ اس کے لیے انھوں۔ نے ۲۹ رماخذ سے استفادہ کیا

ہے جس میں سے ۱۲۱ر اس کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں اور باقی ۸ر کے لیے ۱۴ر نسخۂ عرشی پر انحصار کیا ہے۔

تحقیق میں کسی بات کو حرف آخر کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے باوجود غالبیات میں انھوں نے کئی ایسی باتیں لکھی ہیں جو حتمی ہیں۔ عارف اور فرزندیٔ غالب کے متعلق انھوں نے جو تحقیق کی ہے وہ شاہکار ہے۔ عارف کو متبنّی بنالیے والی بات کی شہرت کا مستند مآخذ سے پردہ چاک کرتے ہوئے انھوں نے نہ صرف تمام مالہ وماعلیہ پیش کردیے ہیں بلکہ کلیاتِ عارف بھی تلاش کرلیا ہے اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عارف، غالب کے اسی طرح بیٹے تھے جیسے کسی بھی رشتہ دار کے بیٹے کو اپنا بیٹا کہہ دیا جاتا ہے۔

اسی طرح غالب سے تمام تر محبت و عقیدت کے باوجود انھوں نے ان کی ایک رباعی کے ایک مصرعہ میں عروضی سہو کی نشاندہی کی ہے۔ مصرعہ ہے

دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالبؔ

اس میں ایک سبب خفیف بڑھ گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے "زحاف خرم" کے تحت جائز ٹھہرانے کی کوشش کی ہے مگر رضا صاحب نے محقق طوسی کے "معیار الاشعار" سے "خرم" سے متعلق اقتباس نقل کر کے ثابت کردیا ہے کہ محقق نے بھی اس کو گراں اور ناپسندیدہ ٹھہرایا ہے۔

گپتا رضا صاحب کا انتقال معمولی سانحہ نہیں ہے۔ اہلِ علم و ادب برسوں انہیں روتے رہیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ اس علم دشمن ماحول میں فلم اور سیاست والوں کو جو شہرت و مقبولیت نصیب ہے وہ علم اور ادب و صحافت والوں کو نصیب نہیں ہے اس کے باوجود میں اس یقین پر قائم ہوں کہ سر حرفِ علم کا مقدر ہے، وقت کے ساتھ گپتا رضا صاحب کی مقبولیت بڑھتی جائے گی۔

ذاتی طور پر میں ایک علمی محسن سے محروم ہوگیا ہوں۔ بیوی رو رہی ہے کہ اس بے روح شہر میں اب اتنے پیار سے بیٹی کون کہے گا؟ مگر ہم سب راضی بہ رضا ہیں کہ انسان کی اوقات بھی یہی ہے اور معراج بھی کہ وہ مشیتِ الٰہی پر نثار ہوجائے۔

غالب نے بھی ایک خط میں لکھا ہے کہ "بزرگوں کا مرنا ہی آدم کی میراث ہے"۔ ماہر غالبیات گپتا رضا اس میراث سے کیسے محروم رہتے؟ انھوں نے بھی اس میراث میں حصہ پایا مگر مرنے یا پیوند خاک ہونے کے لیے اس شہر دلّی کا انتخاب کیا جو غالب کی دلّی ہے، ذوق و داغ کی دلّی ہے۔ شاہجہانی، ہندوی، ریختہ اور اردوئے معلّٰی کا مرکز رہی ہے۔

یہ محض اتفاق نہیں، گپتا رضا کی اردو سے محبت اور غالبؔ سے عقیدت کی دلیل ہے۔

☆☆☆

رضائے الٰہی، حضرتِ رضؔا نہ رہے

سلیم تمنائی

رادر عریر پروفیسر محمد ابراہیم نے ایک ادبی احلاس میں مدعو کیا۔ وہاں ماہر عالیات حصرت کالی داس گپتا رصا تلمید حوش ملسیانی سے ملاقات ہوئی۔ ناچیر نے دوسرے دں اپے عریب حانے پر دعوت شیراز پر مدعو کیا۔ اپنی شریک حیات محترمہ ساوتری دیوی کے ساتھ قدم رنجہ فرمایا۔ ماتوں ماتوں میں بتایا کہ رصا صاحب کا تعلق ملکد پور (پحاب) کے مشہور اگروال حانداں سے ہے۔ ۲۵ ر اگست ۱۹۲۵ء کو ماں کی گود ہری ہوئی۔ ۱۹۴۹ء کو مشرقی افریقہ پرواز کی۔ وہیں محترمہ ساوتری دیوی سے شادی رچائی۔ ۱۹۷۰ء میں اپے پیارے وطں ہدوستاں لوٹے اور بمبئی کو اپنایا۔ اردو نظم و نثر دونوں میں قلم چلا۔ موسیقی کی تعلیم بھی پائی۔ ایک خوش گلو گویے حسیں خاں سے حوب بنتی تھی۔ "صحت وطں کی دعا" نظم صرف اس کی بیاض کی ندر ہی نہ ہوئی بلکہ اس کی حوش الحانی نے چھپے شاعر کے چہرے سے پردہ اُٹھایا۔

اردو اور عارسی سے اچھی واقفیت تھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاصل اور منشی فاضل کیا۔ انگریری لندں یونیورسٹی کے میٹریکولیشن تک۔ مطالعہ حوب اور بہت حوب تھا۔ مالی حالت سے اطمیناں نے سکونِ قلب سے شعر و ادب پر حم کر کام کرنے کا موقعہ دیا۔ غالب اور ان کی شاعری حصرتِ رصا کے دوق پر چھائی اور غالب رہی۔

چاہ سے چائے پی پھر ناچیر کے کتب خانے کے اہم مخطوطات کو بڑے شوق و دوق بھری نظروں سے دیکھا اور پڑھا۔ حد درجے حوشی کا اظہار کیا۔ کتاب الرائے میں ہندو پاک، روس اور ہالینڈ کے دانشور اور ریسرچ اسکالروں کو پڑھا۔ متاثر ہوئے اور انگلیوں میں تھمے ہوئے قلم سے بسم اللہ یوں کی "۲۷ر اپریل ۱۹۸۵ء کو آرزو پوری ہوئی اور ٹیپو سلطاں شہید کے مزار پر پہنچا۔ فوراً کچھ قطعے اور رُباعیاں دہن میں آئیں۔ مجاور حریص اور حائل ہے اس لیے فکر میں مخل ہوئے۔ صرف ذیل کے شعر یاد رہ گئے۔ رباعی

یہ پھولوں ڈھکا مزار سلطانِ شہید — گویا ہے ترو تازہ گلستانِ شہر
دیکھا جو اسے جیسے دیکھا میں نے — انوارِ شہید، اوجِ شہید، آنِ شہید

قطعہ

تربتِ سلطاں پہ دل کو محوِ گریہ دیکھ کر — موجۂ طوفانِ غم کانوں میں میرے کہہ گیا
مٹ گئے عدو اب کوئی نشاں باقی نہیں — مرد تھا سلطانِ ٹیپو، مرد زندہ رہ گیا

اب یہ اشعار جناب سلیم تمنائی صاحب کی نذر ہیں۔ میرے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ بمبئی سے نکل کر شمالی ہند میں نہیں بلکہ جنوبی ہند میں ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوگی جو نہ صرف میری طرح جنوبی ہوگا بلکہ ایسا ہوگا جس سے گھنٹوں مخطوطوں اور دوسرے تاریخی ادب پر عقل و ہوش کی باتیں کی جاسکتی ہیں۔ ان سے اور ان کے افرادِ خاندان سے مل کر ساوتری (میری اہلیہ) اور میں بہت محظوظ ہوئے۔ پرماتما انھیں خوش و خرم رکھے اور تمنائی صاحب سے بار بار ملاقات کے مواقع فراہم کرے۔ آمین"

کالی داس گپتا رضا۔ ۹ ؍ مئی ۱۹۸۵ء بر مکان جناب سلیم تمنائی صاحب، میسور

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ خوشی ضرور ہوئی لیکن شرمندگی بھی اس کے ساتھ ہوئی تھی۔

ہم دونوں مخطوطات کے تعلق سے محوِ گفتگو تھے۔ بیگم محجبیہ سلیم اور بھابی ساوتری دیوی، پتہ نہیں کن کن باتوں سے لطف اٹھا رہی تھیں کہ نوالے اور پانی کے گھونٹ کے ساتھ ہنسا اور قہقہے مارنا خاص بات سی بن گئی تھی۔ اس محفلِ شاداں و فرحاں میں ہنستے ہنستے معصوم کرداروں میں ننھی پیاری عائدہ، صاحبزادیاں سلمیٰ عذرا، حسنیٰ اور سجیدہ صاحبزادے شعیب میاں بھی تھے۔

بزرگ شاعر کی انگلیوں میں قلم تھا اور فی البدیہہ رباعی کی کلیاں کاغذ پر کھل گئیں۔ سجیدہ صفت ماجیر کی بڑی صاحبزادی اتم سلمیٰ کی نذر تھی یہ رباعی

ماں باپ کا سر اونچا اٹھائے سلمیٰ — سسرال کی عزت کو بڑھائے سلمیٰ
پھل کھائیں، سبھی چھاؤں میں آرام کریں — اللہ، وہ گلزار کھلائے سلمیٰ

معصوم شعیب میاں کی معصومیت اور سجیدگی حضرتِ رضا کو کچھ زیادہ ہی پسند آئی۔ شعر رقم کیا ہے

دیکھا تو کہا ہم نے کہ پیارے ہیں شعیبؔ — ہم دونوں پکار اُٹھے ہمارے ہیں شعیب

ایک نظر محفل کی ہنستی بولتی معصوم کلیوں پر ڈالی اور کہا۔

کیا دل ٹوٹ گیا عائدہ، عذرا حسنیٰ — نام جو چھوٹ گیا عائدہ، عذرا حسنیٰ

دوسرے دن دونوں چلتے آئے۔ آج گفتگو میں خاصی سنجیدگی تھی۔ حضرتِ رضا نے فرمایا، سلیم صاحب! آپ کا مضمون "حرفِ شیریں" رسالہ آجکل دہلی میں پڑھا۔ کافی مقبول رہا۔ "ہماری زباں" میں ڈاکٹر گیان چند جین نے اس پر بحث چھیڑی اور یہ سلسلہ بخوبی کئی ماہ چلا۔

میں نے وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عرض کیا کہ موصوف کی رائے بھی میرے لیے مقدم ہے۔ ان کی شیریں زباں کی کلیاں چٹخنے لگیں۔

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی ترا قرآں بھی ترا — مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

مجھے بلکہ زمانے کو تسلیم کہ محمدؐ، جبریل اور قرآں سب تیرے ہیں مگر میرا شعری کلام بھی تو تیرا ہی ہے۔ اُسے بھی وقار بخش۔ میرے خیال میں شعر کا مطلب اتنا ہی ہے۔ شعر میں تین مقام غور طلب ہیں مگر،

یہ، حرف شیریں۔ 'مگر' مصرعہ اولیٰ کو دوسرے مصرعہ سے قطعی الگ کر دیتا ہے۔ 'یہ' سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو مصرعہ اولیٰ کے علاوہ ہے اور وہ چیز ہے حرف شیریں۔ 'حرف شیریں' میں سوائے شعری کلام کے کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا یہ "حرف شیریں" سے مراد یہی شعر ہے جسے شاعر لکھ رہا ہے"

کالی داس گپتا رضا۔ ۸۵/۵/۱۲

میسور اور اوٹی میں دیوان غالب کی تاریخی ترتیب میں لگے رہے۔ قیام میسور میں ادب نواز اور ادباء و شعراء سے بڑی خندہ پیشانی سے بغل گیر ہوئے۔ میسوری احباب سے ایک خاص انس ہو گیا تھا۔ اکثر لکھا کہ بھائی، میسور اور اہل میسور کی یاد برابر آ رہی ہے۔ ان کے خطوط بھی بڑے کام کے ہوتے ہیں اور دلچسپ بھی۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ملاحظہ ہو

☆ محب مکرم تسلیم آپ کا کرم نامہ ملے کئی روز ہو گئے۔ لیکن یہاں آتے ہی مفلوج ہو گیا۔ ہاتھ اور بازو بالکل بے کار ہو گئے۔ اب چند روز سے کافی اچھا ہوں ورنہ ورنہ ہو ہی چکا تھا۔ کچھ روز ہوئے آپ کو کچھ کتابیں بھجوائی ہیں۔ ملنے پر اطلاع دیجیے۔ کسی کتاب پر دستخط نہیں۔ وجہ یہ کہ میرا گھر سے نکلنا بند ہے۔ ساری کتابیں آفس کے ذریعے سے بھیجی گئی ہیں لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ معاف فرمائیے گا۔ ان میں "شعور غم" اور "اجالے" کی جلدیں کچھ زیادہ ہیں۔ انھیں جہاں مناسب سمجھیں دے دیجئے گا۔ ایک اکرام کاوش صاحب مشہور شاعر اور ادیب کو ضرور دیجیے۔ بھائی میسور اور اہل میسور کی یاد تو برابر آ رہی ہے مگر دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا" والی غزل غالب نے بیس بائیس سال کی عمر میں کہی تھی یا یوں کہیے انشاء کی وفات ۱۸۱۷ء تک یہ غزل کہی جا چکی تھی۔ ۱۸۲۱ء کے غالب کے کلام (قلمی) میں شامل ہو چکی تھی یا چمپیلی[1] نے غالب کی زمین میں غزل کہی یا شعر چمپیلی (متخلص یاسمن) کے شعروں سے قریوں آ گئے ہیں۔ مسعود حسین رضوی ادیب مرحوم "مراح" کو

---

[1] بہارستان ناز (۱۸۶۴ء) میں حکیم فصیح الدین رنج نے انشاء اللہ خاں کی باندی چمپیلی متخلص یاسمن کے وہ شعر پیش کیے ہیں جس سے یہ گماں ہوتا ہے کہ چمپیلی کے اشعار کو غالب نے اپنایا ہے

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
یاسمن

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
غالب

کوچ کر جائیں گے ہم دنیا سے   گر تیرا وقت سفر یاد آیا
یاسمن

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقت سفر یاد آیا
غالب

واحد استعمال کرنے پر زور دیتے تھے لیکن لکھنو کے ایک مستند استاد کا شعر دیکھئے، سحر لکھنوی، رضوی ادیب سے زیادہ مستند تھے۔

تیرے نار اُٹھتے نہ اُٹھیں گے مزاج اغیار کے　　ہم فقط عاشق ہیں داروغہ نہیں سرکار کے

سحر لکھنوی نے واحد بھی استعمال کیا ہے۔

بات کرنا نہ آئی ستم کو　　پوچھتا ہے سحر، مزاج اچھا

بہر حال مزاج کو واحد ہی استعمال کرنا چاہیے۔ اب تھک گیا ہوں۔ فقیر محمد صاحب کو شریف صاحب (ڈاکٹر شفیع احمد شریف مدیر آفتابِ کرناٹک، میسور) کو اور سب اہل حرم کو آداب۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آپ کے بچے بچیوں کی یاد دل و دماغ کو گلزار کیے ہوئے ہے۔ فضل اللہ صاحب　　کو سلام کہیں۔

مخلص کالی داس گپتا رضا۔ ۷/۸/۸۵

☆ محب مکرم　　آپ کا نوازش نامہ ملے ہوئے تو مدت ہوئی، چونکہ آپ کی مطلوبہ کتابیں میرے پاس نہ تھیں (طبیعت تو خراب ہے ہی) اس لیے انھیں دلّی سے آتے آتے دیر ہو گئی۔ اب مندرجہ ذیل کتابیں تین بنڈلوں میں ارسالِ خدمت ہیں۔ انھیں میرے کرم فرماؤں میں اور باقی ماندہ، اگر ہوں تو لائبریریوں میں تقسیم کردیں یا جیسا آپ چاہیں انھیں کام میں لائیں۔ تفصیل یہ ہے (۱) Silent Flame -6۔ (۲) شعورِ غم -5 (۳) اُجالے۔ 4 (۴) ہندوستانی مشرقی افریقہ میں۔ 10 (۵) انتخاب آتش و غالب۔ 10 (۶) شعاعِ جاوید۔ 15۔

افسوس ہے کہ مشوراتِ جوش ملسیانی کی کوئی جلد دستیاب نہیں ہوئی۔ تلاش میں ہوں۔

میں نے آپ کے تعلق سے لطیف الزماں خاں[1] (پاکستان) کو آپ کا پتہ دے دیا ہے۔ وہ رشید احمد صدیقی کے بڑے شیدا ہیں۔ شاید آپ کو لکھیں گے۔ ویسے میں نے سب حال لکھ دیا ہے۔ "صبح بہار" میسور[2] کے رشید صاحب والا مضمون ایک اچھی دریافت ہے۔

جو "دیوان (کلیات) غالب اردو، تاریخی ترتیب سے" میں ایک عرصے سے مرتب کر رہا ہوں، اس کا

---

[1] جناب لطیف الزماں خاں کا خط کچھ دیر ہی سے ملا۔ علی گڑھ سے بھائی مہر الٰہی ندیم (آزاد لائبریری) نے بھی لکھا تھا۔ دراصل یوم حیدر آباد میں ناچیز کا جو مضمون رشید احمد صدیقی کے تعلق سے چھپا تھا، اس کا حوالہ حضرت رضا نے انھیں دیا تھا۔ لطیف الزماں صاحب نے لکھا کہ یہ ناچیز ان کے لیے اجنبی نہیں۔ کرم فرما رضا صاحب نے جس طرح تعارف کرایا ہے وہ ان کے لیے کسی طرح خوش نصیبی سے کم نہیں۔

[2] صبح بہار میسور (۱۹۱۲ء۔ ۱۹۰۶ء) حکیم محمد علی آزاد بن صوفی احمد علی و شاگرد عزیز حکیم اجمل خاں کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ جس میں حضرت رشید احمد صدیقی کے ابتدائی مضامین بھی چھپے جبکہ وہ جونپور سے تعلق رکھتے تھے۔

کام ابھی جاری ہے۔ اوٹی اور میسور میں اُس پر کافی کام ہو گیا تھا لیکن بعض گوشے اب بھی تشنہ ہیں۔ ذرا انھیں بھی دیکھ لوں تو آگے بڑھوں۔

رزاق افسر[1] صاحب نے تمام اخباروں کے تراشے بھجوائے تھے۔ انھیں شکریے کا خط لکھ دیا تھا۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔ شعاعِ جاوید (رباعیات کا مجموعہ) سب کو ضرور دیں۔ اگر کم پڑتا ہو تو لکھیں، اور بھیج دوں گا۔ حباب ابراہیم کو بڑی دیر سے لکھا۔ وہ مجھ سے خفا ہوں گے مگر میں انھیں خفا ہونے نہیں دوں گا۔ وہ بڑے مخلص آدمی ہیں۔

ساوتری اور میری طرف سے آپ کی چھوٹی بہن، بیٹے، بیٹیوں کو بہت سا پیار اور دعائیں اور بیگم تمنائی صاحبہ کو آداب۔ مخلص کالی داس گپتا رضا۔ ۸/۹/۸۵

☆ محبِ مکرم! چار فروری کو کرم نامہ ملا۔ یہ بھی خوب رہی کہ لطیف الزماں کا بھیجا ہوا خط (میری معرفت) آپ کو نہیں ملا۔ اتفاق سے میں نے اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی رکھ لی تھی۔ وہی آج بھیج رہا ہوں! (ا خط ملا۔ رشید صاحب کے خطوط روانہ کر دیے گئے۔ کتاب چھپی مگر اس ناچیز کو نہیں بھیجی گئی۔ عزیزی عظیم الدین عظیم نے بنگلور کے کسی کتب خانے سے حاصل کر، میرے خطوط کی زیراکس کاپی روانہ کی۔ اکثر یہ دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ اپنی مطلوبہ چیزیں زید عمر بکر سے حاصل کی جاتی ہیں لیکن کتاب کی طباعت کے بعد یہ محسن یاد نہیں رہتے۔) لطیف الزماں بڑے اچھے آدمی ہیں، ان کی مطلوبہ تمام چیزیں، اُن کو بھیج دیجئے اور جلد سے جلد۔

"ساہ" فصیح ہے اور "سہا" غیر فصیح[2] تاہم بعض اساتذہ نے "سہانا" بھی استعمال کیا ہے۔ گو اس سے بچنا چاہیے جیسے مجروحؔ شاگردِ غالب

ان کو تو پاس محبت نہیں اصلاً لیکن — سہہ سکے تم سے اگر حسرتِ دل اور سہاؤ

یعنی ساہ کی جگہ۔ مگر سہنا اور سہہ جانا وغیرہ اسی طرح رہیں گے جیسے امیرؔ

راضی ہو تو یہ پیر بھی دے ساتھ تمہارا — سہہ جائیں گے ہم تھامے ہوئے ہاتھ تمہارا

یہاں سہہ جانا، گزارا کر لینے کے معنی میں ہیں۔

"تناظر" کے گپتا رضا نمبر میں کوئی مضمون میرے اور غالبیات کے تعلق سے نہیں ہے۔ اس کے لیے نمبر ۲ زیرِ ترتیب ہے۔ ورما صاحب نے اطلاع دی ہے کہ "غالبیات اور رضا نمبر" اڑھائی سو صفحوں کا ہوگا۔

مغربی بنگال اور کرناٹک، اردو اکاڈمیوں کی طرف سے انعامات کی خبر مسرت اثر آئے[3] آپ بہت سے

---

۱ ریاست میسور کے مشہور شاعر۔ ان کے گھر میں رضا صاحب کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔

۲ انجمن اشاعت اردو کے ادبی اجلاسوں میں زبان کے تعلق سے کئی سوال اٹھتے اور حل کیے جاتے۔ اساتذۂ فن سے اس سلسلے میں اکثر خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔

۳ ناچیز کی تصنیف "داتائے راز دیارِ دکن میں" کی چھپائی کیلئے کرناٹک اردو اکاڈمی نے مالی امداد سے نوازا تھا۔ مزید نوازش مغربی بنگال اور بہار اکادمیوں نے انعام کی صورت میں کی۔

مزید انعامات کے حقدار ہیں۔

ساوتری کے پیٹ کا ایک بڑا آپریشن ہوا تھا۔ اب وہ رو بصحت ہو رہی ہیں۔ میسور کے سب احباب مجھے یاد آتے ہیں۔ آپ کا حلقہ اچھا ہے۔ بنگلور میں ٹھہرے کا موقعہ نہ ملا۔ اس لیے وہاں کے اردو دانشوروں سے کوئی خاص ملاقات نہ ہو سکی۔ ساوتری اور میری طرف سے آپ سب کو سلام اور بچیوں کو دعائیں۔

مخلص کالی داس گپتا رضا۔ ۱۲/ ۳/ ۸۶

میسور میں اردو ادباء و شعراء کے علاوہ انگریزی کے مشہور ادیب و شاعر حضرت فقیر محمد سے کافی متاثر تھے۔ حضرت رضا کی ایک انگریزی کتاب The Silent Flame پر بڑا اچھا تبصرہ کر میرے ہاتھ تھمایا اور میں نے رضا صاحب کے۔ دونوں ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ناچیز کا خط ملا تو لکھا

☆ محب مکرم، تسلیم ماہ مارچ میں آپ کا خط جناب فقیر محمد صاحب کے تبصرے کے ساتھ موصول ہوا تھا۔ چاہتا تھا کہ مفصل جواب دوں مگر مکروہات نے فرصت ہی نہ دی۔ اب جو آپ کا پوسٹ کارڈ ملا تو بہت شرم آئی۔ تبصرہ خوب اور بہت خوب ہے۔

فقیر محمد صاحب نہایت قاعدے کے آدمی ہیں۔ وہ صرف علمی ادبی لحاظ ہی سے اونچے نہیں۔ ایک انسان کے ناطے سے بھی بڑے باوقار ہیں۔ میں ان کی خاموش اور سنجیدہ طبع پر دل ہی دل میں رشک کیا کرتا ہوں۔ پرماتما انھیں ہمیشہ خوش رکھے۔ سلام عرض کریں۔

کیا آپ نے لطیف الزماں صاحب کا تمام مطلوبہ مواد روانہ کر دیا۔ نہ کیا ہو تو فورا کر دیں۔ وہ بڑے مشتاق ہیں۔ دو اچھے آدمیوں کا میل ہو جائے تو کیا کہنا!

ڈاکٹر طیب انصاری کا خط ملا تھا۔ سیّد منظور احمد صاحب سے مل کر بھی خوشی ہو گی۔ ساوتری اب بالکل ٹھیک ہیں گویا ہم دونوں جتنا اس عمر میں ہونا چاہیے ٹھیک ہیں۔ اہل میسور خوب یاد آتے ہیں۔ ماشاءاللہ آپ کا تو ہمہ خانہ باغ ہے۔ آپ لوگوں کی بو باس تو ابھی تک دماغ میں رچی بسی ہے۔ بیگم صاحبہ کو آداب کہیں۔ بچے بچیوں (آپ کی بہنوں کو بھی) کو پیار دیں۔ مخلص کالی داس گپتا رضا۔ ۱۰/ ۴/ ۸۶

میری بڑی صاحبزادی سیّدہ ام سلمیٰ بی ایس سی بی ایڈ کی شادی کا رقعہ ملا تو بہت خوش ہوئے اور مبارکباد دی۔

☆ محب مکرم، آداب ایک مدت کے بعد آپ کا مکرمت نامہ باصرہ نواز ہوا اور وہ بھی عزیزہ ام سلمیٰ سلمہا کے مژدہ عقد سعید کے ساتھ۔ پرماتما عزیزہ اور عزیز سیّد ناصر الدین حسینی سلمہٗ کی جوڑی کو تادیر سلامت رکھے اور بہت سے پھل پھول عطا فرمائے۔ آمین۔ بیگم سلیم تمنائی کو بھی ساوتری اور میری طرف سے مبارکباد۔ سب بچوں کے لیے دعائے درازئ عمر۔ مخلص کالی داس گپتا رضا۔ ۴/ ۱۲/ ۸۶

داماد کا قیام بھی بمبئی ہی میں تھا۔ جب دونوں دلہا دلہن رضا صاحب کے دولت خانے پر ملنے گئے تو وہ

کافی خوش ہوئے اور خوب مہماں نوازی فرمائی۔

میرے عزیز دوست پروفیسر راہی قریشی گلبرگہ نے رضا صاحب پر پی ایچ ڈی کی۔ اللہ کرے وہ کتابی صورت میں شائع ہو جائے۔

میسور، بنگلور کے خوبھی علم دوست اور تحقیق کے شیدا دوست واحباب آپ سے ملنے کا شرف حاصل کرتے تو اس ناچیز اور اس کے خاندان کی خیر خیریت ضرور دریافت فرماتے۔

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنوے میری ناچیز تصنیف "بزرگ چہرے" کو مالی امداد سے نوازا اور اس کا ایک نسخہ بزرگ محترم حضرت رضا کی خدمت میں پہنچا۔ کتاب کو پسند کیا اور اس پر تبصرہ کورے میں دریا کی مثل کیا۔

۳۱ / ۳ / ۹۵ "بزرگ چہرے" مل گئی۔ خاکے خوب، خاکے لکھنے والا خوب اور جن پر خاکے لکھے گئے وہ خوب۔ آدھے مشاہیر سے نصف ملاقات کر چکا ہوں۔ ہور باقی ہیں۔ قلم مضبوط، گرفت تگڑی اور زبان پختہ اور کیا چاہیے۔ مبارکباد ! گھر میں آداب اور بچوں کو دعائے درازیٔ عمر۔ مخلص کالی داس گپتا رضا

یادوں کے روشن چراغ برابر جلتے رہیں گے۔ خوپیار، محبت اور انسانیت کے حسین بیج بوئے ہیں وہ لہکتی مہکتی حسین کلیوں اور گلاب کے روپ میں تادیر رہیں گے۔

۲۱ / مارچ ۲۰۰۱ء کو حضرت رضا کا عزیز ترین دھڑکتا دل چپکے سے خاموش ہو گیا اور دوست اور احباب کو ہزاروں آنسو برسانے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

کالی داس گپتا رضا: ایک مخزن العلوم

ہیرانند سوز

میرے ذہن میں کالی داس گپتا رضا کا تصور ہمیشہ ایک عالم اور ہمہ داں شخصیت کے طور پر روشن رہا ہے۔ ان کے نظریات اور فرمودات میرے لیے مشعل راہ رہے ہیں لیکن یہ میری کم نصیبی تھی کہ میں اُن کے دیدار حاصل کرنے کا شرف نہ پا سکا۔ ویسے تو میں ان کی کتابوں کے مطالعے سے فیضیاب ہوتا رہا ہوں مگر اس بار یہ مژدہ میرے لیے انتہائی مسرت بخش تھا کہ وہ ۲۳ر مارچ ۲۰۰۱ء کو حلقہ تشنگاں ادب ی دہلی کی دعوت پر اس کی ۳۳۱ ویں ادبی شام کے سلسلے میں سمینار اور مشاعرے میں شرکت فرمانے کے لیے دلّی تشریف لا رہے تھے۔ اس سمینار میں ایک مقالہ میں نے بھی پڑھنا تھا مگر بنیادی خوشی اس بات کی تھی کہ اُن کے دیدار حاصل ہوسکیں گے۔ مگر کاتب تقدیر کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہم سب اہل شوق جو اُن کیلئے سراپا انتظار تھے، بے رحم وقت کے ہاتھوں ان کے دیدار سے محروم کردیے گئے۔ تقریبات کی مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے وہ ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ ہوٹل کے کمرے میں اچانک ہارٹ اٹیک نے انھیں ہم سے چھین لیا۔ سارے پروگرام درہم برہم ہوگئے۔ دونوں تقریبات منسوخ کرنا پڑیں جن کا انعقاد بعد میں ۸ر اپریل کو کیا گیا مگر اب اُن میں وہ شگفتگی اور بشاشت کہاں تھی۔ سب طرف اُداسی کا ماحول تھا۔ رضا صاحب پر تعزیتی جملے کہے گئے۔ اُن کی طویل ادبی خدمات کو سراہا گیا۔ مشاعرہ اور سمینار تو بس ایک رسمی تقریب ہوکر رہ گئے تھے۔

کالی داس گپتا رضا کی شخصیت اور صفاتِ حسنہ کو کہاں تک بیاں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے تو ایک دفتر درکار ہوگا۔ وہ ہمہ پہلو صفات کے مالک تھے۔ ایک طرف جہاں عالم و فاضل تھے تو دوسری طرف ایک دریادل انسان بھی تھے جن کی شہرت ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی برادری والوں کے ساتھ ساتھ غیر برادری والوں کی بھی ہر لحاظ سے برابر مالی امداد کی ہے۔ وہ اکثر حاجت مند لوگوں سے اُن کی ضروریات کا جواز دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے تھے، اور عطیات بھی اس انداز سے دیتے تھے کہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کا پتہ بھی نہ چلے۔ خاندانی طور پر اُن کا تعلق ساہوکارہ پیشے سے تھا مگر وہ خود کبھی اتنے تنگ دل اور تنگ نظر نہیں تھے۔ کبھی کبھی تو اپنے کارندوں کو وہ یہ بات ذہن میں رکھ کر اُدھار دے دیا کرتے تھے کہ یہ پیسے واپس نہیں ملیں گے۔ حالانکہ بینکنگ کے لیے یہ رویہ قطعاً غیر موزوں سمجھا جاتا ہے۔ وہ ۱۹۲۵ء میں ضلع جالندھر کے ایک خوشحال اور مہذب قصبے ننکد پور میں پیدا ہوئے تھے مگر اپنی عملی زندگی کو ایک نیا زاویہ دینے کے لیے وہ عہد جوانی میں افریقہ ہجرت کرگئے اور لگاتار پندرہ سال سر زمین افریقہ میں سرگرم عمل رہے اور وہیں ایک خوبصورت اور نیک سیرت ہندوستانی عورت سے شادی بھی کی اور ۱۹۷۰ء میں دو خوبصورت

پیارے پیارے بچوں کے ساتھ ہند واپس لوٹے۔

رضا صاحب ایک پر گو اور موزوں طبع شاعر تھے اور ہر صنف ادب پر کامل عبور رکھتے تھے۔ وہ کتنے ہی بلند پایہ اور دو معنی اشعار فی البدیہہ کہہ جاتے تھے کہ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے۔ مشرقی افریقہ میں اپنے قیام کے دوران اُنھوں نے شعر و سخن کی محفلیں سرگرم رکھیں۔ باقاعدگی سے مشاعرے بھی کراتے رہے جس میں بلا لحاظ مذہب و ملت، ہر مکتبۂ فکر کا کلام سننے کو ملتا تھا۔ انھوں نے بھی ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کے شعری مجموعوں "شعلۂ خاموش"، "شورش پنہاں" اور "شاخ گل" کو کافی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ انھوں نے اسلامی موضوعات پر بھی موثر کلام کہا ہے۔ خاص طور پر سانحہ کربلا کی منظر کشی انھوں نے ایسے دردناک انداز میں کی ہے کہ بے اختیار آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

شاعری کے علاوہ جناب کالی داس گپتا رضا کو نثر نگاری میں بھی پورا عبور حاصل رہا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں ماحول کی منظر نگاری نہایت خوبصورت انداز میں کی ہے۔ وہ صرف ماحول کی عکاسی ہی نہیں کرتے بلکہ ان کا پیرایہ طرز نگارش اس انداز کا ہے کہ آنکھوں کے سامنے ماحول کی تصویر بنتی چلی جاتی ہے۔ ہر دل میں پھول والوں کی سیر اور محرم کے جلوس اور مجالس کی تصویر کشی آنکھوں کے سامنے ایک زندہ جاوید منظر نامہ لے آتی ہے۔ "درگی" کے سانحے میں چاہے کچھ اسلوبی لوازمات ہوں مگر سانحہ ایک دردناک اور تلخ حقیقت کی طرح سطح قرطاس پر اُبھرتا ہے۔ سماجی برائیاں، غلط رسم و رواج معاشرے کے چہرے پر بدنما داغ کی طرح نظر آتے ہیں۔ اسی طرح رضا صاحب نے عبدل ماما کو بھی معاشرے کے ایک مثبت کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ جو ذات پات اور مذہب سے بے نیاز ہے۔ وہ ہندو ہے نہ مسلماں، سکھ ہے نہ عیسائی۔ بس ایک انساں سے سر تاپا انساں۔ مگر فرقہ وارانہ فسادات میں اس بے داغ شخصیت کو بھی خون کے چھینٹوں سے رنگ دیا گیا ہے اور اس کی منفرد شخصی شناخت کے کئی پہلو مدھم پڑ گئے ہیں۔ رضا صاحب نے اس تناظر میں کرداروں پر ماحول کے اثرات کا موثر منظر نامہ پیش کیا ہے۔

رضا صاحب کی نثر نگاری میں جہاں تخلیقی عنصر موجود ہے وہاں تحقیقی اور تنقیدی سطح بھی اپنا مقام رکھتی ہے۔ مرزا غالب پر ان کے خیالات اور نظریات کو درجۂ استناد حاصل ہے۔ اُن کی ایک بہت بڑی لائبریری صرف غالبیات کے لیے ہی وقف ہے جہاں ایک اندازے کے مطابق ساڑھے اٹھارہ سو کتابیں محفوظ ہیں۔

انھوں نے "دعائے صباح" کا نسخہ بذات خود آفسیٹ میں چھپوا کر غالب کی اہمیت میں اضافہ کیا مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عربی سے ترجمے کی راہ میں مرزا صاحب کو مشکلات ضرور پیش آئی ہیں۔ انھیں اپنی طرف سے کچھ اشعار کا اضافہ بھی کرنا پڑا ہے جو نثری ترجمے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ غالب کی شاعری پر تحقیق کرنے کے علاوہ رضا صاحب نے مرزا غالب کی ذاتی زندگی پر بھی کافی ریسرچ کی ہے۔ یہاں تک کہ لوہارو

خاندان کے ایک ادنیٰ سے نوکر کلو داروغہ کی سوانح حیات بھی ڈھونڈ نکالی ہیں جس کا رابطہ غالب گھرانے سے رہا ہے۔ رضا صاحب نے صرف مرزا غالب پر ہی اکتفا نہیں کیا انھوں نے چکبست اور جوش ملسیانی پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ چکبست اور باقیات چکبست اُن کی تیار کی ہوئی ایک اہم دستاویز ہے۔ انھوں نے جہاں چکبست کے خاندانی حالات اور کوائف کو تاریخ کے تناظر میں پیش کیا ہے وہاں اپنے وسائل سے ان حقائق پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ چکبست نہ صرف ایک اعلیٰ شاعر تھے بلکہ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ "مشورات جوش ملسیانی" کو رضا صاحب کی تصنیف تو نہیں تالیف کہا جاسکتا ہے تاہم انھوں نے اس پر بہت محنت کی ہے اور استاد محترم کی زندگی کے نقوش کو دوام عطا کر دیا ہے۔ رضا صاحب ایک کامیاب تبصرہ نگار بھی تھے۔ انھوں نے ۱۵۱ کے قریب تبصرے کیے ہیں جو جامع اور سیر حاصل ہیں۔ وہ تبصرے سے قبل مضمون کے لفظ لفظ کو غور سے پڑھتے تھے، تب اپنی رائے قائم کر کے اسے سپرد قلم کرتے تھے۔ انھیں زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ کوئی بھی سہو اُن کی نظر سے بچ نہیں پاتا تھا۔

اردو زبان و ادب کے تئیں اُن کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆

کالی داس گپتا رضاؔ

ڈاکٹر رفعت اختر

کالی داس گپتا رضا یہ نام اس کا تکوں ہے جسے کالی داس گپتا رضا کہا جاتا ہے۔ تکوں کا پہلا حصہ "کالی داس" کی شاعری سے مختص ہے اور دوسرا حصہ "گپتا" جو تاریخ میں گپت ونش کے نام سے جانا جاتا ہے، تیسرا حصہ "رضا" اقبالؔ کے اس شعر کا ماحصل ہے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری "رضا" کیا ہے

یہ رضائے الٰہی ہی نے آنجہانی رضا صاحب کو غالبیات کے ماہرین میں شمار کرایا۔ آیئے اب اس مثلث کا جائزہ لیا جائے۔

(۱) کالی داس ہندی کے مشہور شاعر کالی داس کے یہاں جو انسانیت کے نغمے اور نوحے ملتے ہیں وہ کالی داس گپتا رضا کی شاعری میں قومی یکجہتی کے علمبردار ہیں جس کی نشاندہی ابو الفیض سحر نے اس طرح کی ہے، "کالی داس گپتا رضا، فطرت، مزاج اور ذہن کے اعتبار سے ایک سچے سیکولر ادیب، شاعر، دانشور ہیں۔ کسی نے درست ہی کہا ہے کہ ان کا سیکولرزم "لا مذہبیت" نہیں بلکہ "ہمہ مذہب" پر مبنی ہے۔ کالی داس گپتا رضا ہندوستان کے ہر مذہب سے محبت کرتے تھے۔ اردو تہذیب کے اثر سے اُن کے نظریات و تصورات میں انسانی دائرے کی کشادگی اور عظمت پیدا ہو گئی تھی۔ انھیں ہندوستانی تہذیب سے فطری تعلق خاطر بھی تھا جو ایک لحاظ سے ہماری مشترکہ اردو تہذیب اور ہماری قومی تہذیب کا ہی ایک روشن اُفق ہے اس انداز فکر اور طرزِ معاشرت نے اس کی فکر، سوچ کو یہ الفاظ اور یہ آواز دی

باتیں ایک دوسرے کی سہنا سیکھو دریا میں رنگ موج بہنا سیکھو
بے سود ہیں یہ دیر و حرم کے جھگڑے مل جل کے پڑوسیوں سے رہنا سیکھو

(کالی داس گپتا رضا اور قومی یکجہتی۔ ایوانِ اردو۔ مئی ۲۰۰۱، صفحہ ۵۶۔)

کالی داس گپتا رضا کی شاعری سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے جس کی جڑیں عوامی اور قومی یکجہتی کے محرک نظیر اکبر آبادی کی شاعری سے ملتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر شاعری میں بھی موصوف کی فکریں تحقیق کے تعلق سے بھی اگر کسی سے ملتی ہیں تو وہ ہی "کالی داس" اور نظیر اکبر آبادی۔ آنجہانی کی بالغ نظری کی ایک چھوٹی سی مثال یہ بھی ہے کہ میرا ایک مضمون ۱۹۸۰ء میں آجکل (دہلی) میں بہ عنوان "قومی یکجہتی کے محرک نظیر اکبر آبادی" چھپا تھا۔ آنجہانی نے مضمون پڑھنے کے بعد میرے نام ایک خط میں لکھا "نظیر کو یوں تو میں نے بھی

پڑھا ہے لیکن آپ کا مضمون پڑھنے کے بعد نظیر اکبر آبادی کی تحت الشعور پرستی شعوری حصہ بن گئی۔ بہت خوب"۔

اس مضمون کو اسی سال میں آزاد گلاٹی نے بھی کئی جگہ کوڈ کیا تھا۔ رضا صاحب کی شخصیت میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو انسانیت کے پروردہ ہیں مثلاً سادہ لوحی، انکساری، عجز، قناعت اور صبر و تحمل۔ غصہ ان کی سرشت میں داخل نہ تھا۔ لہٰذا مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ کالی داس گپتا رضا قومی یکجہتی کے چلتے پھرتے انسائیکلوپیڈیا تھے۔ موصوف کی شاعری کی ابتدا نعتیہ نظم سے ہوئی۔ اس اعتبار سے رضا صاحب پنڈت دیا شنکر نسیم کے ہم پلہ ہوگئے۔ پنڈت جی نے "گلزار نسیم" مثنوی کی ابتدا اس طرح کی تھی

کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر مدح حق و مدحت پیمبر

رضا صاحب نے کالی داس سے لیکر گرونانک تک اور شیخ سعدیؒ کے پیغامات کی توسیع کی ہے۔

(۲) "گپتا" گپتا کے تعلق سے آنجہانی تاریخ کے تہوار محسوس کیے گئے۔ تاریخ کا ایک روشن باب "گپت سامراجیہ" "سمدر گپت کی فتوحات سے دنیا ماہر ہے۔ تاریخ تحقیق کا خشت اول ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون "تحقیق کی ہیئت و ماہیت' کے ضمن میں لکھا تھا کہ تحقیق ہیئت کے اعتبار سے ایک علم ہے تو ماہیت کے اعتبار سے ایک فن ہے۔ تحقیق کو علم فن بنانے میں ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا سے کون ناواقف ہے۔ میں نے بارہا مالک رام صاحب سے استفسار کیا تھا کہ غالبؔ کے استفہام سے اب تک بے خبری کیوں۔ مالک رام نے جواب دیا تھا، "اس کی وجہ شاید تشکیک ہو"۔ میں نے مالک رام صاحب کو جواب دیا تھا کہ "یہ تشکیک تو اقبالؔ کے کلام میں بھی موجود ہے"۔ یہ سارا ماجرا جب میں نے رضاؔ صاحب کو لکھا تو موصوف نے تحریر کیا کہ آپ کا استفسار اچھا اور اس کا جواب ایک صوفی منش ہی دے سکتا ہے۔ اس معاملہ میں آپ سے اچھا صوفی اور کون ہوگا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تحقیق جیسے خشک میدان میں بھی روحانیت اور تصوف کے سرے مل جاتے ہیں۔ رضا صاحب کے آنجہانی ہونے کے بعد جب موصوف کے خط کو پڑھا تو جی چاہا کہ چند سطور لکھ دوں۔

(۳) "رضاؔ" نام کے آخری تکوں کے تعلق سے میں نے غالب کا شعر لکھا ہے لیکن اس تکوں کا اختتام تشکیک، نہیں بلکہ الہام ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری لکھ چکے ہیں کہ الہامی کتابیں دو ہیں۔ وید مقدس۔ دیوان غالب۔ کالی داس گپتا رضا صاحب کے نام کی تعبیر و تشریح یہی ہے۔

میں دعا گو ہوں کہ رضا صاحب کے پسماندگان کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے اور "اسباق" کی سرپرستی کے لیے اللہ تعالیٰ کسی اور صاحب فکر کو توفیق دے۔ آمین

☆☆☆

Kalı Paltan, Kacherı Ibadullah Khan, Ghor Khatıyan, Tonk 304 001 Raj

ادب نواز۔ انسان دوست کالی داس گپتا رضا

ڈاکٹر لطیف احمد سبحانی
ریڈر شعبہ اردو، وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنس، ناگپور

ممتاز ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کا ۲۱ر مارچ کو دہلی میں انتقال ہو گیا۔ حکومت ہند نے ان کو پدم شری ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔ وہ ایوارڈ لینے دہلی گئے تھے کہ ہوٹل میں انہیں دل کا شدید دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی وفات پر متین امروہی نے ایک تعزیتی قطعہ فی البدیہہ کہا ہے ۔

کیا خبر تھی ایک پل میں کیا سے کیا ہو جائے گا گھر سے نکلیں گے سفر میں سانحہ ہو جائے گا
موت کے سانچے میں ڈھل ہی جائے گا سارا وجود اور کالی داس راضی بہ رضا ہو جائے گا

کالی داس گپتا رضا ممتاز ادیب، شاعر، محقق، نقاد اور دانشور کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ وہ ۶۱ر کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں کئی برگزیدہ انعامات سے سرفراز کیے گئے تھے۔ صف اول کا غالب ایوارڈ، کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، مہاراشٹر اردو اکیڈیمی کا سراج اورنگ آبادی ایوارڈ، اس کے علاوہ دہلی، یوپی، بہار اور بنگال کی اردو اکیڈیمیوں کے انعامات ملے۔ کئی رسالوں کے گوشے اور خاص نمبر نکلے ہیں۔ کئی کتابیں ان پر لکھی گئی ہیں۔

گپتا رضا ۲۵ر اگست ۱۹۲۵ء کو شنکدپور تحصیل نواں شہر ضلع جالندھر میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا بچپن پنجاب میں گزرا۔ وہیں انھوں نے دوآبہ ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک پاس کیا پھر ادیب فاضل، منشی فاضل انگریزی و فارسی کے ساتھ ساتھ سینئر کیمبرج کے امتحانات پاس کیے پھر لندن چیمبر آف کامرس اور رائل سوسائٹی آف آرٹس سے ریاضی میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے اپنی زندگی مشرقی افریقہ میں پرائیویٹ ملازمت سے شروع کی لیکن جلد ہی وہ تجارت سے وابستہ ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں انھوں نے نمایاں کامیابی حاصل کرلی۔ ان کے والد اردو اور فارسی کے ماہر تھے۔ وہ جوش ملسیانی کے شاگرد تھے۔ اس توسط سے ان کا سلسلہ داغؔ دہلوی سے ملتا ہے۔ گپتا رضا خوش فکر شاعر بھی تھے اور نقاد بھی۔

گپتا رضا کو ماہ محرم میں روز عاشوراء اور تعزیہ داری و سوز خوانی میں کافی دلچسپی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> "میرے گاؤں میں محرم میں عاشوراء کے روز تعزیہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا جاتا تھا جس میں ہندو برابر کے شریک ہوتے تھے۔ ہماری بیٹھک کے سامنے کی جگہ نسبتاً کشادہ ہے۔ وہاں تعزیہ ذرا زیادہ وقت کے لیے رُکتا تھا۔ بیٹھک کے متصل اپادھیائے براہمنوں کا کنواں (پادھیا واکھو) تھا۔ اس پر میرے والد محترم دو سبیلیں لگاتے تھے۔ ایک لال شکر کی

اور دوسری سعید شکر کی۔ میرے والد کٹر آریہ سماجی تھے۔ اور ہمارا سب کا مسلک یہی تھا۔ مگر بزرگوں کی اس روایت کو جو کئی پشتوں سے جاری تھی، پورے اہتمام سے انجام دیتے تھے۔ میں نے خود ان سبیلوں پر گھنٹوں کھڑے رہ کر سینکڑوں تشنگاں رہ کربلا کی پیاس بجھائی ہے۔ ہماری دادی پورے رمضان بھر حاجت مند مسلمانوں کے لیے افطار کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ گاؤں کے مسلمان بستا غریب تھے۔ اس لیے ان کی ثقافتی دیکھ ریکھ خوشحال ہندوؤں کا قومی فریضہ بن گیا تھا۔ اور سب لوگ بلا لحاظ مذہب و مسلک اسے مستحسن نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہ سلسلہ تقسیم ہندوستان (۱۹۴۷ء) تک جاری رہا۔ عاشورا میں سوز خواں خاص طور سے شرکت کرتے تھے جب وہ ہماری بیٹھک کے سامنے رُک کر سوز خوانی کرتے تو میرا دل بھر آتا۔'

اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور فروغ کے سلسلہ میں ان کا بھی ایک نام آتا ہے وہ چاہے ہندوستان میں رہے ہوں یا ہندوستان سے ہزاروں میل دور مشرقی افریقہ میں۔ اردو ان کے ساتھ ساتھ رہی ہے۔ وہ اردو کی خدمت کے لیے وقف تھے۔ وہ اردو کے آدمی تھے۔ اردو کے لیے تھے اور خود اردو ہی سے تھے۔ مشرقی افریقہ میں بھی اردو کے لیے انھوں نے بہت کچھ کیا، وہ لکھتے ہیں کہ

"مشرقی افریقہ میں پہلے ہی سے اردو کے شاعر موجود تھے۔ مگر میرے وہاں پہنچنے کے بعد محفلوں اور مشاعروں میں بیحد باقاعدگی آگئی تھی۔ جو بیس سال تک شدومد کے ساتھ قائم رہی۔ انجمنیں بنیں، مشاعرے ہوئے۔ لوگوں کے ذوق میں اس قدر ترقی ہوئی کہ اگر کچھ عرصہ تک کوئی بزم شعر منعقد نہ ہوتی تو اس کے انعقاد کے لیے شائقین کی طرف سے اصرار شروع ہو جاتا۔ اقبال ڈے، حسین ڈے، بزم میلاد، جشن دیوالی، ہندوؤں سکھوں مسلمانوں کی شادیوں پر سہرے، آریہ سماج، سناتن دھرم کے سالانہ جلسوں میں مشاعرے، ریڈیو پر مشاعرے، گھروں میں تقاریب، غرض کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا تھا جس پر پوری تپاکی کے ساتھ محفل برپا نہ کی جاتی ہو۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں گیتا رضا کی ادبی زندگی کا مختصر مگر جامع ذکر پیش ہو چکا ہے۔ ساحر شیوی جن کا تعلق علاقہ دکن سے ہے، گیتا رضا سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ انھوں نے موصوف کے بارے میں لکھا ہے کہ

نام کو بھی نہیں غرور اُسے	سب سے ملتا ہے آدمی کی طرح
شاعری ہند و پاک تک مقبول	خود بھی مقبول شاعری کی طرح

غیر ممالک میں رہنے کے بعد واپس ہندوستان آئے اور بمبئی کے ہو کر رہ گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"تقریباً ربع صدی مشرقی افریقہ میں گزار کر ۱۹۷۰ء میں پھر وطن کی یاد آئی اور اس کے وسیع میدان اور فلک نما کوہسار دامن کشاں ہوئے۔ یہاں آکر بیوی بچوں کو جن کی پیدائش افریقہ کی ہے، یہ دھرتی ایسی پسند آئی کہ یہیں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں بھی ایک عرصے سے بیرون وطن رہ رہا تھا۔ لہٰذا اب کی جو آیا تو خاک وطن کی سوندھی خوشبو مشام جاں میں سما کے رہ گئی۔ نتیجتاً اب ہم یہیں بمبئی میں رہ رہے ہیں۔ مگر نقل ملک کے بعد تجارت کو دوبارہ قائم کرنے میں اتنا وقت صرف ہو گیا کہ کئی سال تک پچھاب کا رخ نہ کر سکا"۔

کسی بھی قسم کا کوئی بھی مضمون ہو، دیوالی، ہولی، عید، ہندو مسلم اتحاد، دیہاتی ماحول، ہندو مسلم فساد، اس میں ایک مخصوص ماحول کالی داس گپتا رضا ضرور پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کی یہ ایک خوبی ہے کہ طرز نگارش میں ماحول کی عکاسی ضرور ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"موسم برسات میں مہرولی میں جب پنکھا ہوتا تو ہندو مسلمان عجیب جوش و خروش سے شامل ہوتے۔ مشترکہ جلوس نکلتا اور جوگ مایاجی کے مندر اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ پر جاتے، مذہبی تناؤ شاید ہی کبھی دیکھنے میں آتا تھا"۔

اس بیانیہ میں ہندو مسلمان اتحاد کی عملی تفسیر اور زندگی کے عملی نظریۂ اتحاد کا اظہار ہوتا ہے۔ گپتا رضا ایک نقاد کے علاوہ خوش فکر شاعر بھی تھے۔ لیکن محفل میں کلام سنانے سے شرم محسوس کرتے تھے۔ وہ خود کی تشہیر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"میں پہلے ہی سے اپنے شعر سنانے میں بہت شرم محسوس کرتا ہوں اور میری یہ روش آج تک قائم ہے۔ اس لیے میرے اردگرد کے (۱۹۴۲ء) بہت کم لوگ جانتے تھے کہ مجھے شعر کہنے کا شوق ہے حالانکہ اس وقت میں استاد سے اصلاح لینی شروع کر چکا تھا مشاعروں اور اجتماعوں سے گھبراتا ہوں۔ اگر محفل چند ہی افراد پر مشتمل ہو تو لطف اندوز ہوتا ہوں اور اس میں کہہ سن بھی لیتا ہوں۔ نام و نمود سے کوئی غرض نہیں"۔

تحقیق کے لیے محنت، تلاش و جستجو، نقد و نظر، چھان بین اور غیر جانبداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ گپتا رضا کی تحقیق میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ تحقیق کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ

"۱۹۷۰ء سے اردو تحقیق کا شوق ہوا۔ تاریخ سے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ اس لیے اس میدان میں اُترنے کے لیے مجھے مشقت تو بہت اُٹھانی پڑی مگر ایک نومشق کی سی محنت نہیں کرنی پڑی۔ افریقہ کا کتب خانہ وہیں چھوڑ آیا تھا جو پچانوے فیصد انگریزی کتابوں پر مشتمل تھا۔ یہاں آکر از سر نو ذاتی کتب خانے کی بنیاد ڈالی۔ کتابوں کے جمع کرنے

کے لیے طرح طرح کے پاپڑ بیلے"۔

انھوں نے امانت لکھنوی، منشی مسی دھر ہمت لکھنوی پر تحقیقی کام کیا ہے۔ ہمت لکھنوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"ہمت کی تصانیف کے متعلق تمام معلومات بہت محدود ہیں۔ ہندو شعراء میں عشرتؔ نے لکھا ہے کہ ہمت نے ایک قصہ حسن جواہر اردو میں نظم کیا ہے اور ایک دیوان قلمی موجود ہے"۔(ارسہو وسراغ ص ۱۵۵)

عہد مغلیہ نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں۔ تاج محل، اردو اور مرزا غالب کی شاعری۔ یہ تینوں ہماری تہذیب و ثقافت کی شناخت ہیں۔ گیتا رضا کو یہ تینوں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں۔ وہ ہندوپاک میں صف اوّل کے ماہر غالبیات مانے جاتے ہیں۔ اردو دنیا میں قاضی عبدالودود اور مالک رام کے بعد انہی کا نام مرزا غالب اور غالبیات کے لیے مستند سمجھا جاتا ہے۔ دیوان غالب کے تین نسخے کافی قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایک نسخہ حمیدیہ، دوسرا نسخہ خدا بخش لائبریری اور تیسرا نسخہ گیتا رضا جس کے اب تک پانچ صحیح ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے غالب کو تیسری آنکھ سے دیکھا ہے جو دوسرے محققین نقاد اور اہل قلم حضرات آج تک دیکھ نہ سکے۔ دعائے صباح کے ترجمہ کے بارے میں تحقیقی انداز میں لکھتے ہیں کہ

"ان کے (غالب کے) منظوم ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی نثر کو جوں کا توں فارسی نظم میں نہیں لکھا بلکہ اس سے مطلب اخذ کر لیا اور جہاں عبارت نظم میں قافیے اور ردیف کے لیے سازگار تھی، اسے استعمال کر لیا۔ چونکہ عربی نثر کا یہ اسلوب ہے کہ نثری فقروں کو بالعموم قافیے کی رعایت سے کہتے ہیں، اس لیے عربی کے جو لفظ فارسی میں مستعمل ہیں۔ انھیں فارسی نظم میں بے دریغ شامل کر لیا۔ تاہم بعض اشعار میں انھوں نے فارسی منثور ترجمے سے نہ صرف یہ کہ مدد نہیں لی۔ بلکہ اس کے پابند نہ رہ کر عربی متن کی براہِ راست پیروی کی ہے۔ یہ بات غالب کی دعائے صباح کے عربی متن سے واقفیت کی دلیل ہے"۔

غالب ان کی تحقیق کا لازم موضوع ہے۔ وہ غالبیات کے اہم ستون تھے۔ "دیوانِ غالب کامل تاریخی ترتیب سے" ایک اہم کارنامہ ہے جس میں غالب کے دو ہزار متروک اشعار شامل ہیں۔ انھوں نے چکبست کے باریافت کا بھی ایک اہم کام کیا ہے۔ انھوں نے کئی حوالوں سے اور ماخذات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ شاعر اور بے مثال ادیب تھے۔ چکبست کے کام کو اور مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں ذکر چکبست ہے جس میں حیات چکبست کے بعض اہم گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں باقیات چکبست نظم اور نثر ہے۔ اس پر چند مضامین ہیں۔ رباعیاں، نظمیں، غزلیں، متفرق اشعار تیسرے حصے میں اشاریہ اور کنایات ہیں۔ اس طرح چکبست کی شخصیت کو انھوں نے ایک لکھنو کی عہد آفریں شخصیت بنادیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

"پنڈت برج نرائن چکبست خود ایک مایہ ناز ادیب اور شاعر تھے۔ اگر میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبال کو روایتی

درجہ بندی سے بالا ماں کر مقابلہ میں شامل نہ کیا جائے تو چکبست کو اردو کے درجۂ اول کے شاعروں میں جگہ دی جائے گی"۔

گیتا رضا نے تقریباً ۵۱ ر تبصرے تحریر کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ تبصرہ نگاری کے فن سے واقف ہوں گے۔ ان کے تبصروں میں عموماً شرح، معنی آفرینی، ادبیت، سماجی شعور اور فنی خوبیوں اور خرابیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ تبصروں کے مطالعہ سے ان کی بالغ نظری اور مطالعہ کی گہرائی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

کالی داس گپتا رضا ادب نواز اور ادبی انسان تھے۔ انسان دوستی، مروت، وسیع القلبی، جذبہ خدمت خلق، اچھے اخلاق و اوصاف ان میں موجود تھے۔ ہزاروں کتابیں ان کی لائبریری میں موجود تھیں جن کی مدد سے غالب، اقبال، چکبست، داغ، جوش ملسیانی پر تحقیقی و تنقیدی کام کیا۔ مجلس فروغ اردو دوحہ قطر نے انہیں دو سال قبل وقیع انعام سے نوازا تھا۔ وہ کئی رسالوں کے سرپرست تھے۔ تحقیق و تلاش کا زبردست مادہ ان میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ انھوں نے اعلیٰ درجے کے تحقیق پارے دنیائے ادب کو دیے ہیں۔

☆☆☆

غالبیات اور کالی داس گپتا رضا

اَسد اللہ خانِ غالبؔ مُرد

مالک رام

میں پہلے کہیں لکھ چکا ہوں کہ زندگی میں میری ملاقات بہت سے ادیبوں سے رہی ہے۔ اُنھیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اوّل وہ جن سے سرسری ملاقات رہی۔

دوسرے وہ جن سے بہت دن خط و کتابت رہی لیکن ملنے کے مواقع بہت کم رہے۔

تیسرے وہ جن سے لمبے عرصے تک تعلقات رہے، خط و کتابت بھی رہی اور ان کے کردار اور شخصیت کا اثر بھی مجھ پر ہوا۔ عزیزی کالی داس گپتا رضاؔ اسی تیسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ مجھ سے عمر میں تقریباً بیس سال چھوٹے ہیں اور میری ان کی پہلی ملاقات کو بھی تقریباً بیس سال ہی ہونے کو آئے ہیں۔ میں انھیں اپنا معاصر ہی کہوں گا کیونکہ میری نظر میں معاصر ہونے کے لیے عمر کی برابر ضروری نہیں، البتہ ایک زمانے میں موجود ہونا ضروری ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اپنی حیاتِ مستعار میں مجھے رضاؔ ایسے ذہین، صائب الرائے اور فعّال کم ہی ملے ہوں گے۔ مَیں نے پندرہ سولہ سال پہلے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ

"داد دینی پڑتی ہے جناب کالی داس گپتا رضاؔ کی کہ انھوں نے اس موضوع (غالب اور غالبیات) پر دو کتابیں پیش کر دی ہیں ان دونوں کتابوں میں انھوں نے کیا کیا دادِ تحقیق دی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے "۔

مگر آج وہ تینتیس (۳۳) کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جن کا دائرۂ عمل وسیع ہے اور اُن میں بارہ صرف غالب اور غالبیات کے موضوع پر ہیں۔ طرہ یہ کہ ہر کتاب ایسی ہے کہ اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ زیر تبصرہ غالبیات کے موضوع پر ان کی تیرھویں تصنیف ہے جو دس مضامین پر مشتمل ہے۔ عنوانات یہ ہیں

۱ اسد اللہ خاں غالبؔ مُرد
۲ بیدلؔ اور غالبؔ
۳ والیٔ لوہارو اور ۱۸۵۷ء
۴ تصانیف شیفتہ
۵ فسانۂ غالبؔ
۶ اوّلیاتِ مالک رام
۷ حیاتِ غالبؔ

۸ غالب کو نام اور پتے کی شہرت کا خیال

۹ ناسخ، غالب اور اقبال کا کچھ غیر متداول کلام

۱۰ غالب اور اقبال مشرقی افریقہ میں

ان مضامین میں غالب یا غالبیات سے متعلق تمام تر نئے تحقیقی انکشافات نہ سہی مگر عنوانات کے تحت موضوعات کو تفصیلی مباحث سے مالامال کرنے کی کوشش بیحد کامیاب ہے۔ "اسد اللہ خاں غالب مرد" کے عنوان کے تحت مضمون میں وہ تمام جزئیات جمع کردی گئی ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہو سکتی تھیں۔ "غالب اور بیدل" میں شواہد کی بنیاد پر ثابت کیا گیا ہے کہ لفظی اور ترکیبی سطح پر بیدل کے اثرات ۱۸۲۵ء تک غالب کی اردو شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ البتہ تفکیری سطح پر یہ اثرات آخر تک قائم رہے۔ یہاں تک کہ غالب کی شاعری کو بیدل سے عمر بھر حوصلہ ملتا رہا۔ "حیات غالب" میں اسی نام سے شائع ہونے والی چھ کتابوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جو بہت دلچسپ ہے۔ میری مرتبہ کتاب "فسانۂ غالب" پر تبصرہ کرتے ہوئے رضا صاحب بجا ہی فرماتے ہیں کہ یہ دراصل "ذکر غالب" ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اسی طرح "غالب کو نام اور پتے کی شہرت کا خیال" میں غالب کی شہرت طلبی کو خود ان کے خطوط کے حوالے سے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ بات قابل قدر ہے کہ رضا صاحب نے تحقیق کو محض ایک خشک ریاضی کا سا مضمون نہیں بنے دیا بلکہ اسے کسی داستانی طراری کے بغیر (جو کسی حالت میں بھی تحقیق کا حصہ نہیں بن سکتی) حق گوئی کا ایسا اسلوب دیا ہے جس سے قاری کی دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔

بحیثیت مجموعی غالب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب انتہائی کارآمد تحقیقی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆☆☆

غالبؔ درونِ خانہ

ڈاکٹر گیان چند

کسی کا مصرع ہے ع 'محتسب را درونِ خانہ چہ کار' منشی پریم چند کی بیوہ شیو رانی دیوی نے ہندی میں کتاب لکھی "پریم چند گھر میں"۔ 'گھر میں' 'درونِ خانہ' کا مترادف ہے۔ ۱۹۷۱ء میں خالد نظیر صوفی نے "اقبال درونِ خانہ" لکھی ہے۔ ہندی اردو کی ان دونوں کتابوں کے مصنفین متعلقہ ادیب کے قریبی عزیز تھے۔ کالی داس گپتا رضا، غالبؔ کے اہل خانہ نہیں لیکن گھر کے بھیدی ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے 'غالبؔ درونِ خانہ' لکھ کر ۲۷ر دسمبر ۱۹۸۹ء کو بازار میں دی۔ یہ تاریخ غالبؔ کا یوم ولادت ہے۔ غالبؔ کی خاندانی اور گھریلو زندگی کے بارے میں جو بھی معلومات بہم پہنچ سکتی تھیں وہ سب اس کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ لیکن یہ کتاب درونِ خانہ تک محدود نہیں، اس میں چند مضمون زندگی کے بعض دوسرے کوائف کے بارے میں بھی ہیں۔ مثلاً غالبؔ کے سفر کلکتہ کی توقیت، 'آپ حیات میں ترجمہ غالب' وغیرہ۔

کتاب کا پورا نام 'غالبؔ درونِ خانہ' (محقق سوانح) ہے محقق محقق۔ فتح قاف اول اسم مفعول کے صیغے میں۔ دونوں کے معنی یکساں ہیں۔ تحقیق کیا ہوا۔ کتاب کے عنوان سے درونِ خانہ کا جواز تو ملتا ہے لیکن محقق سوانح سے متعلق لگتا ہے جیسے یہ غالبؔ کی باقاعدہ سوانح ہو۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ یہ حیات غالب سے متعلق کی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں سوانح کے کئی اہم ابواب چھوٹ گئے ہیں۔ مثلاً کلکتے میں قتیل پرستوں سے معرکہ، دلّی میں قمار بازی اور قید کی صعوبت، معاشی پریشانیاں، دہلی اور رام پور کے درباروں سے تعلقات، ہم عصر شعراء سے مراسم، غدر کی صعوبتیں، قاطع برہان کا معرکہ وغیرہ۔ جو کتاب درونِ خانہ کا محور ہو وہ پوری سوانح ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے بہتر ہوتا کہ ذیلی عنوان 'سوانح کے چند محقق ابواب' ہوتا۔ خود مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب حیاتِ غالبؔ کی باقاعدہ روداد نہیں ہے (ص ۸)۔ درونِ خانہ کی رعایت سے رضا صاحب نے اپنے پیش لفظ کا دلچسپ عنوان 'خانہ باغ' رکھا ہے۔ جہاں سے وہ درونِ خانہ تاک جھانک کر رہے ہیں۔

کالی داس گپتا رضا اردو دنیا میں ایسے محقق کی حیثیت سے ابھر کر آئے ہیں جو دقّت نظر اور جزئیات بینی کیلیے مشہور ہیں۔ غالبؔ پر تو ان کا مطالعہ اور تحریریں اتنی عریض و عمیق ہیں کہ وہ اس موضوع پر جو کچھ لکھیں گے وہ محقق اور مستند ہو گا ہی۔ ذیل میں اس کتاب کے مختلف ابواب یا مضامین کا ایک سرسری جائزہ لیا جاتا ہے

پہلا مضمون "غالب کا خاندان دادا، والد، چچا اور پھوپھیاں وغیرہ" کے عنوان سے ہے۔ اس میں سات مختلف کتابوں سے خاندان اور اجداد کے بارے میں خود غالبؔ کی تحریروں کے اقتباس دیے ہیں جس میں اس موضوع سے متعلق تمام ضروری باتیں آ گئی ہیں۔ بعد میں رضاؔ نے ان بیانات پر تبصرہ کیا ہے۔

ص ۱۱ پہلا اقتباس پنشن کے مقدمے کے عرضی دعوے سے ماخوذ ہے۔ اس میں انگریزی

فوج کے دو افسروں پرنوں اور لاڈر لیک کا نام آتا ہے۔ لاڈر لیک مشہور افسر ہیں۔ پرنوں غیر معروف۔ رضا صاحب نے تاریخ کی انگریزی کتابوں سے لے کر دونوں کی سوانح دی ہے۔ لیک کی مختصر اپرنوں کی نسبتاً مفصل تر۔ اس کے لیے خاصی کھیکو کرنی پڑی ہوگی۔

ص ۱۲ عرضی دعوے کے مطابق ۱۸۰۶ء میں غالب کی دادی کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔ اس سے رضا صاحب نے حساب لگایا کہ دادی کی ولادت ۱۷۳۶ء کی ہوگی۔ میرے خیال میں اس زمانہ میں ماہ و سال کا حساب زیادہ تر ہجری سنہ سے کیا جاتا تھا۔ ۱۸۰۶ء کا بڑا حصہ ۱۲۲۱ھ کے برابر ہے۔ اس میں سے ۷۰ برس منہا کر کے سنہ ولادت ۱۱۵۱ھ برآمد ہوتا ہے اور اس کا بیشتر حصہ ۱۷۳۸ء کے مطابق ہے۔ یہی غالب کی دادی کا سنہ ولادت ہونا چاہیے۔

ص ۱۴ پنج آہنگ کے ایک خط میں اور دوسری کئی جگہوں پر غالب نے اپنے خاندان کے سلسلے میں کہا ہے کہ وہ سلجوقی تھے اور ان کا نسب افراسیاب و پشنگ سے ملتا ہے۔ غلام رسول مہر نے اپنی کتاب 'غالب' میں لکھا ہے کہ محققین کے نزدیک تو یہ بھی ثابت شدہ بات نہیں کہ سلجوقی انھیں تورانیوں کی نسل سے تھے جن کی عظمت و برتری کا افسانہ شاہنامے نے سنایا ہے۔ (لاہور، تیسرا ایڈیشن ص ۷)۔ مالک رام نے اپنی کتاب "ذکر غالب" میں غلام رسول مہر کے اس اعتراض کو نقل کر دیا ہے لیکن اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ رضا صاحب کو غالب کے اس دعوے پر اپنی رائے درج کرنی چاہیے تھی۔

ص ۲۱ ساتویں اقتباس میں یوسف حسین خاں کی "غالب اور آہنگ غالب" کی سند پر بتایا ہے کہ غالب کا یہ کہنا درست نہیں کہ ان کے والد حیدر آباد میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ یوسف حسین خاں نے حیدر آباد میں اُس دَور کے کاغذات دیکھے۔ منصب داروں میں کہیں عبد اللہ بیگ کا نام نہ تھا جس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ بہت معمولی حیثیت کے ملازم رہے ہوں گے۔ مجھے یہ دلچسپ اطلاع پہلی بار رضا صاحب کی کتاب سے ملی۔

تیسرا مضمون 'غالب کی تاریخِ ولادت' ہے۔ جس میں رضا صاحب نے غالب کی بیان کردہ تاریخ کی تائید کی ہے۔ دو حضرات نے غالب کے زائچے سے مختلف سنین ولادت بر آمد کیے تھے۔ رضا صاحب نے درست اعتراض کیا کہ اگر دو نجومی ایک زائچے سے مختلف سنین نکالتے ہیں تو زائچہ غلط ہے یا زائچہ داں۔ حنیف احمد نقوی نے غالب پر دانستہ غلط بیانی کا جو الزام لگایا تھا اس کی رضا صاحب نے شافی تردید کی (ص ۳۸)۔ لیکن انھوں نے یہ نشاں دہی نہیں کی کہ حنیف نقوی نے یہ بات کس مضمون میں کہی تھی اور وہ کہاں شائع ہوا۔ سوء اتفاق سے 'درونِ خانہ' کے آخر میں کتابیات بھی نہیں۔ بہر حال تاریخ ولادت کی جملہ بحث مصنف کی بالغ نظری کا ثبوت دیتی ہے۔

ص ۴۷ پانچواں مضمون 'غالب کا مذہب' ہے۔ غالب نے شاہ ظفر کی شیعیت سے برأت کے سلسلے میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ اس سے لوگوں کو خود غالب کے مذہب کے بارے میں غلط فہمی ہوگئی۔ غالب

نے ایک فارسی خط میں مجتہد العصر مولوی سیّد محمد لکھنوی کو لکھا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں بساطِ شعر کو اُلٹ دوں اور غزل کے پیرائے میں نواسنجی کروں (یعنی غزل کی ایمائیت میں اپنے مذہب کی وضاحت کروں۔) پاکستان سے پنج آہنگ کا اردو ترجمہ چھپا ہے۔ مترجم جناب مہاجر نے قیاس کیا ہے کہ وہ غزل ہے "مشغولِ حق ہوں بندگی بوتراب میں" ہے۔ رضا صاحب، غالب کی ہر تحریر کا زمانہ جانتے ہیں۔ انھوں نے گرفت کی کہ شیعیت والی مثنوی ۵۴-۱۸۵۳ء کی ہے جبکہ 'بوتراب میں' والی غزل ۱۸۴۷ء کے دیوان میں موجود ہے۔ اس لیے یہ غزل اس مثنوی کا نتیجہ نہیں۔ رضا صاحب نے صحیح انکشاف کیا کہ غالب کی مشارٌ الیہ غزل دراصل سلام ہے جو حسبِ معمول غزل کی ہیئت میں لکھا گیا "سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو' رضا صاحب کے مطابق یہ سلام ۱۸۵۴ء کا ہے اور اس میں غالب نے اپنا عقیدہ کھل کر بیان کیا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں مضامین غالب اور ان کی بیوی امراؤ بیگم کے معاملات سے متعلق ہیں۔ ان کے تعلقات پر غالب کی نثر و نظم میں جو کچھ مواد ملتا ہے وہ سب ان مضامین میں جمع کر دیا ہے۔ بعضوں کا جو یہ خیال ہے کہ غالب اور ان کی بیگم میں ہمیشہ اَن بَن رہی اس کی رضا صاحب نے مدلّل تردید کی ہے۔ دوسرے مضمون کے آخر میں ایک پاکستانی کتاب سے جمیل الدین عالی کی طویل تحریر نقل کی ہے جس میں والیٔ لوہارو کے نام غالب کے متعدد خطوط کا تذکرہ ہے۔ ہندوستان کے قارئین کو اس مفید تحریر سے واقف کرانے کا سہرا رضا صاحب کے سر ہے۔

نواں مضمون "غالب کے سفر کلکتہ کی توقیت" ہے۔ ہے تو یہ محض ساڑھے چار صفحات کا لیکن اتنے سے مطالب لکھنے کے لیے انھیں کس قدر مآخذ دیکھنے پڑے ہوں گے وہ مضمون کے اندراجات کو مفصل دیکھنے ہی سے اندازہ ہوگا۔ حالی نے 'یادگارِ غالب' میں اس موضوع پر بہت گھپلا کیا تھا۔ رضا صاحب وضاحت سے سفر کی ایک ایک منزل پر صحیح تاریخ طے کر دی ہے۔ مضمون کے ابتدائی حصے میں جو تاریخی معلومات ہیں ان کے لیے تاریخ کی کئی انگریزی کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی ہوگی۔

دسواں مضمون "عارف اور فرزندیٔ غالب" میرے نزدیک اس مجموعے کا شاہکار ہے۔ اب تک عام عقیدہ تھا کہ غالب نے عارف کو متبنّیٰ کر لیا تھا اور وہ غالب کے پاس رہتے تھے۔ رضا صاحب نے اس غلط فہمی کا پردہ چاک کیا اور مستند مآخذ سے اس موضوع کے جملہ مالہ وماعلیہ پیش کیے۔ یہ چوٹی کا ایک ماہر غالبیات ہی کر سکتا تھا۔ غالب کے اس مصرع 'مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی' کا داخلی مفہوم سمجھ میں نہ آتا تھا۔ رضا صاحب نے کہیں سے کلیاتِ عارف تلاش کی اور پھر اس میں سے ۱۷ شعر کا ایک قطعہ دریافت کیا جو غالب کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے (دروں خانہ ص ۱۰۰)۔ اس قطعے سے اس مصرعے کا پس منظر کھل کر سامنے آتا ہے۔

گیارہواں مضمون "غالب کا ملازم خاص کلّو داروغہ" بھی اسی طرح تحقیق کا بہارستان ہے۔ مجھ سے کلّو کے بارے میں پوچھا جاتا تو صرف اتنا کہہ سکتا کہ غالب نے دو تین خطوط میں اس کا نام لیا ہے، لیکن رضا صاحب نے تو کلّو کے تقریبی سن ولادت ۱۸۳۰ء اور سن وفات ۱۹۲۳ء کا بھی اندازہ کر لیا۔ غالب کے انتقال کے بعد اس کی ملازمتوں تک کی تفصیل معلوم کر لی۔

بارھواں مضمون غالبؔ کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے بارے میں ہے۔ اس غیر معروف شخصیت کے بارے میں جگہ جگہ سے اتنی معلومات فراہم کی ہیں کہ مجھے خیال آتا ہے کہ ایم فل کے مقالے میں بھی کوئی اتنی محنت نہیں کرتا۔ اگر مضمون کو تھوڑا سا مفصل کر لیا جائے تو پی ایچ ڈی کا مقالہ ہو جائے گا۔ اس مضمون میں ادبی مواد جتنا ہے، اسی قدر تاریخی مواد ہے جس کے لیے۔ کثرت تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ یہی کیفیت الٰہی بخش خاں معروفؔ کے مضمون کی ہے۔ عباس بیگ عام اردو قارئین کے لیے غیر معروف شخصیت ہیں لیکن معروفؔ اسم بامسمّٰی ہیں۔ اس میں رضاؔ صاحب نے آبِ حیات سے معروفؔ کے حالات کو تفصیل سے مقتبس کیا ہے۔ لکھتے ہیں "ہو سکتا ہے اس میں کچھ اشا پردازی اور رنگ آمیزی آزادؔ کی طرف سے ہو لیکن بیشتر بیانات کی اساس پختہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ سب انھوں نے استاد ذوقؔ سے بالتفصیل سُنے تھے"۔ (ص ۱۶۳)

لیکن یہ مسلّم ہے کہ آزادؔ نے آبِ حیات میں کئی واقعات صریحاً وضع کر کے لکھے ہیں۔ کسی معاملے میں صرف آزاد کا بیان شافی شہادت نہیں۔ رضا صاحب نے عابدؔ پشاوری کی کتاب "ذوق اور محمد حسین آزاد" (۱۹۸۷ء) کا حوالہ دیا ہے اور ولیم فریزر سے متعلق عابد کے ایک بیان کی مناسب تردید کی ہے (ص ۸۸-۱۸۵) عابدؔ نے ذوقؔ اور معروفؔ کے تعلق سے اور جو کچھ لکھا ہے رضا صاحب کو اس کا بھی جائزہ لینا چاہیے تھا۔ عابد نے لکھا ہے کہ آبِ حیات کی طبع اوّل میں معروفؔ کے بارے میں محض چند ہی سطریں تھیں۔ معروفؔ کے اہل خاندان کی طرف سے اعتراض ہوا کہ معروف، ذوقؔ کے شاگرد نہ تھے۔ (ذوقؔ اور محمد حسین آزاد۔ ص ۲۰) اس پر آزاد نے آبِ حیات کی طبع دوم میں معروف سے متعلق بیانات کا انبار لگا دیا۔ معلوم نہیں انھوں نے لاہور میں بیٹھے بیٹھے یہ سب دریافت کیے یا ان میں سے کچھ ان کے زرخیز تخیل کی پیداوار تھے۔

معروفؔ نے تسبیح زمرد کے نام سے سو مطلعے کہے جن سے ہر ایک میں سری کے ذکر کا التزام تھا۔ آزادؔ نے اس سب کو ذوقؔ کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔ عابدؔ اس کی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی تسبیح میں سو دانے ہوتے ہیں، ایک سو ایک نہیں۔ یہ سب مطلعے عمدۂ منتخبہ میں موجود ہیں اور ان کی تعداد سو ہے۔ یہ سب مطلعے معروف کے دیوان اوّل میں ہیں۔ عابد کا کہنا ہے کہ مجموعہ نغز (۱۲۲۱ھ) میں معروف کے دیوان کی تدوین کا ذکر ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دیوان اس سنہ تک ترتیب پا چکا تھا۔ ذوقؔ اس وقت تک ۱۸-۱۷ سال کے ہوں گے۔ ذوقؔ کی اس کمسنی میں یہ ممکن نہیں کہ معروفؔ ذوقؔ کے شاگرد ہو چکے ہوں گے۔

ذوقؔ نے تسبیح زمرد کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ کہا جس سے ۱۲۳۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ عابدؔ کا استدلال ہے کہ چونکہ اس تسبیح کے اشعار ۱۲۲۱ھ سے پہلے ہی وجود میں آ چکے تھے، اس لیے یہ قطعہ تاریخ ذوقؔ کا نہیں، آزاد کا مصنوعہ ہے۔ لیکن اتفاق سے یہ قطعہ سرور کے عمدۂ منتخبہ میں موجود ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ذوقؔ ہی کی تصنیف ہے۔ عمدۂ منتخبہ میں معروفؔ کے دونوں دیوانوں کا ذکر ہے۔ کاش رضا صاحب عابدؔ کے اس موقف پر بھی بحث کرتے کہ تسبیحِ زمرد میں ذوقؔ کا کوئی سہرہ ہے کہ نہیں اور یہ کہ معروفؔ کے دیوانِ اوّل اور دیوانِ دوّم کی کیا تاریخیں ہیں؟ رضا صاحب ص ۱۸۰ پر یہ سوال تو اٹھاتے ہیں کہ کیا دیوانِ اول میں ۱۲۳۶ھ

تک کا کلام ہے؟ اگر ایسا ہے تو دیوانِ دوم میں کس عہد کا کلام ہے؟ رضا صاحب معروف پر قدرت کے ساتھ بیان کر سکتے تھے۔

انھوں نے معروفؔ اور رنگینؔ کے حسن معاملات کا ذکر کیا ہے اور رنگینؔ کی ہجو معروفؔ والی جو رباعیاں دی ہیں وہ کم از کم میرے لیے بالکل نئی ہیں۔ رضا صاحب نے دیوانِ معروفؔ کے ایک نہایت قدیم مخطوطے کا بھی تعارف کرایا ہے جس کے ترقیمے میں اسے معروف علی معروفؔ کا دیوان قرار دیا ہے۔ کوئی بھی دیکھتا تو یہ فیصلہ کرتا کہ یہ معروف علی معروفؔ الٰہی بخش خاں معروفؔ سے الگ کوئی شخصیت ہوگی لیکن رضا صاحب نے معروفؔ کے دیوانِ مطبوعہ سے کئی مطلعے نقل کر دیے جن میں سے تین میں شاعر نے خود کو الٰہی بخش اور دو میں معروف علی کہا ہے (درونِ خانہ ص ۱۸۲)۔ یہ ہے محققانہ تاویل۔

آگے کے دو مضامین نواب احمد بخش خاں اور مرزا افضل بیگ (غالب کے سہوئی کے چھوٹے بھائی) کے بارے میں ہیں اور یہ بھی جزئیاتی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ دونوں میں رضا صاحب کی تاریخی علمیت ایک بار پھر نمودار ہوتی ہے۔ آخری دو مضامین ''آبِ حیات میں ترجمۂ غالبؔ (مع حواشی)'' اور ''توقیت غالب'' ہیں۔ میں ان دونوں پر کہیں اور لکھ چکا ہوں۔ آبِ حیات والا مضمون کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ ''توقیت غالب'' میں مختلف جزئیاتی واقعات کی تاریخیں طے کرنے میں متعدد مآخذ کو دیکھنا پڑا ہوگا۔ اس فہرست میں بعض ایسے اندراج آگئے ہیں جو براہِ راست 'توقیت غالبؔ' کا جزو نہیں۔ مثلاً مہاراجہ رنجیت سنگھ، ممنونؔ، آتشؔ، ناسخؔ، شاہ نصیرؔ، مومنؔ، شیفتہؔ، آغا جان عیشؔ وغیرہ کے سنہ وفات یا سر جان لارنس کا گورنر جنرل مقرر ہونا۔ شاید معاصرینِ غالب کے سنہ وفات اس لیے دے دیے ہوں کہ ان سے عہد غالبؔ کو سمجھنے میں مدد ملے۔ بہرحال قاری کو اس مالِ مفت سے فائدہ ہی ہوگا۔

اشاریے میں اندراجات کی زمرہ بندی حروف تہجی کے لحاظ سے کی گئی ہے لیکن یہ کمی رہ گئی ہے کہ ایک حرف کے تحت مختلف ناموں کی الفبائی ترتیب نہیں۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے اشاریے میں بھی بالکل یہی صورت حال تھی اور اس پر اعتراض بھی کیا گیا تھا جو نام ایک صفحے پر ایک سے زائد بار آئے ہیں، اشاریے میں ان کے صفحہ نمبر کو خط کشیدہ کر دیا ہے۔ اس زحمت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

غالبیات میں رضا صاحب کی یہ گیارہویں کتاب ہے۔ ساتویں کتاب ''آبِ حیات میں ترجمۂ غالب'' موجودہ کتاب میں ضم ہے۔ اس لیے ہم ''درونِ خانہ'' کو دسویں کتاب کہہ سکتے ہیں۔ حسب معمول اس کتاب میں رضا صاحب غالبیات کے ایسے محقق کے طور پر سامنے آتے ہیں جو سوانح و کلام غالب اور عہد غالب کی تمام جزئیات پر ماہرانہ نظر رکھتا ہے۔ ہم منتظر ہیں کہ وہ غالبؔ کی ایسی بھرپور مستند سوانح عمری لکھ دیں جس میں غالبؔ کی اب تک کی تمام سوانح عمریوں سے کہیں زیادہ مفصل اور معتبر مواد موجود ہو۔

☆☆☆

'دیوانِ غالب اُردو' کی جمع و ترتیب اور کالی داس گپتا رضاؔ

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

سال ۱۹۶۹ء کو غالب کی صد سالہ برسی کے طور پر منایا گیا۔ ۱۹۷۰ء سے مطالعہ غالب کی گویا دوسری صدی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دوسری صدی میں غالبیات کو اپنی توجہ و تلطف اور مطالعے و تحقیق کا مرکز بنا لینے والے جو چند "دیوانے" اُبھرے اُن میں کالی داس گپتا رضا کا نام بہت اہم اور نمایاں ہے۔ غالب کے بارے میں ان کی کوئی اٹھارہ کتابیں تو اب تک چھپ چکیں۔ ان کے متعدد کام تحقیق و ترتیب کے مرحلے میں ہیں، یہ سب ۱۹۶۹ء کے بعد کا حاصل ہیں۔

کالی داس گپتا رضا کے تحقیقی کاموں میں غالب کے اردو دیوان کی تحفیظ و ترتیب سے متعلق ان کا کام بالخصوص بہت سر کشیدہ ہے۔ غالب کے اردو دیوان کی حفاظت اور اشاعت کی ذیل میں پچھلے دس دس بارہ برس میں ان کی یہ قابل قدر چیزیں سامنے آئیں

۱	دیوان غالب، طبع اول ۱۸۴۱ء عکسی ص ۱۰۹+۱۶	بمبئی ۱۹۸۶ء
۲	دیوان غالب، چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۲ء ص ۱۰۴+۲۰	بمبئی ۱۹۸۷ء
۳	دیوان غالب کامل، تاریخی ترتیب سے ص ۴۰۰	بمبئی ۱۹۸۸ء
۴	دیوان غالب کامل، تاریخی ترتیب کے ساتھ ص ۴۰۰+۲۰+۴۲	کراچی ۱۹۹۰ء
۵	دیوان غالب کامل، تاریخی ترتیب کے ساتھ ص ۴۰۰+۲۰+۴۲	کراچی ۱۹۹۴ء
۶	دیوانِ غالب کامل، نسخہ رضا، ص ۵۶۳	بمبئی ۱۹۹۵ء
۷	دیوان غالب کامل، تاریخی ترتیب کے ساتھ ص ۴۳۱	کراچی ۹۷-۱۹۹۶ء

دیوانِ غالب کو متعارف کرانے اور ترتیب دینے کے حوالے سے رضا صاحب کا پہلا کتابی اہم کام، غالب کی زندگی میں پہلی بار چھپنے والے اُن کے اردو دیوان (مطبوعہ اکتوبر ۱۸۴۱ء) کا عکسی ایڈیشن ہے جو معلومات آفریں پیش لفظ کے ساتھ ونل پبلی کیشنز ممبئی سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ دیوان کی پہلی طباعت اکتوبر ۱۸۴۱ء بہت کم یاب ہے۔ اسے پردۂ خفا سے منظر عام پر لے آنا گویا نایاب کو دستیاب بنا دینا ہے۔ یہ اُن کی غالب دوستی اور کشادہ دلی پر مظہر ہے۔ اس کی اشاعت اُن کی جانب سے محققین اور متخصصین غالب کے لیے ایک نادر اور قیمتی تحفے کی حیثیت رکھتی ہے۔ "پیش لفظ" میں انھوں نے بہت سی غلط فہمیوں کی تصحیح کی ہے اور جرأت اور اعتماد کے ساتھ حقائق کا اندراج اور اعلان کیا ہے۔

غالب کے اردو دیوان کا چوتھا ایڈیشن، اُن کی زندگی میں ۱۸۶۲ء میں کانپور سے چھپا۔ رضا صاحب نے اس کا عکسی ایڈیشن ونل پبلی کیشنز بمبئی سے ۱۹۸۷ء میں شائع کرایا۔ اس عکسی ایڈیشن کا "دیباچہ" بھی کالی داس گپتا

رضا کی تحقیقی نظر اور حرکا مظہر ہے۔ اس کوشش سے ۱۸۶۲ء کا مطبوعہ ایڈیشن غالب کے ہر پڑھنے والے کو میسّر آگیا جس کے لیے غالب دوست، رضا صاحب کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔

غالب کے اردو دیواں سے کالی داس گپتا رضا کے گہرے شغف کا حاصل "دیواں غالب کامل" ہے جسے انھوں نے "تاریخی ترتیب" سے مرتب کیا ہے۔ یہ اہم اشاعت ساکار پبلیشر بمبئی کی جانب سے فروری ۱۹۸۰ء میں سامنے آئی۔ اس کا مقدمہ لگ بھگ نوے صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمے کی پہلی بحث (ص ۱۱۔۲۰) غالب کے اردو دیواں کو زمانی ترتیب کے ساتھ مرتب کرنے کے لیے حرف جواز پیش کرتی ہے۔ رضا صاحب نے غالب کے سارے اردو کلام کو تاریخ وار ترتیب دینے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اس میں انھیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

کالی داس گپتا رضا کی کاوش سے پہلے، غالب کے کلام کو زمانی اور تاریخی ترتیب سے پیش کرنے کی متعدد اچھی کوششیں ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام اور کام اس حوالے سے بڑا ممتاز اور نمایاں ہے۔ کالی داس گپتا رضا نے ان بزرگوں کے کام کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور ان سے استفادے کا مناسب اور موزوں طور پر اعتراف کیا ہے۔

کالی داس گپتا رضا کے 'مقدمے' کے دوسرے ذیلی عنوان 'تعارف' (ص ۲۱-۲۵) کے تحت غالب کی زندگی میں چھپنے والی ان کے اردو دیواں کی مختلف اشاعتوں سمیت، ان انیس بنیادی ماخذ کا تعارف کرایا گیا ہے جن کی بنیاد پر انھوں نے "دیواں غالب کامل" کو مرتب کیا۔ متن کی زمانی ترتیب کے اس کام میں ثانوی ماخذ نظر انداز کر دیے گئے ہیں، یہی مناسب بھی تھا۔

رضا صاحب کا کہنا یہ ہے کہ انیس ماخذ میں سے آٹھ اُن کے براہِ راست دیکھے ہوئے نہیں۔ اس کیلیے انھوں نے کلی طور پر 'دیواں غالب اردو نسخۂ عرشی' (اشاعت دوم ۱۹۸۲ء) سے استفادہ اور اس پر بھروسہ کیا ہے۔ باقی تمام مآخذ ان کے ارشاد کے مطابق ان کے اپنے کتب خانے (بمبئی) کے غالب کلکشن میں موجود اور محفوظ ہیں۔

جن گیارہ ماخذ کو کالی داس گپتا رضا نے بنیادی ماخذ قرار دیا ہے اور جنھیں انھوں نے اپنے غالب کلکشن کی زینت بتایا ہے، ان میں سے میرا احساس یہ ہے کہ "قادر نامہ" کی اشاعتوں کو غالباً بنیادی ماخذ میں شمار نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ "قادر نامہ" کی جن اشاعتوں کا انھوں نے حوالہ دیا (بر صفحہ ۲۳) وہ سب کی سب غالب کے انتقال کے بعد مطبوعہ ہیں جبکہ "قادر نامہ" کا کم از کم تین بار غالب کی زندگی میں چھپنا طے شدہ ہے اور ان میں سے کوئی ایک ایڈیشن بھی رضا صاحب کے بے مثال کلکشن میں نہیں ہے۔

کالی داس گپتا رضا نے بنیادی ماخذ "گل رعنا" قلمی اور مطبوعہ کا شمار بھی کیا ہے (بر صفحہ ۲۳)۔ "گل رعنا" کا کوئی متن غالب کی زندگی میں نہیں چھپا۔ "گل رعنا" بخط غالب (قلمی نسخہ) لاہور میں ہے۔ اس کی

عکسی اشاعت تا ایں دم منظر عام پر نہیں آئی۔ نسخۂ غالب پر مبنی "گل رعنا" کا مصدقہ ایڈیشن بھی ابھی نہیں چھپا۔

"گل رعنا" کے الگ الگ تین مختلف مطالعات اور متن کتابی صورت میں دہلی، لاہور اور کراچی سے ۱۹۶۹ء کے پس و پیش چھپے۔ رضا صاحب کے ماخذ میں "گل رعنا" قلمی اور مطبوعہ کے اندراج سے مراد کون سا قلمی نسخہ یا مطبوعہ ایڈیشن ہے، اس کی کوئی وضاحت یا صراحت نہیں ملتی۔ "گل رعنا" (پیش کردہ ور یر الحسن عابدی، لاہور ۷۰ - ۱۹۶۹ء) کو اس اعادہ کے ساتھ شائع کیا گیا تھا کہ وہ گویا "گل رعنا" قلمی نسخہ غالب پر مبنی ہے۔ یہ بات درست نہیں۔

رضا صاحب نے دیواں کو ترتیب دینے میں بڑی محنت اور دقت نظری سے کام لیا ہے اور گیارہ ادوار میں غالب کے کل دستیاب اور یافت شدہ اردو کلام کو زمانی اور تاریخی ترتیب سے درج اور مرتب کیا ہے۔ یعنی خود ان کے بقول "سب سے پہلے وہ اشاریے دیے گئے ہیں جو سب سے پہلے تخلیق ہوئے، اس کے بعد تخلیقات مابعد"، (ص ۲۴-۲۵)۔ اس روش سے کلام غالب کی ترتیب، غالب کے ذہنی اور فنی ارتقاء میں بڑی مدد دیتی ہے۔ یہ علمی کام غالبیات میں رضا صاحب کے لیے حیاتِ جاوداں کا ضامن اور نقیب ہے۔

"تاریخی ترتیب کے ساتھ "کالی داس گپتا رضا کے مرتبہ "دیوانِ غالب کامل" کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء اور تیسرا ۱۹۹۴ء اور چوتھا ۹۷ - ۱۹۹۶ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سے جمیل الدین عالی کے "حرفے چند" کے ساتھ شائع ہوا۔ ان اشاعتوں کے مقدمے اور متن میں کوئی بڑی ترمیم یا تبدیلی نہیں ہوئی۔ دیوانِ غالب کی ان اشاعتوں میں ایک فہرست کا اضافہ ہوا ہے جس پر سہوِ کتابت سے "فہرست غزلیات" درج ہو گیا ہے۔ اسے "فہرستِ مشمولات" ہونا چاہیے تھا۔

پروفیسر نظیر صدیقی کا یہ احساس اور اعتراف بجا ہے کہ "کالی داس گپتا رضا کا مرتبہ دیوانِ غالب ایک یادگار کارنامہ ہے جس کو ایک بالغ نظر قاری یا اہل قلم مشکل ہی سے نظر انداز کر سکتا ہے"۔ (قومی زبان، کراچی نومبر ۱۹۹۶ء ص ۴۷)۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ "تاریخی ترتیب" سے مرتب کیے ہوئے اس 'دیوانِ غالب' کا جاپانی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ یہ ترجمہ دائی کو سکا یونیورسٹی، ٹوکیو کے پروفیسر ہیروجی کتاؤکا نے کیا ہے۔ اس ترجمے (۱۹۹۷ء) کا ایک نسخہ میرے ذخیرۂ غالبیات میں موجود ہے۔

"دیوانِ غالب کامل" کا ایک ایڈیشن "نسخۂ گپتا رضا" کے ذیلی اور اضافی نام کے ساتھ ساکار پبلیشرز بمبئی نے فروری ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔ یہ اشاعت ۵۶۳ صفحات پر مبنی ہے، جبکہ پچھلی طباعتوں کی ضخامت ۴۰۰ صفحات کے لگ بھگ تھی۔ ترمیم و اضافہ مقدمے میں بھی ہوا ہے اور ترمیم و اضافے کا عمل متن کی ترتیب میں بھی نمایاں ہے۔ دیوان کے آخر میں رضا صاحب نے کچھ فہرستوں کا اضافہ کیا ہے (۴۹۷-۵۲۸) جن کی مدد سے بلحاظ سالِ فکر (تخلیق) اور باعتبار حروفِ تہجی، غالب کے اشعار کو دیکھنے اور پانے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ "اشاریہ (ص ۵۲۹ - ۵۶۳) بھی پہلی اشاعتوں کے مقابلے میں اضافہ شدہ ہے۔ تازہ اشاعت میں غالب کی چہار رنگی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

یہ تازہ ایڈیشن (مطبوعہ مئی ۱۹۹۵ء) پہلی اشاعتوں کے مقابلے میں بہت نمایاں رد و بدل کے ساتھ مرتب ہوا ہے۔ پچھلی اشاعتوں سے مختلف اور بہتر ہو گیا ہے، اس لیے اسے ایک طرح سے جداگانہ ایڈیشن خیال کرنا چاہیے۔ خود رضا صاحب کی نشاندہی کے مطابق تازہ ایڈیشن اور اشاعت میں اصلاحوں کی نوعیت یہ ہے

۱ اشعار کی ترتیب میں فرق رہ گیا تھا۔ اسے مختلف ماخذوں کی مدد سے روایت کے مطابق کر دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب ہر شعر، اپنی صحیح جگہ پر درج ہے۔

۲ بعض اشعار کو غالب کے فکر کردہ تسلیم کرنے میں تامل ہوتا تھا۔ انھیں متن سے خارج کر دیا گیا ہے مگر مقدمے میں الگ باب کے تحت شامل رکھا گیا ہے تاکہ وہ کلام غالب کی ٹوہ میں رہنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہیں۔

۳ مزید غور و فکر کرنے کے بعد غزلوں اور اشعار کا سالِ فکر دوبارہ متعین کیا گیا ہے۔

۴ نسخۂ بھوپال خط غالب (۱۸۱۶ء) یا کسی بھی اساسی نسخے کے سالِ کتابت سے جن غزلوں اور اشعار کا سالِ فکر متعین کیا گیا تھا، اُن میں بعد کے کہے ہوئے اشعار بھی شامل ہیں، مگر یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ اشعار پہلے پہل کب کہے گئے، یا کس ماخذ میں پہلی بار درج ہوئے تھے۔ اب نشاندہی کر دی گئی ہے۔

۵ نسخۂ عرشی میں درج مفصل اختلافِ نسخ کے پیشِ نظر میں نے اپنے نسخے (دیوانِ غالب کامل، نسخۂ رضا) میں اختلافِ نسخ ظاہر کرنے سے گریز کیا تھا، مگر عرشی صاحب کے ماخذوں میں نسخۂ بھوپال خط غالب، دیر سے شامل ہوا تھا، شاید اسی لیے یہ "اختلافِ نسخ" میں نہیں لیا جا سکا تھا۔ یہ کمی بری طرح کھٹ رہی تھی۔ چنانچہ اب میں نے کلامِ غالب کے آج (۲۵ ر اگست ۱۹۹۴ء) تک دریافت شدہ، اُس قدیم ترین نسخے کا مکمل اختلافِ نسخ اضافہ کر دیا ہے

ان تبدیلیوں اور ترمیمات کے بعد اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "دیوانِ غالب کامل" پہلی طباعتوں کے مقابلے میں کتنا بہتر، جامع اور مفید و مختلف ہو گیا ہے۔ اس خدمت اور کارنامے کے لیے غالب دوست ہمیشہ کالی داس گپتا رضا کا احسان مندی کے ساتھ اعتراف کریں اور کرتے رہیں گے۔

"دیوانِ غالب کامل" کی پہلی اشاعت کو مالک رام نے "ہر اعتبار سے ایک تاریخ ساز کام" اور ڈاکٹر گیان چند نے اسے "بے نظیر تحقیقی کارنامہ" بتایا اور ٹھہرایا تھا۔ تازہ اشاعت (نسخۂ گپتا رضا) واقعی ایک کارِ لازوال و بے مثال کے مرتبے کو پہنچ گئی ہے۔

اس ترقی یافتہ متن کے مطابق "دیوانِ غالب کامل" کی اشاعت پاکستان میں ہونا ابھی باقی ہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کو اس جانب توجہ دینی چاہیے۔ تیسرے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۹۶ء) کے "حرفے چند" میں انجمن کے معتمد اعزازی جمیل الدین عالی نے لکھا ہے کہ "ہم جلد اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن شائع کریں گے"۔ یہ چوتھی اشاعت کتاب کے جدید ترین ترمیم شدہ متن (مطبوعہ مئی فروری ۱۹۹۵ء) کے مطابق ہو۔

☆☆☆

دیوانِ غالبؔ کامل (تاریخی ترتیب سے)

شین کاف نظام

مرزا غالبؔ ہمارے لیے متھک سے بن گئے ہیں۔ متھک کے متعلق تحقیق یا تفتیش اس معاشرہ میں مستحسن تصور نہیں کی جاتی جو معاشرہ متھک مزاج واقع ہوا ہو کیونکہ اس سے ایقان کے بطلان کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہمارا معاشرہ بھی متھ مزاج ہے اس کے باوجود ہمارے یہاں محقق پیدا ہوتے ہیں۔ نہ صرف پیدا ہوتے ہیں بلکہ عام و عوام کے عقائد اور تخیل کی طرز پر تعمیر و تشکیل تصویر پر خط تنسیخ بھی کھینچتے ہیں۔ غالبؔ اور کلام غالب کے ضمن میں ہماری تذکراتی تنقید اور مبالغہ آمیز داستان طرازی نے اگر کچھ مغالطے پیدا کیے تو وہ اس لیے غلط نہیں کہ یہ متھک بننے والی شخصیت کا مقدر ہوتا ہے۔ محققانِ غالبؔ یا ماہر غالبیات میں جناب کالی داس گپتا رضاؔ ممتاز و منفرد مقام کے مالک ہیں۔ رضاؔ صاحب کی شخصیت تحقیق، تخلیق اور تنقید کی تثلیث سے عبارت ہے۔ انھوں نے غالبیات میں ایک اہم اضافے کیے ہیں لیکن جس کام کے لیے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا وہ ہے "دیوان غالب کامل، تاریخی ترتیب سے"۔ کسی شاعر کے کلام کی تاریخی تدوین کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس طرح موصوف کی طبعی نشو ونما، فنی و فکری ارتقا اور خیالات میں دور بہ دور آنے والے تغیر و تبدل کا پتہ چلتا ہے جس سے اس کی شعری شخصیت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ کلام غالب کی تاریخی تدوین کے ضمن میں مفتی انوار الحق، ڈاکٹر سیّد عبد اللطیف، شیخ محمد اکرام وغیرہ کی کوششیں بھی تعریف و توصیف کی مستحق ہیں مگر اس کام میں خاطر خواہ کامیابی رضا صاحب ہی کو ملی۔

اس دیوان کی اشاعت سے قبل رضا صاحب ۱۹۸۶ء میں دیوانِ غالب کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۸۴۱ء) کی عکسی اشاعت اور ۱۹۸۷ء میں دیوان غالب کے چوتھے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۸۶۲ء) کی عکسی اشاعت اردو دنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ غالبؔ کے پہلے اور چوتھے ایڈیشن کی اہمیت کا سبب بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

"یہ (پہلا ایڈیشن) کم یاب ہے (ظاہر ہے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے کم شعر ہیں) نیز، یہ غالب کی مطبوعہ شاعری کے سفر میں پہلا قدم ہے اور چوتھا اس لیے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے زیادہ شعر ہیں اور اس کی بنیاد تیسرے ایڈیشن کا وہ نسخہ ہے جو خود غالبؔ نے اپنے قلم سے درست اور نظر ثانی کر کے اشاعت کے لیے دیا تھا"۔

زیر نظر دیوان، کو کلیاتِ نظم غالب (اردو) بھی کہا جا سکتا ہے جس میں نو (۹) ابواب میں منقسم مرتب کا مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے جو اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ ان میں سب سے اہم "توقیت غالب" ہے۔ مقدمہ کا یہ باب "شاعر" ہی کے شمارہ ۵۷ / ۲ میں شائع ہوا ہے۔ یہ توقیت (Chronology)

غالب کے عہد کا ایک ایسا مسطر نامہ ہے جس میں ایک اہم تاریخی واقعات کی بھی نشاندہی ہو گئی ہے۔

اس دیواں کی اشاعت سے جہاں بعض فرو گذاشت کی تصحیح اور چند غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا وہاں کلام غالب کے مطالعہ کے نئے گوشے بھی سامنے آئیں گے۔ مفروضوں اور مبالغوں کی بنا پر جو متھ ساری ہوئی ہے اس کی حقیقت بھی سامنے آئے گی۔ مثلاً آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے

"تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا یہ ایک دیواں انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا" (ص ۶۰۶)

مگر اس دیواں کی رو سے دیواں غالب کا پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا (ص ۲۵) اور اس میں ۱۰۹۶ ر اشعار تھے (ص ۲۱) آبِ حیات ہی کے ص ۶۲۱ پر لکھا ہے "ایک دفعہ مرزا بہت قرض دار ہوگئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی جواب دہی میں طلب ہوئے، مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں یہ شعر پڑھا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

(چوتھے ایڈیشن میں لاوے گی چھپا ہے)۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنی کتاب "غالب اور آہنگ غالب" میں "جامِ جہاں نما" کی جون ۱۸۳۷ء کی اشاعت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ میکرس نامی انگریز شراب فروش نے دعویٰ دائر کر ڈھائی سو روپے کی ڈگری حاصل کر لی (۸۷) اس کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے نیشنل آرکائیور آف انڈیا، نئی دہلی) اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۳۷ء کا ہے۔ دیوانِ غالب (کامل) کے مطابق یہ غزل ۱۸۲۱ء میں کہی گئی یعنی اس واقعہ سے ۱۶ ر برس پہلے۔ رضا صاحب لکھتے ہیں

"آزردہ ۱۵ ر جون کو صدر الصدور مقرر ہوئے تھے۔ اس سے پہلے (شاید ۱۸۲۷ء) سے صدر امیں تھے صدر امیں کو اب امیں کہتے ہیں۔ اس کی اپنی عدالت نہیں ہوتی لیکن شعر نسخہ بھوپال (حمیدیہ ۱۸۲۱ء) کے متن میں موجود ہے اس وقت غالب ۲۳ ر ۲۴ سال سے زیادہ کے نہ تھے۔ واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے شعر بھری عدالت میں فی البدیہہ پڑھا گیا ہو"۔ (ص ۱۳)

دو شعر دیکھئے

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(ص ۲۸۸، کامل)

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

آبِ حیات میں پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں 'حیف' کی بجائے 'ہائے' اور دوسرے شعر کا پہلا مصرع

یوں ہے 'ہم عمر دہ حس دں سے گرفتار بلا ہیں'' چھپا ہے۔ آزاد کے مطابق پہلا شعر مقطع۔ اسیری کا عطیہ ہے۔
رضا صاحب لکھتے ہیں

''اسیری کا حادثہ مئی ۱۸۴۷ء میں پیش آیا اور جیل سے رہائی غالبًا اگست ۱۸۴۷ء میں ہوئی (دیوانِ غالب کامل ص ۴۱) اور یہ شعر ۱۸۲۱ء یا اس سے پہلے کا کہا ہوا ہے''۔ (ص ۲۲۸)

زمانۂ فکر کے ضمن میں رضا صاحب لکھتے ہیں

'' کلام کے زمانۂ فکر کے تعین کے لیے یہ قاعدہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر کسی مآخذ کی غزل کا ایک شعر بھی کسی قدیم تر ماخذ میں پایا گیا تو اس پوری غزل کو قدیم تر مآخذ میں شامل سمجھا گیا ہے کیونکہ پوری غزل نہ کہی گئی ہو تو بھی اس کی اساس اسی عہد میں رکھی گئی تھی۔ عین ممکن ہے کہ اس غزل کے کچھ اشعار واقعی بعد کے کہے ہوئے ہوں مگر ایسے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں''۔ (ص ۲۴)

دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے، کی اہمیت کا اندازہ تو اس کے خاطر خواہ مطالعہ کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے مگر اس کی علمی و ادبی وقعت کا اندازہ ان آراء سے لگایا جا سکتا ہے

جناب مالک رام لکھتے ہیں ''دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے چھپا ہے جو ہر اعتبار سے ایک تاریخ ساز کام ہے''۔

پروفیسر گیان چند کے لفظوں میں ''اردو تدوین کی تاریخ میں آج تک کسی کے کلام کو اس طرح تاریخی ترتیب سے مرتب نہیں کیا گیا ایک قدیم شاعر کے کلام کے نامعلوم زمانوں کو معلوم کرنا بے نظیر تحقیقی کارنامہ ہے''۔

بقول جمیل جالبی ''یہ دیوانِ غالب نہایت مفید اور اچھا کام ہے اور یقیناً غالبیات میں ایک اضافہ ہے''۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس دیوان کی اشاعت سے کلام غالب کے مطالعہ کے لیے نئے گوشے سامنے آئیں گے۔ ان میں فنی و فکری اور اظہار و اسلوب کی مقدم حیثیت ہے۔ مثال میں یہ دو شعر پیش کیے جا سکتے ہیں

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ ''اے لئیم''
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے ؟

اور یہ مطلع (ص ۲۹۹)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

(ص ۳۱۲)

اس دیوانِ غالب کی رو سے پہلا شعر ۱۸۴۷ء اور ۱۸۴۸ء کے درمیان کہا ہوا ہے اور دوسرا ۱۸۵۲ء کا

ہے۔ "توقیت غالب" کے مطابق اس وقفہ میں غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ جیسے خطاب ملے۔ (۴ر جولائی ۱۸۵۰ء)، اپریل ۱۸۵۲ء میں زین العابدین خاں عارف کی وفات ہوئی اور ۱۴ر مئی ۱۸۵۲ء میں مومن کا انتقال ہوا۔ یہ تو خارجی حالات ہیں۔ فنی نکتہ نظر سے پہلے شعر میں "مقدور ہو تو" کہا گیا ہے جبکہ دوسرے شعر میں تحیر کے ساتھ ایک بیان ہے۔ پہلے شعر میں فاعل، خاک ہے جبکہ دوسرے شعر میں خاک فاعل نہیں رہا۔ فلسفیانہ نکتۂ نظر سے "ہو رہا ہے"، "خاک میں پنہاں ہو گئیں" وغیرہ وہ نکات ہیں جو غالب کے مزاج میں آئے تغیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس میں تحیر آمیز وجد Ecstasy کو مقدم مقام میسر ہے۔

شاندار کام کی جاندار پیشکش کی نظر اُتارنے کے لیے کتابت کی کچھ غلطیاں موجود ہیں۔ رضا صاحب نے اس کے لیے ایک صحت نامہ جاری کیا ہے اس لیے یقین کیا جانا چاہیے کہ آئندہ اشاعت میں یہ غلطیاں نہیں ہوں گی۔ دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے اور رضا صاحب کے متعلق مشفق خواجہ کی اس رائے "دیوانِ غالب کی طباعت سے اہل تحقیق کی بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی ہم سب اس (کالی داس گپتا رضا) پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے درمیاں ایک ایسا شخص موجود ہے جس نے وہ کام کیے جو اداروں کے کرنے تھے" پر لبیک کہنے کو جی کہتا ہے۔

☆☆☆

KALLON KI GALI, JODHPUR - 342 001 RAJASTHAN

کالی داس گپتا رضاؔ کے دو اہم خطوط

امتیاز الدین خاں

میں نے ۱۵؍ جولائی ۱۹۹۷ء کو ماہر غالبیات جناب کالی داس گپتا رضاؔ کو خط لکھا اور ان سے دریافت کیا کہ مرزا غالبؔ فری میسن (freemason) تھے یا نہیں۔ میں نے لکھا

" آپ ماہر غالبیات ہیں اور بحیثیت محقق آپ کا ادبی مرتبہ مسلّم ہے۔ ایک ضروری استفسار آپ سے کرنا ہے، کیا مرزا غالب freemason تھے ؟ وہ کہاں کے لاج کے ممبر تھے اور کب سے کب تک رہے ؟ کیا غالبؔ نے کسی شعر میں اپنے اس مسلک کا ذکر کیا ہے ؟

ماہنامہ "ذخیرہ مالگوسد" کے مارچ ۱۸۶۹ء کے شمارہ میں تعزیتی مضمون چھپا تھا کہ غالب مرحوم نے میسن کا یا مذہب اختیار کیا تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ غالبؔ کے انتقال کے بعد اُن کے بارے میں یہ سب سے پہلا مضمون ہے۔

غالبًا مرزا غالب کلکتہ کے Anchor and Hope نامی لاج کے ممبر تھے۔ ۱۷۷۳ء میں قائم ہوا تھا اور اس کا دو صد سالہ جشن ۱۹۷۳ء میں وہاں منایا گیا تھا۔ میرے چند احباب اس جلسہ میں شریک ہوئے تھے اور واپسی پر بتایا تھا کہ وہاں چرچا تھا کہ مرزا غالبؔ میسن تھے۔

Grand lodge of India سے بھی رجوع کیا گیا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ رازداری کا پردہ جو غالبؔ کے عہد میں تھا وہی آج بھی ہے"۔

جناب کالی داس گپتا رضاؔ نے اس کا جواب اپنے خط مورخہ ۲۶؍ جولائی ۱۹۹۷ء میں دیا۔ انھوں نے لکھا

"اگرچہ غالبؔ کی انگریزی تہذیب سے دلچسپی سے یہ بعید نہیں کہ وہ فری میسن بھی بن گئے یا بنالیے گئے ہوں مگر آج تک اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا"۔

دیوانِ غالبؔ کامل (نسخہ گپتا رضا) کی طرح غالب کی حیات کامل تصنیف کرنے کی تیاری میں ہوں۔ یہ کتاب شاید تین چار جلدوں میں ہو۔ اس لیے گزارش ہے کہ اگر کہیں سے بھی اس کی خبر لگے تو مجھے ضرور بتا دینے کی زحمت گوارا کریں تاکہ آپ کے حوالے سے اسے داخلِ کتاب کیا جاسکے۔ ویسے مجھے یقین نہیں کہ غالبؔ کو فری میسن میں admit کیا گیا ہو۔ یہ تنظیم خاصی سخت واقع ہوئی ہے"۔

میں نے ۴؍ اگست ۱۹۹۷ء کو رضا صاحب کو لکھا

"میں نے چند ماہ پہلے ایک مضمون "فری میسن غالبؔ" لکھا ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ اُس کی نقل آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ آپ ایسے بلند پایہ ماہر غالبیات ادبی دنیا میں معدودے چند ہیں۔ امید ہے کہ آپ

"ذخیرہ مالگوسد" کے اندراجات کی روشنی میں حالات کا جائزہ لیں گے۔

اس خط کے ساتھ میرا مضمون "فری میسن غالب" اور ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی کا مضمون "غالب کے انتقال پر پہلا مضمون" (مطبوعہ غالب نمبر شبستاں اُردو ڈائجسٹ نئی دہلی ۱۹۶۹ء) منسلک ہے"۔

جناب کالی داس گپتا رضا نے اپنے خط مورخہ یکم ستمبر ۱۹۹۷ء میں مجھے لکھا

"غالب کے فری میسن ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ میرے پیش نظر رہے گا کسی حتمی شہادت تک۔

"ذخیرۂ مالگوسد" والے مضمون میں دو باتیں قطعی غلط ہیں۔ ایک یہ کہ غالب اپنے تخلص غالب کے علاوہ نوشہ تخلص بھی استعمال کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے مذہب اسلام ترک کر مذہب فری میسن اختیار کیا تھا۔ فری میسن مذہب نہیں ہے اور فری میسن بننے کے لیے مذہب تبدیل نہیں کرنا پڑتا"۔

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی نے اپنے مضمون "غالب کے انتقال پر پہلا مضمون" میں لکھا تھا

"منشی مالگوسد ماتھر نے آگرہ سے ایک ماہوار رسالہ "ذخیرۂ مالگوسد" کے نام سے ۱۸۶۸ء کی ابتدا میں جاری کیا۔ منشی صاحب دہلی گزٹ پریس آگرہ کے دفتر میں کلرک تھے۔ خود ان کا بھی ایک مطبع تھا۔ آگرہ اردو اخبار پریس اور اس کے مہتمم، پرنٹر اور پبلیشر وہ خود ہی تھے۔ یہ مطبع آگرہ کے محلے پیپل منڈی میں واقع تھا۔ "ذخیرۂ مالگوسد" اس مطبع میں بہت بڑی تقطیع کے ۴۸ر صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کا چندہ سالانہ چھ روپئے اور محصول ڈاک بارہ آنے تھا۔ اس رسالے کے ۲۳ر پرچے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۸ء کا اور آخری دسمبر ۱۸۷۰ء کا ہے"۔

انھوں نے مزید لکھا

"اس رسالے ("ذخیرۂ مالگوسد") کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچہ میں مرزا غالب کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان ہے "مرزا اسد اللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب و نوشہ"۔ غالب کی وفات ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو واقع ہوئی۔ اس سانحہ کے صرف چند روز بعد یہ مضمون لکھا گیا اور غالباً مرزا غالب کے حالات میں یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالہ میں شائع ہوا"۔

"ذخیرۂ مالگوسد" میں تحریر کیا گیا تھا

"ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیور اسلام اُتار کر حلیہ فری میسن سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اُس کے احباب نے حال اس مذہب نو اختیار کا اور کیفیت فری میسن ہوس کی دھوکہ دے دے کر دریافت کی پر اُس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گا کہ کچھ نہ پوچھو (یہ کرامت اور وصف اس مذہب کا خاص مشہور ہے)"۔

احوالِ غالب مرتبہ مختار الدین احمد میں سید مسعود حسن رضوی کا یہ مختصر مضمون شامل ہے جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ غالب کے انتقال کے بعد یہ غالب پر پہلا مضموں ہے۔ سب سے پہلا مضمون اکمل الاخبار

دہلی میں شائع ہوا تھا۔ پھر اُس کے بعد "رتن پرکاش" (رتلام) ۵ر مارچ ۱۸۶۹ء میں مرزا غالبؔ کی وفات کی خبر چھپی تھی۔

"ذخیرۂ مالگوسد" میں مرزا غالب کی وفات کے فوراً بعد صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ وہ ایک عرصہ سے فری میسن تحریک سے وابستہ تھے اور اس تعلق کو بیاں نہیں کرتے تھے۔ یہ رازداری کی ادا تو آج بھی اس ملک کی قائم ہے۔ کوئی بات چھپانے کی نہیں ہے پھر بھی رازداری کی جاتی ہے۔ بند کمرے میں اجلاس ہوتے ہیں۔ باہر سے پہرہ دار تعینات ہوتے ہیں۔ راز افشا نہ کرنے کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ یہ کوئی خفیہ ایجنسی نہیں ہے۔ اس تحریک کا اصول دوستی اور محبت ہے اور عالمگیر اخوت ہے۔ پھر بھی چونکہ اس کی میٹنگ میں رازداری رکھی جاتی ہے اس لیے بہت سی سلطانی اور کمیونسٹ اور اسلامی ریاستوں میں اس انجمن کو ممنوع قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان میں تو انگریزی حکومت کے زمانہ میں اس انجمن پر کوئی پابندی نہ تھی اور جمہوری بھارت میں اس کی شاخیں شہر شہر قائم ہیں۔ یہ کوئی سیاسی تحریک نہیں اور نہ کوئی خفیہ تنظیم ہے۔

"ذخیرۂ مالگوسد" کے انکشافات کے بعد کسی نے کوئی تردید اس بات کی نہیں کی کہ غالبؔ فری میسن نہیں تھے۔ کوئی وجہ ہے کہ "ذخیرۂ مالگوسد" کے اس مضمون کو کیوں نہ صحیح تسلیم کیا جائے۔ مرزا غالبؔ وسیع المشرب تھے اور مغربی تہذیب کو اچھی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کا استقبال کیا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ مرزا غالب کس شہر کے لاج کے ممبر تھے۔ یہ لاج کے پرانے ریکارڈ سے معلوم ہو سکتا تھا مگر ایسا ریکارڈ رکھنے کا ان کے یہاں رواج نہیں ہے۔ اس لیے کوئی کاغذی ثبوت فراہم نہیں ہو سکتا۔

جی ایس گپتا ریٹائرڈ آئی اے ایس نے اپنی تصنیف Freemasonary in India میں لکھا ہے کہ کلکتہ کا Lodge Anchor and Hope ۱۷۷۳ء میں Grand Lodge of England نے قائم کیا تھا۔ اور اس کا دو صد سالہ جشن ۹ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو منایا گیا تھا۔

جی ایس گپتا صاحب نے لکھا ہے کہ ڈبلیو سی بونر جی اور رابندر ناتھ ٹیگور بھی میسن رہ چکے ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۸۸۶ء کے بعد سوامی وویکانند اور سر راش بہاری گھوش بھی فری میسن تھے۔ جی ایس گپتا صاحب نے اپنی کتاب میں مرزا غالبؔ کا ذکر اُن مشاہیر میں نہیں کیا جنھوں نے فری میسن تحریک میں شمولیت کی تھی۔ اس کے باوجود "ذخیرۂ مالگوسد" کے مضمون کی بناء پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب اس تحریک سے کسی نہ کسی طرح منسلک ضرور تھے۔ نواب لوہارو مرزا غالب کے عزیز تھے اور وہ اوّلیں فری میسن میں تھے۔ ممکن ہے کہ ان کے توسط سے مرزا غالب نے لاج کی ممبری حاصل کی ہو۔

☆☆☆

دُعائے صباح
سرسوتی سرن کیف

کتاب زیر تبصرہ ایک مختصر کتاب ہے۔ حالانکہ طباعت، کتابت اور عمدہ کاغذ کے استعمال کی وجہ سے و نیز اس وجہ سے کہ یہ عام استعمال کی کتاب نہیں بلکہ کتب خانوں کی زینت بننے کے لیے ہے جہاں اہل علم اور محقق حضرات اس کا فائدہ اٹھا سکیں، اس کی قیمت زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ رضا صاحب ان نادر شخصیتوں میں سے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف دولت ظاہری سے متمول کیا ہے بلکہ دولت باطنی یعنی فکر رسا اور استعداد تحقیق سے بھی مالا مال کیا ہے۔ انھیں قدیم فارسی ادب کے کمیاب نسخوں کی تحقیق کا خاصا ملکہ ہے اور وہ کئی شعراء کو قعر گمنامی سے نکال کر روئے ساحل لا چکے ہیں۔ دعائے صباح کا جو عربی زبان میں مذہب تشیع کی مشہور دعائے سحر کا مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے ذریعہ کیا ہوا منظوم فارسی ترجمہ ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ایک مبسوط محققانہ مقدمہ کے بعد دعا کا عربی متن پھر فارسی نثر میں اور پھر منظوم فارسی ترجمہ دیا گیا ہے۔ منظوم ترجمہ غالبؔ کا ہے لیکن منثور ترجمہ کس کا ہے یہ معلوم نہیں ہو سکا۔

رضا صاحب نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس ترجمہ کو غالب نے غالباً عہد جوانی میں نظم کیا ہوگا کیونکہ ان کے مطابق "یہ فارسی نظم غالبؔ کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ یہ مثنوی غالب کے انتقال کے تقریباً دو سال پہلے چھپ چکی تھی مگر اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ غالب نے عمداً اس کا نام نہیں لیا اور اسے اپنے فارسی کلام میں شائع نہیں کیا"۔ اس سلسلہ میں دو تین باتیں قابل غور ہیں۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کا میں قائل ہوں لیکن جہاں تک ان کی عظمت اور استواری کردار کا تعلق ہے کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ان کی علمی سطحیت کے متعلق قاضی عبد الودود نے چند مقالات تحریر کیے ہیں۔ انھیں دیکھنے کے بعد غالبؔ کو عروض و قافیہ و بیان و معنی کا ماہر سمجھنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ مطلقاً دھینگا مستی بھی کرتے تھے یعنی کبھی کبھی دوسروں میں وہی اغلاط دکھانے لگتے تھے جو خود اپنے اشعار میں روا رکھتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وفات سے چند سال قبل سے غالب اپنے ہر طرح کے کلام کو منظر عام پر لانے کے متمنی تھے۔ جن خطوط کی اشاعت سے انھوں نے پہلے انکار کر دیا تھا، انھیں بعد میں زور دے کر شائع کرایا۔ لہٰذا اگر یہ مثنوی عہد جوانی کی تصنیف ہے تو بھی کوئی وجہ نہیں کہ غالبؔ اس کی اشاعت سے محض اس لیے بے پروا ہوتے کہ یہ ان کی ابتدائی کاوشوں میں سے تھی۔ وہ اس کی اصلاح بھی کر سکتے تھے۔

میرے خیال میں یہ منظوم ترجمہ غالب نے شیعیت میں اپنے پختہ اعتقاد کے ثبوت کے طور پر اس وقت کیا ہے جب وہ ظلم کے قصیدہ میں اپنی مخالف شیعیت مثنوی پر (جو انھوں نے قلعہ معلیٰ کی ملازمت کے

دوراں بہادر شاہ کی ایماء پر کہی تھی) شیعہ فرقہ میں اٹھنے والے طوفان کے ریلے میں پھنسے تھے۔ غالب نے اپنی زندگی میں کئی بار علمی عناد اٹھائے لیکن صرف یہی موقع تھا جب انھوں نے اپنی بات کے جواز میں کچھ نہ کہا۔ کہتے بھی کیونکر شیعہ اور سنی دونوں مذہبی طور پر ان سے بدظن ہو چکے تھے اور پھر بہادر شاہ کا ڈر بھی تھا۔ اس لیے انھوں نے ذہنی خلفشار میں یہ منظوم ترجمہ کیا۔ (اغلب ہے کہ اپنے اعتقاد کے مطابق اپنی مصیبت دور کرنے کے لیے ہی کیا ہوگا) لیکن وہ آخر تک طے نہ کر سکے کہ اسے منظر عام پر لایا جائے یا نہیں۔ ساتھ ہی یہ خیال رہے کہ ذہنی انتشار کی حالت میں جو نظم کہی جائے اس میں اغلاط کا راہ پانا تعجب خیز بات نہیں ہے۔

بہر حال رضا صاحب کی کاوش نہایت مستحسن ہے اور انھوں نے اس مثنوی کو دیدہ زیب صورت میں شائع کر کے اہل تحقیق پر بڑا احسان کیا ہے۔

☆☆☆

بابِ تحقیق و تنقید

ہندوستانی، مشرقی افریقہ میں

تاج اورنگ آبادی

صاحب کتاب جناب گیتار رضا صاحب سے میں اب تک نہیں مل سکا۔ یوں بھی میں بمبئی میں اورنگ آباد سے ۱۹۶۰ء سے آگیا ہوں۔ اور رفتہ رفتہ یہاں کے علمی و ادبی ماحول سے نزدیک ہوتا رہا۔ اس سترہ سالہ عرصہ دور میں بے شمار اہل علم اور شاعروں، ادیبوں، مصنفوں وغیرہ سے ربط رہا۔ پھر بھی پوری طرح نہیں ہے۔

رضا صاحب کو میں نے دراصل ماہنامہ صبح امید بمبئی کے ذریعہ جانا ہے۔ ان کی شعری کاوشیں صحتمند ہیں اور تصنع و تکلف سے اکثر و بیشتر دور دور نظر آئیں۔ گاندھی میموریل کے کسی ایک جلسہ میں ان کا مقالہ بھی سنا۔ ان کا کچھ کچھ تعارف دوستوں اور ان کے متعارفین سے ہوتا رہا، لیکن مکمل نہیں۔ ان سے متاثر ہونے کی وجہ ان کی متعدد کتابیں ہیں جو صبح امید میں درج رہی ہیں۔

کتاب زیر تبصرہ جسے گیتار رضا صاحب نے قاضی مشیر کو عنایت فرمایا وہی مجھے ملی۔ مشیر میرا بڑا سعادت مند فرزند ہے۔ کتاب نثر میں ہے اس سے میں اور بھی متاثر ہوا کہ رضا صاحب نثر میں بھی موزوں دسترس رکھتے ہیں۔ ان کی اردو نثر میں وہ توانائی اور تاثر ہے کہ کتاب چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ ایک شاعر کے ناطے ان کی نثر میں بھی لطف سخن ہونا ضروری ہے۔ یہ خوبی ان کے حصہ میں بھرپور آئی ہے۔

یہاں تک پہنچ کر میں اصل کتاب کے تاثرات پر بحث کروں گا۔

کتاب جن مضامین اور مندرجات پر مشتمل ہے وہ اس طرح ہے ۱ دیباچہ۔ ۲ کتابیات۔ ۳ افریقہ۔ ۴ مشرقی افریقہ۔ ۵ ہندوستانی، مشرقی افریقہ میں۔

پہلے تعارف جناب مالک رام صاحب کا ہے جو کتاب اور صاحب کتاب دونوں سے متعارف کراتا ہے۔ اور اس سے کتاب کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ رضا صاحب نے افریقہ کی علمی اور عملی حیثیتوں سے خوب سیاحت فرمائی۔ افریقہ ایک ایسا براعظم ہے جس کا ایشیا کے بعد درجہ ہے۔ رضا صاحب ایشیا کے ہندوستانی ہونے کے ناطے انھوں نے ہندوستانیوں کا تعلق افریقہ سے جس انداز سے ہونا ظاہر کیا ہے وہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اور یہ کتاب تاریخی سلسلہ کی ایک کڑی بن گئی ہے اور کون کون ہندوستانی مشرقی افریقہ پر اثرانداز ہوئے، ان میں جے رام شیواجی، علی دیناو شرام، منی لال اسالال دیسائی اور جاس سنگھ خاص طور پر نمایاں ہیں اور ان کی خدمات مشرقی افریقہ میں اس قدر نمایاں اور مخلصانہ ہیں کہ اس کے اثرات عہد مستقبل پر افریقہ کے حق میں بیداری اور ترقی کا سبب بن گئے۔

رضا صاحب نے ہندو افریقہ کے قدیمی تعلقات پر بڑے دستاویزی ثبوت فراہم کیے اور افریقہ کے

متعدد ممالک کا جغرافیہ معہ آبادی رقبہ طرز حکمرانی کا سیاسی حیثیت سے بھرپور جائزہ لیا اور ہندوستانیوں کی ان کوششوں کی سراہنا کی جو خلوص، بے غرضی اور دیانت داری کی کھلی شہادت ہے۔ عربوں اور ہندوستانیوں کے افریقہ پر تہذیبی اثرات اور پھر یورپ کا نوآبادیاتی استحصالی انداز سے اثر انداز ہونا ایک نمایاں امتیاز کا حامل ہے۔ اہل افریقہ کی بیداری، معاشی ترقی، صنعتی اور دیگر امور میں ترقی کرنے کے بعد ان کا ہندوستانیوں کے ساتھ معاشرت کا عمل بھی واضح ہو گیا۔

جن چار شخصیتوں کا افریقہ پر اثر انداز ہونا تفصیل سے بتایا گیا ہے اس کے سوا بھی اور کئی شخصیتیں شمار کرائی جاسکتی تھیں کیونکہ یہ وسیع تاریخی بحث ہے جو ہزاروں صفحات پر محیط ہو سکتی ہے۔ باوجود اس کے ہندوستانیوں کا تعلق افریقہ سے صدیوں پرانا ثابت ہے۔ یہ کتاب مشرقی افریقہ سے متعلق ہے، شاید مغربی یا شمالی و جنوبی سمتیں باقی ہوں۔ اور ان سمتوں میں بھی ہندوستانیوں کا شاندار اور تعمیری کردار رہا ہوگا جو دوسری جلد میں آئے۔ یہ بات اس لیے بھی کچھ ناگزیر ہوئی کہ اس کتاب میں کہیں بھی مہاتما گاندھی کا ذکر نہیں ملتا۔ جو ایسا لگتا ہے ان کا تعلق دوسری سمت کے افریقہ سے رہا ہو۔ اسی طرح ہندوستان کے صرف تین چار خاندانوں کا ذکر ہی کافی نہیں لگتا۔ جس طرح عرب افریقہ پر اثر انداز ہوئے ہندوستان سے مسلم خاندان بھی اثر انداز ہوئے ہوں گے۔ بہر حال یہ مورخانہ انداز ہندوستان کے ہر مذہب و ملت کے ایسے افراد کے تذکروں پر بھی محیط ہونا چاہیے جس سے محض چند خاندان ہی نمایاں نہ ہوں بلکہ اشارتاً ہی سہی لیکن تفصیل بہر حال اس امر کی متقاضی ہے کہ اس سلسلے کو بھرپور طریقہ سے نمٹا جائے۔ ایسے ملے جلے تذکرے جو ایک دوسرے کی شہادت بھی بن سکتے ہیں۔

اس کتاب کا ایک باب جو بطور ضمیمہ شامل ہے "بحر ہند کے گرداگرد سفر" بڑا جاندار اور معلوماتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اہل ہند اور مشرقی افریقہ کے صدیوں پرانے روابط و تعلقات پر جہاں نظر جاتی ہے وہیں اردو یا ہندی سے افریقہ کا آشنا ہونا، اسی ربط و ارتباط پر ایک شہادت بھی ہے جو اپنی اثر پذیری جاری رکھے ہوئے ہے اور اردو جس قدر افریقہ میں پھیلے گی ہندوستان کے افریقہ پر احسانات کا دستاویزی اور علمی ثبوت فراہم کردے گی کیونکہ اردو زبان کی جنم بھومی ہندوستان ہے جس سے کسی کو انکار کی مجال نہیں ہے۔ بہر کیف رضا صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے شعر و سخن کے میدان سے ہٹ کر نثر میں ایک تاریخ مرتب فرمائی ہے جو دوسرے کام کرنے والوں کے لیے شمع راہ ثابت ہوگی۔ ایک اور اہم بات یہ کہ کتاب کی مقصدیت کے پیش نظر یہ ہے کہ یہ کتاب ہندوستانیوں کے علم میں یہ بات لانے کے لیے ہے کہ افریقہ پر تمہارے کیسے کیسے احسانات ہیں، وہیں اس سے زیادہ شدید ضرورت ہے کہ افریقیوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ غیر مہذب پسماندہ افریقہ کو ہندوستانیوں نے اخلاص نیت اور دیانت داری سے انسانی ہمدردی کے تحت کس طرح سنوارا بنایا اور قربانیاں دیں۔

صفحہ چودہ پر سطور دس اور گیارہ کے الفاظ گپتا صاحب کی صداقت بیانی کی منہ بولتی شہادت ہیں کہ "ایسٹ افریقن ریلوے لائن کے ہر سلیپر کے نیچے کسی نہ کسی ہندوستانی مزدور کا سر دفن ہے۔" آخر میں صد آفریں اس حقیقت بیانی پر، اس لیے ہماری گزارش ہے کہ ان حقائق کو افریقیوں پر شدت کے ساتھ واضح کیا جائے۔ یہ ہر اس ہندوستانی کا فرض ہے جس کا تعلق افریقہ سے کسی نہ کسی حیثیت سے رہا ہو اور ایسی کتاب افریقہ میں انگریزی رسائل یا ان رسالوں میں بھی پیش کی جائیں جو وہاں رائج ہوں۔ اور ایسی کوششوں کی حکومت ہند کو بھی سرپرستی کرنی چاہیے تاکہ ہند کی عظمت رفتہ ان ممالک کی نظروں میں تازہ ہو جائے جہاں ہندوستانیوں نے بے لوث قربانیاں دی ہوں۔

☆☆☆

تبصرہ

سہو و سراغ

محمود ایوبی

سہو و سراغ، کالی داس گپتا رضا کی ایک نئی کتاب ہے۔ گپتا صاحب کی لائبریری میں جتنی قیمتی اور نایاب کتابیں ہیں، ان کے دماغ میں اس سے کہیں زیادہ علم ہے۔ اس لیے ان کی جتنی کتابیں بھی آئیں اردو زبان و ادب کے لیے نیک شگون ہے۔

گپتا صاحب کی متعدد کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر صاحبان علم و فن سے داد و تحسین وصول کر چکی ہیں۔ اس لیے ان کی زیر نظر کتاب پر کچھ لکھتے ہوئے قلم لرزاں ہے کیونکہ گپتا صاحب گوناگوں صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ ماہر زبان و فن ہیں، بحر تحقیق کے شناور ہیں اور شاعر خوش بیاں ہیں۔

مگر ان کا اصل میدان تحقیق ہی ہے۔ اس میدان میں انھوں نے نہ صرف اردو ادب کی تاریخ کے گمنام اور پوشیدہ ابواب کا پتہ لگایا ہے بلکہ جدید اور قدیم نقادوں، تذکرہ نویسوں اور محققوں کی فرو گذاشتوں اور غلطیوں کی بھی نشاندہی کی ہے اور اس طرح زبان و بیان کی تاریخ میں راہ پانے والی غلط روایات کو درست کیا ہے۔

گپتا صاحب نے تنہا اتنا کام کیا ہے کہ ان کی ذات ایک ادارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سہو و سراغ میں بھی انھوں نے غالب، داغ، نسیم اور دبیر وغیرہ کے متعلق پھیلی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ جن لوگوں کا تاریخ ادب میں کوئی ذکر نہیں ملتا یا جن کی خدمات کا سرسری ذکر ہے، ان پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، مثلاً مظہر جان جاناں کے مسلک اور کیول رام سے ان کے تعلق کا ذکر، یا مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی شاعرانہ حیثیت کا جائزہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی کی وطن پرستی اور ثابت قدمی کا تشفی بخش ثبوت۔

چونکہ سہو و سراغ میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے اس لیے اسے "سن رکھو تم فسانہ ہیں یہ لوگ"، "سہو و سراغ" اور "رفتار قلم" کے عنوانات کے تحت اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں انھوں نے استادان وقت اور مختلف اداروں اور افراد سے ان کے تعلقات یا ان کی نجی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ کسی ایک متنازعہ یا تشریح طلب نکتے کو اٹھایا گیا ہے اس لیے عام طور پر یہ مضامین مختصر ہیں مگر تشنہ نہیں۔ دوسرا حصہ غالبیات سے متعلق ہے لیکن اس میں چکبست، نسیم، اودھ پنچ اور تاریخ ادب کے دوسرے گوشے بھی سمٹ آئے ہیں۔

سہو و سراغ ہو یا گپتا صاحب کی کوئی اور کتاب، اسے پڑھتے وقت یہ احساس بالکل نہیں ہوتا کہ تحقیق کے خشک موضوع میں الجھے ہوں۔ یہ تو پہلے کہا گیا کہ زبان اور فن پر ان کو عبور حاصل ہے۔ لیکن واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ بہت ہی دلچسپ اور دلکش انداز تحریر کے بھی مالک ہیں جس کی بدولت ان کے تحقیقی مضامین بھی

گراںبار نہیں ہوتے۔ زیر بحث کتاب میں بھی ہمارا تخلص اور ہم ایڈیٹر ہے، وغیرہ اس کی شگفتگی کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

مصنف کا خلوص بھی جادو کی طرح سر چڑھ کر بولتا ہے۔ تحقیق و تدقیق کے وقت گپتا صاحب اخلاص و ایمانداری اور ہمدردی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ آب حیات جیسی مستند کتاب ہندو شاعروں کے تفصیلی ذکر سے خالی ہے تو وہ جگر بریلوی کی طرح صرف شکایت کر کے نہیں رہ گئے بلکہ اس کمی کو پورا کیا۔ اور جن حضرات کا محض سرسری تذکرہ ہے ان کے بارے میں ممکنہ معلومات فراہم کردی ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو اسی طرح تاریخ ادب کی گم گشتہ کڑیاں دریافت ہوگئی ہیں اور یہ کام انھوں نے حسن ہمدردانہ طریقہ سے انجام دیا ہے اس سے ان کی وسیع نظری، ناظر فداری اور ادبی دیانت کا پتہ ملتا ہے کہ انھوں نے یہ اقرار بھی کیا ہے کہ ہندوؤں نے سرکاری زبان فارسی کی طرف جتنی توجہ دی تھی اتنی اردو کی طرف نہیں دی کہ اسے دس بیس سال سے زیادہ سرکاری سرپرستی نہیں ملی تھی۔

افراد کی طرح استادوں کے کلام کتابت یا املا کی غلطی سے اپنے اصل مفہوم کھو بیٹھے ہیں۔ گپتا صاحب نے نہ صرف ایسے اشعار کی تصحیح کی بلکہ ان بہت سے مشہور اشعار اور ان کے اصل خالقوں کا سراغ بھی لگایا ہے جو سہواً کسی اور سے منسوب کیے جاتے رہے ہیں۔

تحقیق کے میدان میں انھوں نے تن تنہا ایک ادارے کا جو کام کیا ہے اس کا لوہا تو ماننا ہی پڑتا ہے۔ زیر نظر کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ان کے دوسرے جوہر بھی کھلتے ہیں یعنی یہ کہ وہ حیرت انگیز طور پر ایک اعلیٰ درجے کے انشا پرداز بھی ہیں۔ رفتار قلم کے زیر عنوان جو چند مضامین ہیں وہ اس دعوے کی دلیل پیش کرتے ہیں اور یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر نہ صرف ڈاکٹر عبدالحق کے گدڑی کا لال اور رشید احمد صدیقی کے کندن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے بلکہ یہ سراغ بھی ملتا ہے کہ صاحب کتاب شاعری کے علاوہ موسیقی سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ پڑھ کر اس کے مرتب صابر دت کو بھی داد دینی پڑی کہ اس مجموعہ کے ذریعہ گپتا جی کی ان خوبیوں کو بھی منظر عام پر لے آئے جو اب تک چند ہی لوگوں پر ظاہر تھیں۔

مختصر یہ کہ صاف و سفید ۲۸۰ ر صفحات کی یہ مجلد کتاب اپنے نام کے اعتبار سے سہو و سراغ ہے ورنہ حقیقتاً یہ خوبیوں اور تحیرات کا مجموعہ ہے۔ اس لیے کتابت کی غلطیوں کے باوجود ۳۵ ر روپے میں ارزاں ہے جسے ادارہ فن اور شخصیت، پنچ رتنا، ۲۳۲ (دوسرا منزلہ)، اوپیرا ہاؤس، بمبئی ۴ سے حاصل کر کے ذوق مطالعہ کی پوری تسکین حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

تبصرہ

بہارِ اُردو گلشنِ مشرقی افریقہ میں

رام پرکاش راہی

یہ دستاویزی پیشکش رضا صاحب کے مشرقی افریقہ میں آنے سے پہلے یعنی ۱۸۹۹ء سے ۱۹۴۸ء تک اور ان کے وہاں قیام گزیں ہونے کے بعد یعنی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۹ء تک کی اردو سے متعلق سماجیاتی اور ادبیاتی صورتحال کا احاطہ کرتی ہے۔ لہذا ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۸ء کا عرصہ وہاں اردو کی ہی ابتداء و ارتقا کے تعلق سے ایک فلیش بیک کی تکنیک سے پیش کیا گیا ہے اور یہ سلسلہ اربابِ اردو کی کارکردگی کو ایک جھلک کے روپ میں سامنے لے آتا ہے۔

۱۹۴۸ء تک کی موجودہ تصویر کو مزید جلا دیے اور اس میں بدلتی ہوئی صورتحال کے نئے نئے اور متواتر نقوش اُبھارنے میں رضا صاحب کا رول بڑی شدید کے ساتھ حاوی رہا۔ ہر طرح کے مشاعرے، طرحی اور غیر طرحی، تقریبات کے پیش نظر اور خالص ادبی نیز تفریحی ماہیت اور نوعیت کے حامل، وہاں کی ثقافتی کارکردگیوں اور سرگرمیوں میں حسبِ حسبہ اضافہ کرتے گئے۔ رسالوں کا اجراء، بزمِ سخن کا قیام وغیرہ وہاں کی خوشحال فضاؤں میں ایسی کیفیات کا سلسلہ فراہم کرنے لگے جس سے تہذیب عبارت ہوئی اور سماجی فضا میں رنگ آہنگ کے مرحلے جگمگاتے گئے۔ گویا ایک روداد وجود پذیر ہوئی جو کسی قدر جامع اور موثر بن کر اُبھری۔

رضا صاحب، ساحر شیوی اور مشرقی افریقہ (یعنی کینیا) میں آباد اور برسرِ عمل دیگر ہندوستانیوں نے وہاں کی زندگی کو وطنیت کا رنگ دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ "کلمنجارو کے دامن میں"، "یوانشا جھیل"، "پرچم کینیا کے سایے میں" جیسے قومی مناظر اور مواقع پر محیط شعراء کی تخلیقی اور ادبی اُڑانیں ایک فنکارانہ اور جمالیاتی رویے کی دیانت دارانہ کوششوں کی آئینہ دار ثابت ہوئیں۔ یوانشا جھیل کی منظر کشی کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ ہوں

دھوپ میں پانی جامِ موثر
سبزۂ ساحل ارضِ مصور
آب صفا پر دُھندلا سینہ
خال رخ بے داغ حسینہ

کیمیا کی آزادی پر شاعر نے اپنا احساس نشاط ایسے اجاگر کیا ہے۔

دل میں ہے خوشی کیمیا آزاد ہوا ہے
مستی میں ہر ایک خورد و کلاں جھوم رہا ہے
ساقی نہ دیے دو چار کو چن چن کے اجازت
کہہ دے کہ یہ در سب کے لیے آج کھلا ہے

کچھ مضامین بھی اس تصنیف کی زیب و زینت ہیں جو متعلقہ موضوعات پر علمی و فکری معلومات کا ایک وش آمیہ فراہم کرتے ہیں۔ "یادش بخیر" ماہر القادری اور "غالب اور اقبال" اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

بیرونی میں جہاں کوکس اردو رائٹرز گلڈ کی شاخ کا ۱۹۶۸ء میں قیام قابل ذکر ہے وہاں جناب ساحر شیوی ل فنی اور ادبی خدمات کی رطب اللسانی بھی ناگزیر سی ہو جاتی ہے۔ ساحر کی اس "بہار اردو" کے منظر نامے میں ثرکت خلوص رضا صاحب کے دائیں ہاتھ کی ماہیت اختیار کر گئی ہے۔ رضا صاحب کے برجستہ اور ہنگامی کلام پر مشتمل ضمیمہ نمبر ۲، ساحر ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ گویا ساحر صاحب اس کتاب کی ترتیب و تہذیب میں "رفاقت کار" کا بڑا ہی معتبر اور مختصر نمونہ ثابت ہوئے ہیں۔

زیر نظر کتاب، ایک غیر ملک میں اردو کی ترویج و ترقی کا منظر نامہ ہونے کے ناطے سے سر و چشم لیے ل چیز ہے۔ امید ہے اردو ادب کی دنیائے ذوق و شوق اسے پذیرائی سے نوازیں گے۔

☆☆☆

198, AGRENCLAYE, NEW DELHI - 110 092

چکبست اور کالی داس گپتا رضا

تبصرہ

چکبست اور باقیاتِ چکبست

حسن عباس فطرت

اردو شاعری میں قومی احساس حالی کے زمانے سے قبل ہی پیدا ہو چکا تھا۔ حالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم و معاشرت مغربی کو قابل نمونہ قرار دینے کے بعد بھی حکومت کی بعض غیر منصفانہ کارروائیوں کی شکایت کی۔ اگرچہ وہ در پردہ تھی اور زیادہ زور مسلمانوں کے احیاء پر ہوا کرتا تھا۔ لیکن احساس غلامی بہر حال اس کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ البتہ اکبر الٰہ آبادی کے یہاں یہی احساس موج تہہ نشیں بن کر اُبھرتا چلا آتا ہے۔ اقبال کے کلام میں یہ احساس پوری قوتِ علمی و شعری کے ساتھ ظاہر ہوا ہے لیکن ان کے نظریہ حب وطن میں بنیادی طور پر تغیر ہوتا رہا۔ ظفر علی خاں کے قبیل کے شعراء کا کلام وقتی، جذباتی اور ناقابل اعتبار و سند رہے گا۔ لیکن چکبست کو پڑھو تو ایسا لگتا ہے کہ وہ پیدا ہی ہوئے تھے وطن و قوم کی شاعری کے لیے۔ وہ شروع سے آخر تک ملک و ملت کی محبت میں ڈوبے رہے اور ہمیشہ ہندوستان کے لیے ایک متحدہ قومیت کا خواب دیکھتے رہے۔ اس کی بشارتیں دیتے رہے اور اس میں رکاوٹ بننے والوں کو فہمائش بھی کرتے اور کڑھتے بھی، بلاشبہ چکبست کا کلام کاروان آزادی کا جرس تھا۔

وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں نئے جھگڑے، نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں

چکبستؔ نے صغر سنی میں شاعری شروع کر دی اور مشاعروں میں حصہ لینے لگے، انھوں نے ۱۹۰۵ء سے قومی شاعری کی ابتدا کی اور اقبال کے رنگ میں کہنا شروع کیا۔ ان کی ابتدائی نظموں "خاک ہند"، "وطن کا راگ" وغیرہ سے یہ بات صاف مترشح ہوتی ہے۔ چکبستؔ پر انیس کا بھی گہرا اثر تھا۔ اس کی وجہ سے انہوں نے مسدس میں ہر بڑے قومی لیڈر کا مرثیہ کہا اور رامائن منظوم کے طور پر اردو ادب کو بے مثال تحفہ دیا۔ اس نظم میں ان کی انفرادیت اب تک جوں کی توں ہے۔ چکبست کا علمی ذوق بہت بلند تھا۔ فارسی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ اساتذہ کے کلام سے پوری طرح آشنا تھے۔ "معرکہ چکبست و شرر" سے ان کے علم، توازن، شائستگی اور بہت سی صفات حسنہ کا علم ہوتا ہے۔ ادب و سیاست دونوں سے ان کو گہرا شغف تھا اور اگر ان کی عمر وفا کرتی تو دونوں میدان میں ان کے کارنامے مہتم بالشان اور کثیر ہوتے۔ لیکن افسوس کہ عین عالم شباب میں ان کو اجل نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"چکبست و باقیات چکبست' ایک تحقیقی کتاب ہے لیکن مصنف نے اسے تخلیق کی شکل دیدی ہے۔ تحقیق کے ذریعہ چکبست کے بہت سے نادر و مفید مضامین اور غزلوں کو جمع کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شاعر کی سوانح حیات اور کوائف عمر کو مستند و محتاط حوالوں کے ساتھ بیان کر کے اسے ایک نئی اور جاندار شے بنادیا گیا ہے۔

کالی داس گپتا رضا کی تحقیق کا مزاج یہ ہے کہ کوئی بات قیاس آرائی والی نہ ہو۔ نہ اس میں عبارت کے

ڈھیلے پن کا عیب ہو۔ چکبست کی حیات و شاعری کے تعلق سے رسالے بڑی دیدہ ریزی کی ہے۔ اور بہت سے بکھرے ہوئے مواد کو بڑے سلیقے سے یکجا کرنے کے بعد جگہ جگہ اسے تنقید و تحقیق کی کسوٹی پر کسا بھی گیا ہے۔ مثلاً یہ بحث کہ

شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا　　　　تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

والے شعر کی اصلیت کیا ہے اور شہرت و قیاست کی وجہ سے وہ اب تک کیا سمجھا جاتا تھا۔

تیس برس بعد سیّد اختر علی تلہری نے چکبست کے بارے میں جس طرح اپنی رائے جگہ جگہ بدلی ہے اس کو رضا صاحب نے کافی صراحت سے عیاں کیا ہے۔ اور اپنے مفید نوٹ کے ساتھ　یہ حصہ بھی خاص طور سے قابل مطالعہ ہے اور مصنف کی وسعت نظر و گہری نگاہ کا بیّن ثبوت ہے۔

چکبست کی نثر بھی کم دلچسپ نہیں تھی بلکہ ہر صنف میں ان کو دخل تھا۔ ڈرامہ مضمون، تنقید، طنز یہ غرض ہر قسم کی چیز ہم کو ان کے یہاں ملے گی۔ اس کتاب سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ چکبست کی نثر کا پلہ نظم سے ہلکا تھا مگر ان کی نثر کا معیار بھی معمولی نہ تھا۔

"اودھ پنچ ، اردوئے معلیٰ" اور "زمانہ" ایسے اخبار و رسائل چکبست کے مضامین کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ کلام اقبال، "مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا" بڑے پر لطف مضامین ہیں۔

اس کتاب کی قیمت رسالہ "صبح امید" لکھنؤ کی دریافت لوسے اور سوا ہو گئی ہے۔ یہ رسالہ چکبست کی ادارت میں ۱۹۱۸ء میں جاری ہوا اور چار سال تک ملکی خدمت کرتا رہا۔ اس کے مضامین کو پڑھ کر چکبست کے دس و قلم دونوں کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ اس عہد کے پیش آمدہ باریک سے باریک پولیٹیکل مسائل پر چکبست اپنی واضح و صائب رائے رکھتے تھے اور اپنے قلم و تحریر کے جادو سے دوسروں کو اپنا ہم نوا بھی بنا سکتے تھے۔ کتاب کا یہ حصہ دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہند کی تاریخ آزادی کے ایک خاص رُخ کو واضح کرتا ہے۔

آخر میں چکبست کی بکھری ہوئی نظمیں، غزلیات، رباعیاں کو قدیم تذکروں اور رسائل کی چھان بین کر کے اکٹھا کیا گیا ہے اور اس طرح ایک چھوٹا سا دیوان مرتب ہو گیا ہے۔

"چکبست و باقیات چکبست" کی تیاری میں کافی مدت صرف ہوئی۔ ۲۳ کتابوں اور ۴۵ رسالوں کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتنی ساری کتابیں اور دستیاب رسائل کا انبار مصنف کے پیش نظر رہا ہوگا اور اس سے کار آمد مواد نکالنے میں کس قدر جگر کاوی ہوئی ہوگی۔

کتاب ہر طرح مفید و دلچسپ ہے اور تحقیق کا ایک اچھا معیار قائم کرتی ہے۔ اگرچہ اس میں مرزا جعفر حسین و نجم الدین شکیب ایسے غیر محتاط افراد کے فرمودات کا اقتباس نہ ہوتا یا تنقید کے ساتھ ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ ان کے بیانات سے چکبست کے اخلاق و عادات، رہن سہن کے بارے میں کہیں کہیں متضاد صورتیں سامنے آجاتی ہیں۔

☆☆☆

تبصرہ

کلّیاتِ چکبست (نظم)

ڈاکٹر خلیق انجم

تقریباً دو سال قبل کالی داس گپتا رضا کی ایک کتاب "چکبست اور باقیاتِ چکبست" شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں چکبست کے سوانح کے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تھی جو اب تک تاریکی میں تھے یا جن کے بارے میں ہمیں تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ چکبست کے مطالعے کے سلسلے میں اسے ایک اہم کتاب سمجھا گیا تھا۔ اب چکبست پر کالی داس گپتا رضا کی دوسری کتاب کلّیاتِ چکبست (نظم) شائع ہوئی ہے۔ یہ کلّیات دو یا تین جلدوں میں شائع ہوگی۔ چکبست کی زندگی میں ان کی تین کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ کلام کا مجموعہ "صبحِ وطن"، مضامین کا مجموعہ "مضامینِ چکبست" اور ایک ڈرامہ "کملا" ان کی وہ نظمیں اور غزلیں جو اردو ادب کی آبرو ہیں، ان کے عہد کے مختلف رسالوں میں دفن تھیں۔ رضا کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے بڑی تحقیق اور جستجو سے ان کا تقریباً تمام کلام یکجا کیا۔ اسی کلام کا یہ پہلا حصہ ہے جس میں چکبست کی صرف نظمیں شامل ہیں۔

چکبست کے مجموعہ کلام "صبحِ وطن" میں کئی نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس مجموعہ کے ساتھ ایک المیہ یہ ہوا کہ اسے مرتب تو غالباً خود چکبست نے کیا تھا لیکن اس کی طباعت مکمل ہونے سے پہلے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مجموعے میں متنی تنقید کے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے۔ ایک دلچسپ مسئلہ جس کی طرف کالی داس گپتا رضا صاحب نے اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ "صبحِ وطن" کا دیباچہ سر تیج بہادر سپرو نے لکھا تھا، انھوں نے دیباچہ میں چکبست کے اشعار کافی تعداد میں پیش کیے ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جو اشعار "صبحِ وطن" کے متن میں اور دیباچہ میں مشترک ہیں ان میں خاصے اختلافات نسخ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سپرو نے یہ اشعار اگر متن سے لیے ہیں تو ان میں اتنا اختلاف کیسے ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جب سپرو نے دیباچے کے لیے اشعار منتخب کر لیے تو چکبست نے اپنے کلام پر نظر ثانی کر کے کچھ تبدیلیاں کی ہوں۔ بہر حال متنی تنقید کے یہ دلچسپ مسائل ہیں۔

رضا صاحب نے چکبست کا تمام کلام یکجا کرنے میں برسوں محنت کی ہے اور پھر اسے معقول انداز میں مرتب کیا ہے۔ انھوں نے جو نظم جہاں سے حاصل کی ہے اس کا حوالہ دیا ہے۔ نظموں میں بہت سے نام اور واقعات ایسے آگئے ہیں جو وضاحت طلب ہیں۔ کالی داس گپتا رضا صاحب نے ان پر مختصر لیکن بہت جامع حواشی لکھے ہیں۔

کالی داس گپتا صاحب کا یہ ایک بڑا اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے چکبست کی تقریباً تمام نظموں کا سنہ تصنیف متعین کیا ہے۔ کسی بھی فنکار کے ذہنی سفر کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہوتا ہے کہ

اس نے کس سنہ میں کون سی غزل یا نظم کہی۔

کلیات کے شروع میں اسی صفحات کا ایک دیباچہ ہے۔ دیباچے کا آغاز "توقیت چکبست" سے ہوتا ہے جس میں چکبست کی زندگی کے اہم واقعات اور ان کی تاریخیں درج کی گئی ہیں۔ "تصانیف چکبست" کے تحت چکبست کی تمام منظوم اور منثور تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔ دیباچے کے باقی صفحات میں چکبست کی نظم کا تنقیدی جائزہ دیا گیا ہے اور آخر میں کلیات کی ترتیب سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

کلیات کے آخر میں تین اشاریے ہیں۔ پہلا افراد کا، دوسرا مقامات کا اور تیسرا کتب و رسائل کا۔ ان اشاریوں نے کلیات کی افادیت کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔

کلیات چکبست (نظم) صرف مطالعۂ چکبست میں ایک اہم اضافہ ہی نہیں ہے بلکہ کلیات کے تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے کا ایک قابل تقلید نمونہ بھی ہے۔

☆☆☆

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Urdu Ghar Urdu Ghar Marg, Rouse Avenue

New Delhi - 110 002

تبصرہ

مقالاتِ چکبست

ڈاکٹر خلیق انجم

پچھلے آٹھ دس برسوں میں جن محققین نے اپنے اعلا درجے کے کاموں سے ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے اس میں کالی داس کا نام سر فہرست ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر کام کیا ہے۔ غالب پر ان کا کام قابل قدر ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ اردو کے صف اول کے ادیب اور شاعر پنڈت برج نرائن چکبست پر تحقیقی اور تنقیدی کام کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر ان کی پہلی کتاب "چکبست اور باقیات چکبست" ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصے میں تحقیق، محنت اور دیدہ ریزی سے چکبست کے حالات مرتب کیے ہیں۔ دوسرے حصے میں چکبست کی وہ نثر اور نظم مرتب کی گئی ہے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئی تھی لیکن کتابی صورت میں پہلی بار رضا صاحب نے شائع کی۔

"کلیات چکبست" اس موضوع پر رضا صاحب کی دوسری کتاب ہے۔ اس کلیات میں چکبست کی تمام نظمیں، غزلیں اور رباعیاں مرتب کی گئی ہیں۔ چکبست کا تقریباً تمام شعری سرمایہ اس کلیات میں شامل ہو گیا ہے۔

رضا صاحب نے بہت محنت اور تحقیق سے اس کلیات کے حواشی لکھے ہیں۔ کلیات کے شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے۔ زیر تبصرہ کتاب یعنی "مقالاتِ چکبست" اس موضوع پر رضا صاحب کی تیسری کتاب ہے۔ اس میں چکبست کی نثری تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے۔

چکبست اردو کے صف اول کے نثر نگار تھے۔ اردو کی کوئی تاریخ ان کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی لیکن بدنصیبی یہ تھی کہ ان کے تقریباً تمام مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے اور انھیں یکجا مرتب کرنے کی کسی کو توفیق نہیں ہوئی تھی۔ چکبست نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے تھے۔ ان موضوعات میں نثر شاعری سماجیات اور سیاسیات غرض سبھی کچھ شامل ہے۔

چکبست کا سب سے بڑا نثری کارنامہ وہ مضامین ہیں جو انھوں نے گلزار نسیم کے مباحثے کے سلسلے میں لکھے تھے۔ اس موضوع پر چکبست اور شرر صاحب کا زبردست ادبی معرکہ تھا۔ اس سلسلے کے مباحث "معرکہ چکبست و شرر" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ چکبست کو دیا شنکر نسیم سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ انھوں نے مثنوی گلزار نسیم بڑی محنت سے مرتب کی تھی۔ اس کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا تھا اور آخر میں دیا شنکر نسیم کے کلام کا انتخاب شامل کیا تھا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ چکبست نے مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے ان کے کم سے کم گیارہ

مضامین سوانحی ہیں جن میں انھوں نے پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت کشن پرائن اور منشی سید محمد سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، منشی جوالا پرشاد برق جیسے ادیبوں اور شاعروں کے سوانح مرتب کیے ہیں۔ انھوں نے تاریخ، ذات کی تفریق، بھارت درپن جیسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ سیاسیات میں کلکتہ کانگریس پر ایک سیاسی نظر انڈین نیشنل کانگریس کا اکیسواں اجلاس اور گوکھلے کی تقریروں کا دیباچہ اہم تحریریں ہیں۔

نئی نسل کے بہت کم اردو والے اس حقیقت سے واقف ہیں کہ چکبست ایک اچھے مزاح نگار بھی تھے۔ انھوں نے بیس سال کی عمر سے مزاحیہ نثر لکھنی شروع کی۔ وہ اودھ پنچ کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے اور ان کا پہلا مزاحیہ مضمون وہ تھا جس کا عنوان ہے "مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا" اپنی سنجیدہ تحریروں میں بھی چکبست طنز و ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے ہیں۔

ہم کالی داس گپتا کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے چکبست کی خاصی نثری تحریروں کو یکجا کر دیا ہے۔ اس کتاب کے ۵۳ صفحات کے مقدمے میں انھوں نے "توقیت چکبست" کے نام سے چکبست کی مختصر ترین سوانح عمری اس طرح مرتب کی ہے کہ چکبست کی زندگی کے تمام اہم واقعات اور سنین ہماری نظر میں آجاتے ہیں۔

چکبست کی تمام تصنیفات کا تعارف کرا کے چکبست کا بحیثیت نثر نگار تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب چکبست کے موضوع پر ایک اہم ترین تالیف ہے۔

☆☆☆

تبصرہ

چکبست کچھ بازدید، کچھ پیش رفت

رام پرکاش راہی

عصری ماحول میں، غیر ادارہ جاتی تحقیق و تدوین کی جب بات چھڑتی ہے تو اس شعبۂ ادبیات میں، پہلے سے ہی ایک ممتاز حیثیت کے مالک، کالی داس گپتا رضا صاحب کا نام سر فہرست آجاتا ہے کیونکہ اس معیار و ماہیت کے بہت سے علمبردار اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ دوسری تحقیقی کاوشوں کے علاوہ، چکبست، آتش، غالب پر موصوف کی تحقیقی و تدوینی نوعیت کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان تصنیفات و تالیفات کے محاسن و معائب پر حسب توفیق و ظرف، حسب تعبیر و تعصب، اربابِ نقد و نظر کی طرف سے تحسین و تنقیص بھی اپنے گل کھلا چکی ہے۔ فضائے ادب کی بے قدریوں اور ناشناسیوں کے تقاضے شاید اتنے زوردار اور شدید نہیں تھے کہ ان کتابوں میں ہی رضا صاحب کا ان کتابوں سے منسوب کمی و بیشی کا اعتراف ہے جس کی پیروی نے انہیں زیر نظر کتابچہ کی اشاعت کا جواز فراہم کیا اور اس میں ایک ضمیمے کے طور سے موصوف نے ترمیم و تنسیخ اور رخنہ بندی کا کام سر انجام دیا ہے۔ متعلقہ کتابوں کے نام ہیں چکبست اور باقیاتِ چکبست، انتخابِ آتش و غالب، کلیاتِ چکبست اور مقالاتِ چکبست۔

ایک بازدید کے تحت، رخنہ بندی وغیرہ کے ارشادات کے علاوہ، کچھ پیش رفت کا سلسلہ جو رضا صاحب نے قلم بند کیا ہے وہ ایک تو چکبست پر ان کے کام پر مختلف اعتراضات کا منہ توڑ جواب دیتا ہے اور مزید بر آں کئی متفرقات پر تحقیق کے نئے گوشے اُجاگر کرتا ہے۔ ان متفرق اُمور میں شامل ہیں مثلاً ڈراما کملا میں چکبست کی ایک غیر متداول غزل، زمانہ ۱۹۱۵ء منشی پریم چند، تذکرۃ الشعراء جزو پنجم، ۱۹۱۵ء حسرت موہانی، چکبست اور ان کے ایک مشہور ہم عصر سراپا یا بھارتی انتخابِ بیاضِ چکبست اور نقوش۔ شخصیات نمبر ۲۔

تحقیق و تدوین سے وابستہ حضرات جو چکبست پر کام کر رہے ہیں ان کے لیے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔ یہ امید خود مصنف کو بھی ہے جو اپنے کام پر اپنی خود اعتمادی کی عصا تھامے ہوئے ہیں اور یہ توقع ہمیں بھی ہے کہ ایک سچے محقق کی فطرتِ ناصبور اپنی کاوشوں کا سلسلہ اسی سنجیدگی اور ایثار کے ساتھ جاری و ساری رکھے ہوئے ہے جو اردو کے ایک سیکولر مزاج ادیب کی افتادِ طبع کا اٹوٹ حصہ ہے اور واقعی داد و تحسین کا مستحق ہے۔ ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

☆☆☆

198, AGCR ENCLAVE, NEW DELHI - 110 092

باب جوش

جوشؔ ملسیانی اور کالی داس گپتا رضاؔ

جوشؔ ملسیانی اور کالی داس گپتا رضاؔ ایک مطالعہ

تسلیم غوری بدایونی

پدم شری پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی متوفی ۱۹۷۶ء، داغؔ دہلوی کے ایک ہونہار شاگرد تھے۔ جناب عبد الشکور نے دورِ جدید کے ہندو شعراء مطبوعہ ۱۹۴۳ء میں جوشؔ ملسیانی کی تاریخ و سنہ پیدائش یکم فروری ۱۸۸۲ء لکھی ہے، جبکہ کالی داس گپتا رضاؔ نے اقبال کی خامیاں تیسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۹۴ء کے پیش لفظ میں جوشؔ ملسیانی کے حوالے سے یکم فروری ۱۸۸۳ء درج کی ہے۔ اس کے برعکس ساحرؔ ہوشیارپوری نے نقوشِ داغ مطبوعہ ۱۹۹۲ء میں یکم فروری ۱۸۸۴ء اور مالک رام نے تذکرۂ معاصرین جلد چہارم مطبوعہ ۱۹۸۲ء میں یکم فروری ۱۸۸۴ء تحریر کی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جوشؔ ملسیانی کی تاریخ پیدائش میں تو اہلِ قلم متفق ہیں مگر اُن کی سنہ پیدائش میں آج بھی اتفاق نہیں ہے۔

جوشؔ ملسیانی کی پیدائش پنجاب کے ضلع جالندھر کے موضع ملسیاں میں ہوئی تھی۔ ۱۹۰۲ء میں حضرتِ داغؔ کے تلامذہ میں داخل ہوئے اور ان کی وفات ۱۹۰۵ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان کے کلام کے مجموعے نشترِ عیب (طویل نظم) مطبوعہ ۱۹۰۸ء، بادۂ سر جوش ۱۹۴۰ء، جنوں و ہوش ۱۹۵۲ء، فردوس گوش ۱۹۶۳ء، نغمہ سروش ۱۹۷۳ء اور قومی نظموں کا مجموعہ دعوتِ عمل، ان کی حیات میں ہی شائع ہوکر خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ جوشؔ صرف شاعر ہی نہ تھے ایک بالغ نظر نثر نگار بھی تھے۔ نثر میں اقبال کی خامیاں ۱۹۲۸ء، دستور القواعد ۱۹۴۶ء، دیوان غالب مع شرح ۱۹۵۰ء، آئینہ اصلاح ۱۹۶۰ء اور مشوراتِ جوش بھی ان کی زندگی میں ہی شائع ہوگئی تھیں۔ لوح و قلم نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ بھاشاو بھاگ پنجاب نے ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔

جوشؔ ملسیانی کا حلقۂ تلامذہ خاصہ وسیع تھا۔ اس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔ کالی داس گپتا رضاؔ جن کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آرہا ہے، جوشؔ ملسیانی کے تلامذہ میں گل خوش رنگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ رضاؔ کا جنم بھی اسی جالندھر ضلع کے موضع تلکھ پور میں ۲۵ر اگست ۱۹۲۵ء کو شنکر داس گپتا کے گھر ہوا تھا جو حضرتِ جوشؔ کا وطن تھا۔ اتفاق سے موضع مکند پور میں جوشؔ کی سسرال تھی۔ اس طرح جوشؔ اور رضاؔ ہم وطن بھی تھے۔ حسنِ اتفاق سے راقم الحروف کے مورثِ اعلیٰ کا وطن بھی جالندھر ہی تھا۔ بعد کو وہاں سے ہجرت کی اور بدایوں آکر اپنے وطن کی نسبت سے اپنے جائے سکونت کو محلّہ جالندھری سرائے کا نام دیا۔

کالی داس گپتا رضاؔ نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا اُس وقت جوشؔ ملسیانی کا ادبی ڈنکا بج رہا تھا۔ اس لیے انھوں نے رضاؔ تخلص اختیار کر جوشؔ ملسیانی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے اور سلسلۂ داغ میں داخل ہوگئے۔ حضرت جوشؔ کی طرح کالی داس گپتا رضاؔ بھی اردو اور فارسی کے عالم تھے۔ صرف انگریزی زبان

میں وہ اپنے استاد سے سبقت لیے ہوئے تھے کیونکہ جوش ملسیانی کو اس بنگالی زبان سے انسیت نہ تھی۔ ۱۹۷۱ء میں حکومت ہند نے حضرت لبھو رام جوش ملسیانی کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں "پدم شری" اعزاز سے نوازا تو ٹھیک ۳۰ سال بعد حکومت ہند نے کالی داس گپتا رضا کو بھی ان کی ادبی خدمات کے صلے میں (خاص کر ماہر غالبیات، چکبستیات اور جوش ملسیانی) "پدم شری" اعزاز سے نوازے کا اعلان کیا۔ فرق اتنا ہوا کہ حضرت جوش نے یہ اعزاز اپنے ہاتھوں سے وصول کیا جبکہ محترم رضا اس اعزاز کو اپنے ہاتھوں نہ لے سکے۔ جوش کا انتقال بھی چند منٹوں میں دہلی میں ہوا جبکہ کالی داس گپتا رضا کا انتقال بھی چند لمحوں میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ۲۱ر مارچ ۲۰۰۱ء کو دہلی میں ہوا جہاں وہ بمبئی سے دہلی بغرض پدم شری اعزاز لینے آئے ہوئے تھے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہ تھیں چند خصوصیات جو ہم وطن استاد و شاگرد میں یکساں تھیں۔

کالی داس گپتا رضا کو اپنے استاد سے والہانہ عقیدت تھی، اسی عقیدت کی بناء پر انھوں نے جوش ملسیانی کی چار کتابیں، مکتوبات جوش ملسیانی، مشوراتِ جوش ملسیانی، جوش ملسیانی مع انتخاب کلام اور اقبال کی خامیاں ترتیب دے کر اپنے جیب خاص سے شائع کرائیں اور ایک لائق شاگرد ہونے کا حق ادا کر دیا۔ وہ جوش ملسیانی پر ایک کتاب یا تو لکھ رہے تھے یا ترتیب دے رہے تھے کیونکہ انھوں نے ویریندر پرساد سکسینہ صاحب سے جوش کے سلسلے میں مواد طلب کیا تھا، جس کو سکسینہ صاحب نے ان کی موت سے چار پانچ دن قبل ہی ارسال کیا تھا۔

حضرت جوش ملسیانی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے ۳ر ۲ کو ردیف بنا کر ایک غزل لکھی تھی جو کافی تلاش کے بعد بھی مکمل شکل میں مجھے نہ مل سکی۔ اس غزل کے سلسلے میں میں نے رضا صاحب کو ایک خط لکھا جس کے جواب میں انھوں نے مجھ کو جوش ملسیانی کی ۳ر ۲ ردیف والی غزل بھیج دی۔ یہ غزل اپنے میں شاہکار ہے۔ پہلے غزل پڑھیے، غزل مع خط یہاں نقل کرتا ہوں۔ یہ خط سات جنوری ۱۹۹۹ء کا تحریر کردہ ہے

"مکرمی تسلیم کرم نامہ 12 / 30 موصول ہوا۔ ۳ر ۲ والی غزل جب میں نے قبلہ جوش صاحب سے مانگی تو انھوں نے لکھا کہ یہ غزل تو عروضی ر ریاضی سے متعلق ہے۔ اسے پڑھ کر کیا کرو گے۔ بہر حال انھوں نے بھیج دی۔ وہی آپ کی ہدایت کے مطابق لکھے دیتا ہوں۔

شش جہت نہ فلک آئیں گے نظر ۳ر ۲
۶ر ۹ کے برابر ہے اگر ۳ر ۲
دو کھلونے جو کبھی ہم نے تباہی پہ دھرے
آگئے صاف مہندس کو نظر ۳ر ۲
بیسویں رات مہینے کی جب آجاتی ہے
غم میں رہ جاتا ہے گھل گھل کے قمر ۳ر ۲

ظالمو خوف کرو آہ کو سمجھو نہ حقیر
لفظ اللہ میں اس کا ہے اثر ۲/۳
رہ گیا ۱/۳ ہی اب صبر و سکوں
لے گئی آپ کی دزدیدہ نظر ۲/۳
طالبِ خیر نہ ہوں گے کبھی انساں سے ہم
نام ہے جس کا بشر اس میں ہے شر ۲/۳
منحصر قوتِ بازو پہ ہے دولت مندی
دیکھو لو زور میں موجود ہے زر ۲/۳
ملک الموت سے دنیا میں ہراساں نہیں کون
جس کو کہتے ہیں نڈر اس میں ہے ڈر ۲/۳
کھوئی منزل کیسے دیتی ہے تو اے شامِ شباب
راہ رو کا ابھی باقی ہے سفر ۲/۳
۳/۲ کی رکھی ہے جو اے جوشؔ ردیف
شعر بھی نکلے ہیں مقبولِ نظر ۲/۳

امید آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص کالی داس گپتا رضاؔ

جہاں تک میرا خیال ہے اردو شعراء نے مشکل سے مشکل ردیف میں غزلیں کہیں لیکن ہندسوں کو کسی نے ردیف نہیں بنایا۔ واقعی یہ غزل جوشؔ ملسیانی کی قادر الکلامی پر دال ہے۔ مگر میری سمجھ میں اس غزل کا مطلع نہیں آیا تو میں نے رضاؔ صاحب سے ہی اس مطلع کی وضاحت چاہتے ہوئے رابطہ قائم کیا۔ میرے خط کے جواب میں یکم فروری ۱۹۹۹ء کا تحریر کردہ خط مجھے موصول ہوا جس میں میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں

محبِ مکرم تسلیم

۲۴/ جنوری کا کرم نامہ ابھی موصول ہوا۔ کسی کام سے دو ایک روز کے لیے باہر جارہا تھا، اس لیے جواب فوراً لکھ رہا ہوں۔

نہ خرچ، نہ طشت، نہ فلک، نہ طبق، نہ سپہر، نہ طاق، (سب ہم معنی) مشہور ترکیبیں ہیں، اس میں شبہ کی گنجائش نہیں، حافظ کا ایک شعر دیکھئے

نہ طبق سپہر آں قرصۂ ماہ و خور کہ ہست
بر لب خوانِ قسمت سہل تریں نوالہ باد

صاحب منطق الطیر لکھتے ہیں،

گر بہک رہ گشت ایں نہ طشت گم
قطرۂ ایں در ہشت دریا گشت گم

مثالیں اردو میں بھی ہیں مگر اس وقت مجھے یاد نہیں، بہر حال میرے لیے استادی قبلہ کی سند ہی کافی ہے۔ مزید اعتراض ہو تو تحریر فرمائیں۔

مخلص کالی داس گپتا رضا

یاد آیا امیر خسرو کی مشہور فارسی مثنوی کا نام ہی "نہ سپہر" (یعنی نہ فلک) ہے۔ رضا

دیکھا آپ نے کتنی خوبصورتی اور اپنی علمی لیاقت سے کالی داس گپتا رضا اپنے استاد کو صاف بچا کر لے گئے۔ اس کی جگہ اگر کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو شاید اتنی وضاحت کے ساتھ اپنی بات نہ کہہ پاتا اور پھر اس کا یہ بھی لکھنا کہ مجھے میرے استاد کی ہی سند کافی ہے ان کا اپنے استاد سے قلبی عقیدت کا مظہر ہے۔

میں نے آنجہانی رضا کے اس جواب کے بعد ان کو پھر لکھا کہ قرآن میں سات آسمانوں کا ہی ذکر آیا ہے آپ بھی سات آسمان بتا رہے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں آنجہانی رضا نے مجھے ایک ہی دن میں دو خط لکھے۔ یہ خطوط ۱۲ر فروری ۱۹۹۹ء کے تحریر کردہ ہیں، پہلے خط میں لکھتے ہیں

محب مکرم تسلیم۔

خط ملا، مجھے نہیں معلوم کہ قرآنِ حکیم میں سبع سماوات (سمٰوات) کا ذکر آیا ہے کہ نہیں مگر یہ معلوم ہے کہ اسلام میں ہشت آسماں، سات آسمان ہی کا ذکر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نہ ملک، نہ آسماں وغیرہ تراکیب اسلام سے پہلے کی ہیں اور آج بھی فارسی ادب میں مروج ہیں۔ اس لیے آپ کی ۶ر ۷ کی تشریح درست نہیں۔ ۶ر ۹ یقیناً مستند ہے۔

آپ کا شش جہت میں زمین، آسمان کا شمار کرنا بھی نادرست ہے کیونکہ یہ جہتیں اوپر نیچے مانی جاتی ہیں نہ کہ آسمان زمیں۔ یہ غزل کوئی فلسفہ نہیں بس شعر کہنے پر قدرت کی دلیل ہے۔

آپ چاہیں اپنی رائے پر قائم رہ سکتے ہیں مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں، خدارا آپ اس غزل کو مذہبیات میں نہ لے جائیے۔

مجھے نسیم نور محلی کے کسی تذکرے کا علم نہیں۔ آپ کچھ نشاندہی کریں تو میں تلاش کروں۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص کالی داس گپتا رضا

مذکورہ بالا تاریخ کو ہی دوسرے تحریر کردہ خط میں اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"محب مکرم تسلیم

خط ڈاک کے حوالے کیے ہوئے ابھی گھنٹہ بھر ہی ہوا تھا کہ آپ کا خط پھر پڑھا تو معلوم ہوا کہ آپ نے میرے لکھے ہوئے آسمانوں کو بھی سات ہی پڑھا۔ میں نے یہ اتفاقیہ لکھدیے تھے۔ اب تیرہ اور لکھتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں مگر ہو سکتا ہے ان میں دو ایک پہلے بھی میں نے لکھ دیے ہوں۔

نہ بام، نہ پایہ، نہ پردہ، نہ محرہ، نہ حصار، نہ فراش، نہ شہر بالا، نہ طارم، نہ صحیفہ، نہ گردوں، نہ عرش، نہ قصر، نہ کاخ۔

مخلص کالی داس گپتا رضاؔ

مذکورہ بالا خط میں کالی داس گپتا رضاؔ نے ۱۳ر آسمان بتائے ہیں اور اپنے استاد کی بات سموانے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن میں آج بھی اس مطلع سے مطمئن نہ ہو سکا۔

بہر حال یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ کالی داس گپتا رضاؔ صرف شاعر ہی نہیں ایک عالم بھی تھے۔ فارسی ادب پر بھی ان کو دسترس حاصل تھی۔ وہ اپنے استاد کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک حرف کو سند کا درجہ دیتے تھے۔ یہ ان کی اپنے استاد سے عقیدت اور احترام کی دلیل ہے۔ یہ دونوں بزرگ آج ہمارے درمیاں موجود نہیں لیکن ان کے کارنامے ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ اب ایسے عالم و فاضل بزرگ چراغ لیکر بھی ڈھونڈو تو نہ ملے گے۔ شاد عظیم آبادی نے سچ کہا تھا

ڈھونڈھوگے ہمیں ملکوں ملکوں
ملے کے نہیں نایاب ہیں ہم

☆☆☆

محلہ جالندھر، بدایوں، یو پی

مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی بنام رضاؔ

ڈاکٹر شفیع احمد شریف

یہ مکتوبات حضرت جوش ملسیانی کے کالی داس گپتا رضا کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا ملک کے جانے پہچانے شاعر، ادیب اور نقاد ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ انھیں غالبؔ اور چکبستؔ پر ایک اتھاریٹی مانا جاتا ہے۔ وہ حضرت لبھو رام جوشؔ ملسیانی کے خاص شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق بے حد احترام ہے۔ استاد کو اپنے ہونہار شاگرد پر فخر ہے اور شاگرد اپنے استاد کی نگاہِ لطف و کرم پر نازاں ہے۔

حضرت جوشؔ ملسیانی، حضرت داغؔ کے شاگردوں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور انھوں نے داغ اسکول کو جاری و ساری رکھنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ اساتذۂ کرام اپنے شاگردوں کے کلام پر جو اصلاح اور انہیں جو مشورے دیتے ہیں وہ ایک اہم دستاویز کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ استاد کا مقام جتنا بلند ہوگا اس کی اصلاح اور ان کی نگارشات کا مقام بھی اتنا ہی بلند ہوگا۔ استاد سے استفادہ بالمشافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ دور دراز مقامات پر رہ کر خط و کتابت کے ذریعہ بھی۔ کالی داس گپتا رضا ایک بڑے عرصہ تک ہندوستان سے باہر نیروبی میں مقیم رہے اور اس تمام عرصہ میں انھوں نے حضرت جوشؔ ملسیانی سے خط و کتابت کے ذریعہ تعلق قائم رکھا۔

رضاؔ صاحب کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے حضرت جوشؔ ملسیانی کی شاگردی ۱۹۴۶ء میں اختیار کی۔ رضاؔ صاحب لکھتے ہیں

میں نے پندرہ سال کی عمر میں کنور بچت رام عیشؔ مرحوم کی سفارش پر استادی قبلہ کے ایک نہایت اچھے اور پرانے شاگرد لالہ جگن ناتھ کمال کرتارپوری کی شاگردی اختیار کی اور کامل چھ سال ان سے شاعری کے امور اور فنی نکات حاصل کیے۔ کمال صاحب جو اپنی ذات میں ایک کامل استاد، ماہر فن اور بے بدل شاعر و ادیب تھے۔ دل کے بھی بہت فراخ تھے۔ اپنے شاگردوں کو بہت چاہتے تھے اور ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتے تھے، چنانچہ ان ہی کی سفارش پر ۱۹۴۶ء میں استادی قبلہ کی شاگردی میں آیا "

استاد اور شاگرد کا رشتہ ۱۹۷۶ء یعنی حضرت جوشؔ ملسیانی کے انتقال تک بدستور قائم رہا۔ اس تیس سال کے عرصہ میں ان دونوں استاد و شاگرد کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ بقول حضرت عرشؔ ملسیانی والد محترم (حضرت جوشؔ ملسیانی) نے رضاؔ کے نام تقریباً ایک سو خطوط لکھے جن کا تقریباً آدھا حصہ نقل مکانی ۱۹۷۰ء کے وقت کھو گیا تاہم جو کچھ (کل ۵۵ خط) بچ رہا وہ اس کتاب (مکتوبات جوشؔ ملسیانی بنام رضاؔ) میں شامل ہے۔

پہلا خط ۲۱ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کا ہے اور آخری خط ۴ر دسمبر ۱۹۷۴ء کا۔ گویا یہ مجموعہ مکاتیب والد مرحوم کے آخری پچیس سال کی اجتماعی تاریخ ہے"۔

ان خطوط سے اس دور کی ایک نئی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور حضرت جوش ملسیانی کے شب و روز کا ایک نقشہ اُبھر آتا ہے۔ رضا صاحب ایک مشاعرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پندرہ سال بعد ۱۹۶۳ء میں چند مہینوں کے لیے ہندوستان پلٹا۔ اس اثناء میں استادی قبلہ کی خاطر حوالہ عزت افزائی ہوئی۔ میں دلّی سے سیدھا نکودر پہنچا بیوی اور دونوں بچے میرے ساتھ تھے۔ بچوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سب کے نام پوچھے جو آپ کو اخیر عمر تک یاد رہے۔ یہ بات ۱۶ر اپریل ۱۹۶۳ء دوپہر کی ہے۔ تھوڑی دیر بعد عیش مرحوم اور آپ کے ایک مقامی شاگرد ملونت کمار شاکر تشریف لے آئے۔ اچھا خاصہ مشاعرہ جم گیا۔ اسی شب پھر میری آمد پر ایک چھوٹی سی محفل برپا کرلی جس میں مَیں نے وہ غزل پیش کی جس کا مطلع ہے

غم دل سنانے میں جاؤں کیوں شہ عاشقی کی جناب میں
یہ تو لفظ لفظ سے ہے عیاں میری زندگی کی کتاب میں

سن کر فرمایا غزل مرصع ہے غیر ملک میں رہ کر بھی خوب ترقی کی ہے۔ میں آپ سے کلام کی فرمائش کرنے ہی والا تھا کہ عیشؔ صاحب نے میرے کان میں کہا" پہلے دوسرے شعراء کو سن لیجئے۔ اگر قبلہ کے کلام سن چکنے کے بعد آپ میں سے کسی نے اشعار سنانے چاہے تو قبلہ اسے آداب محفل کے خلاف سمجھیں گے۔ چنانچہ میں وہیں رک گیا۔ بعد میں جب شعراء اپنا کلام سنا چکے تو آپ سے کلام کی فرمائش کی گئی۔ آپ حقہ پیتے جاتے تھے اور یادداشت سے کلام سناتے جاتے تھے۔ دوران گفتگو آپ نے ماضی کے بھی ایسے دریچے کھولے کہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آج بھی دل و دماغ کو تازہ کررہے ہیں۔ کاش ٹیپ ریکارڈر ہوتا اور یہ داستانیں جو آپ کے ساتھ ہی مٹ گئیں زندہ جاوید کرلی جاتیں۔

یہاں اس اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اور آپ مشاعرہ کے آداب سے واقف ہوجائیں کہ کس طرح ایک استاد کا کلام سب سے آخر میں سنا جاتا تھا اور آداب محفل کو کس طرح ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا۔ یہ نہیں کہ آج کے مشاعروں کی طرح جسے چاہے بلالیں اور جسے چاہا بام پر چڑھادیا۔ مشاعروں کے انعقاد کا بھی ایک ڈھنگ، ایک طریقہ ہوتا تھا۔ رضا صاحب آگے لکھتے ہیں

"جب آپ کلام سنانے لگے تو میں نے عرض کیا جناب کوئی مطبوعہ کلام نہ سنائیں۔ یعنی ایسے اشعار ارشاد فرمائیں جو بادۂ سرجوش اور جنون ہوش میں شامل نہ ہوں۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا اور کچھ سوچ کر سنانا شروع کیا مگر میں نے مداخلت کی اور عرض کیا۔ یہ اشعار مجھے یاد ہیں۔ آپ نے فلاں خط میں تحریر فرمائے تھے۔ آپ نے دوسری غزل شروع کی وہ بھی آپ اپنے خط میں مجھے بھیج چکے تھے، میں نے پھر عرض کیا، آپ

نے ایک اور غزل شروع کی وہ بھی مجھے مل چکی تھی یہاں تک کہ اس کے چند اشعار بھی میں نے یادداشت سے عرض کر دیے۔ آپ خود تعجب کرتے تھے کہ اتنا سارا کلام آپ اپنے قلم سے لکھ کر مجھے ارسال کر چکے ہیں، ہنس کر فرمایا "ہزاروں کوس دور رہتے ہو مگر دل سے دور نہیں"۔

درج بالا اقتباس سے استاد اور شاگرد کے حدسے باہمی کا تعلق صاف ظاہر ہوتا ہے، جہاں شاگرد کو استاد محترم کی غزلوں کی غزلیں از بر ہیں، وہیں استاد نے اپنا سارا اچھا کلام شاگرد کو روانہ کر دیا ہے اور بقول خود "ہزاروں کوس دور رہتے ہو پر دل سے دور نہیں"۔

شاگردوں کے کلام پر تنقید ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ دل گرفتہ ہوتے تھے مگر اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ رضؔا صاحب کے تیسرے مجموعہ کلام "شاخ گل" پر ایک صاحب نے تبصرہ کیا اور عروض سے ناواقفیت کی بناء پر غزل کے درست اوزان کو غلط ٹھہرا دیا۔ اور جب رضؔا صاحب نے اس کا مدلل جواب دیا تو مدیر نے یہ جواب شائع نہیں کیا۔ جب رضؔا صاحب کی حضرت جوشؔ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے تذکرہ چھیڑ دیا۔ لکھتے ہیں "اب جبکہ اتنا بڑا عروضی استاد مجھ سے سرگرم گفتگو تھا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں آپ سے مزید سند کے لیے یہ سوال نہ اٹھاتا"۔ استادی قبلہ نے سنتے ہی فرمایا "ایک طرف تو کہتے ہو وقت کم ہے دوسری طرف تمام وقت مفعول فاعلن میں صرف کر دینا چاہتے ہو۔ تم یہ سب کچھ بخوبی جانتے ہو تضیع اوقات سے کیا فائدہ، وقت پڑنے پر خود ہی بتا لینا"۔

یعنی استاد شاگرد کو سند عطا کر رہا ہے کہ تم خود عروض سے اچھی طرح واقف ہو اور ان اعتراضات کا جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہو پھر مجھ سے پوچھنے سے کیا حاصل۔ حضرت جوشؔ ملسیانی کا انتقال ۲۷ر جنوری ۱۹۷۶ء کو ہوا رضؔا صاحب نے تعمیے کے ساتھ درج ذیل تاریخ نکالی۔

دے گیا داغ آخری شاگرد داغؔ — اب سخن دانی کفن بر دوش ہے
بوئے گل نے پر ہے مرگِ جوشؔ پر — زلفِ عنبر بار بارِ دوش ہے
بے حواسی کے ہیں عالم میں ادیب — ہوش میں اب کون اہل ہوش ہے
مصرعِ استاد ہو تاریخِ غم — تو بھی شاگردِ جنابِ جوش ہے
لکھ دے بیل رنج کے ساتھ اے رضؔا — طور کا شعلہ بھی اب خاموش ہے

۱۹۷۶ = ۱۶۲۳ + ۳۵۳

رضؔا صاحب کی زیر تبصرہ کتاب میں دو مضامین شامل ہیں۔ کالی داس گپتا رضؔا کا مضمون "استادی قبلہ جوش ملسیانی" اور حضرت عرش ملسیانی کا مضمون "میرے والدِ محترم" دونوں مضامین معلوماتی ہیں جس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت بڑھ گئی ہے۔ دونوں مضامین میں حضرت جوش ملسیانی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حضرت جوش نے اپنے ان خطوط میں کئی جگہ شاگرد کے کلام پر اصلاح دی ہے۔ مثلاً ایک شعر کی اصلاح دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

تری محفل جو آیا نہایت شوق سے آیا   مگر آکر کوئی جوش جوش نہ لوٹا واہ ری دنیا

حضرت جوش نے مصرع ثانی میں لوٹا کی جگہ پلٹا بنا دیا اور لکھ دیا لوٹنا غزل کی زباں نہیں ہے۔ عامیانہ ہے فصحا پلٹنا لکھتے ہیں۔

ایک خط میں لکھتے ہیں

"بے حد" محبت نامہ پہنچا اور غزل بھی ملی مگر ان قافیوں میں ایطا ہے۔ یا تو کریں مریں ہوں یا کہیں نہیں رہیں، یہیں قافیے ہوں، کی پابندی سے یاد میں کریں، کے ساتھ دیں، لیں، آفتیں، وغیرہ قافیے ہوں۔ ایک ایک دو دو شعر چھوڑ کر رہیں دیں آجائے تو مضائقہ نہیں، کہ، وہ، نہ، چہ (تسمیں) یہ سب بامعنی ہیں، انہیں دور کر کے باقی ٹکڑا بے معنی رہنا چاہیے۔ یا تو بے معنی ہوں یا کوئی ایک اس لیے غزل کو چھوڑنا پڑا۔

ایک دوسرے شعر میں لکھتے ہیں

"تم کو خبر نہیں میری دنیا کہاں پہ" کہاں کے بعد 'پہ' محض حشو ہے۔ یہاں پہ، کہاں پہ، جہاں پہ، یہ پہ ایک مرض ہے جو دنیا کی طرح پھیلتا جاتا ہے۔ لفظ یا بھی یہاں کھٹکتا ہے۔ غزل کہنے کا محل نہیں۔

حضرت جوش ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں

"ساقی فاعل میں درست ہے، مفعول کی صورت میں ثقالت پیدا ہوتی ہے، مستعمل دونوں طرح ہے، مگر بہتر صورت یہ ہے۔

"آگئی موج دل ساقیٔ دریا دل میں "

حد، تشدید سے بھی لکھتے ہیں جیسے

"حدِّ نظر سے دور ہے ان کی حریم ناز "

کئی دو حرفی لفظ اس طرح آجاتے ہیں   مرا ارف مارید رپے تزاع

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

خمِّ کمند (تشدید) بھی مستند ہے۔ قدِّ رعنا۔ قدِ رعنا دونوں درست ہیں۔

"جو دل کشتی ہے تو پانی ہے دنیا" یہ دونوں شعر قطعہ کہے جائیں گے۔ قطعہ میں اگر رباعی کا وزن نہیں ہے تو خواہ پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ ہو، خواہ صرف دوسرے اور چوتھے مصرعے میں مضمون مسلسل وہ دونوں صورتوں میں قطعہ ہے۔

اس مصرعہ میں آپ نے کاف علامت لکھا تھا۔ یہ فارسیت کی وجہ سے میں ترک کر چکا ہوں۔ وجہ ترک بالخصوص یہ ہے کہ اردو کی بول چال میں کہیں نہیں آتا ہے۔ میں بھی اس علت میں ایک مدت تک گرفتار

رہا ہوں۔ مگر جہاں جہاں اسے استعمال کیا تھا ان تمام مقامات میں اب ترمیم کردی ہے۔ حضرت نوح ناروی بھی ترک پر متفق ہو چکے ہیں۔ کاف علت وہ ہوتا ہے جس کے معنی کیونکہ ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

دوسرا مصرعہ یوں ہو سکتا تھا

اندھیرے میں تو سایہ بھی

نثر کی مثالیں میں دلی نہیں جاسکوں گا کہ بیمار ہوں۔
"میں کوئی امداد نہیں کر سکتا کہ خود طالب امداد ہوں"۔

جب اس طرح کوئی نہیں بولتا تو پھر یہ کاف نظم میں کیوں آئے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ لفافہ پہنچا۔ یاد آوری کا شکریہ، عید الفطر ہے تو باعث توقیر ہے تو، افسوس ہے کہ اس مصرع کی ناموزونی کو آپ نے محسوس نہیں کیا۔ میں اسے افتاد طبیعت ہی کہہ سکتا ہوں۔ عید۔ ال۔ فطر اس طرح پڑھا جائے تو تقطیع درست ہے۔ مگر صحیح تلفظ عیدل فطر ہے جو نہ تو فاعلات میں آتا ہے نہ فعلات۔ مجھے سخت تعجب ہے کہ آپ نے اسے فعلات میں کس طرح شمار کیا۔ اس کی جگہ مژدۂ عیش کیا جاسکتا تھا۔ اس بحر میں عید الفطر آ ہی نہیں سکتا۔

غرض اس کتاب میں مختلف اصلاحیں دی گئی ہیں اور الفاظ کے صحیح تلفظ اور استعمال پر جابجا بحث کی گئی ہے اور انہیں مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔ جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ اس کتاب کا ادب کے ہر طالب العلم کے لیے مطالعہ ناگزیر ہے۔

حضرت جوش نے جن غزلوں پر اصلاح دی ہے اور ترمیم کی ہے وہ غزلیں مکمل نہیں ہیں بہتر ہوتا ہے کہ جناب رضا یہ غزلیں حواشی میں درج کر دیتے تاکہ قاری یہ دیکھ سکتا کہ استاد مکرم نے کیا تصحیح فرمائی ہے (یہ اور بات ہے کہ اس سے کتاب کی ضخامت بڑھ جاتی) اور اصل شعر کیا تھا۔ اس سے کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہو جاتا۔ بہر حال اس کتاب کا ہر لائبریری اور ادباء اور شعراء کے ہاں ہونا لازمی ہے۔

☆☆☆

مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا
عرش ملسیانی

یہ دیدہ زیب کتاب بڑے عمدہ دبیز کاغذ کے ۱۷۶ صفحوں پر محیط ہے۔ کتابت اور طباعت اعلیٰ درجے کی ہے۔ اس میں حضرت جوش ملسیانی کے ۵۵ خط شائع کیے گئے ہیں۔ جس میں زباں و فن کے نکات بھی ہیں۔ شاگرد کے کلام پر اصلاحیں مع توجیہ بھی ہیں۔ جوش ملسیانی مرحوم کو اپنے اس ذہین شاگرد پر بڑا فخر ہے۔ رضا صاحب آسانی سے ہر اصلاح کو قبول نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی استاد پر بھی اعتراض کرنے کی جسارت کر بیٹھتے تھے۔ یہی بات تھی جو استاد کو شاگرد کا گرویدہ بناتی تھی۔

جوش صاحب نے رضاؔ صاحب کی تربیت بھی بڑی کشادہ دلی سے کی۔ یہاں کچھ مثالیں پیش کرنی دلچسپی کا موجب ہوں گی۔

ساقی فاعلن ہی درست ہے۔ مفعول کی صورت میں ثقالت پیدا ہوتی ہے۔ مستعمل دونوں طرح ہیں مگر بہتر صورت یہ ہے

"آگئی موج دل ساقیٔ دریادل میں"

حد تشدید سے بھی لکھتے ہیں۔ مثلاً حدِّ نظر سے دور ہے ان کی حریم ناز

کئی دو حرفی الفاظ اسی طرح آجاتے ہیں۔ مرا ارف بارید بر پرساں فراغ (سعدی)

خوشتر آں باشد کہ سِترِ دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

خم کند بہ تشدید بھی مستند ہے۔

مشاعرہ کا صحیح تلفظ معاملہ مشاہدہ وغیرہ کے وزن پر ہے۔ مناظرہ اسی قبیل سے ہے۔ عروض میں اس کا وزن مفاعلن ہوگا۔

فعولن مفعولن سالم بحر میں ایک مصرع فعول پر ختم ہو تو یہ جائز ہے مگر لمغائرت کی وجہ سے میں نے اس قسم کی عروضی رعایت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسی قسم کی بعض اور مراعات بھی ہیں۔ مثلاً

قفس کو جانتے ہیں ہم تو آشیاں اپنا

اس زمیں میں یہ مصرع بھی بلحاظ عروض صحیح ہے۔

سوائے آتش ہے کون ہم رماں اپنا

یا اے سیر ترا ناں جویں خوش نہ نماید

اس بحر میں سعدی کا یہ مصرع

آپ نے ایک جگہ 'برائے مہربانی' لکھا ہے۔ 'براہِ مہربانی' لکھنا چاہیے۔

"مت" بالاتفاق متروک ہے۔ فصحائے متاخرین استعمال نہیں کرتے۔ "نے" حرفِ نفی بھی بوجہ فارسیت قابلِ ترک اور بلا شبہ متروک ہے۔ دونوں کی جگہ "نہ" جس کی آواز صرف ن متحرک کی ہے، بولتے ہیں، فصحا کی زبان پر بول چال میں مت جانا کی جگہ نہ جانا مقبول ہے۔ گویا یہی دستور ٹکسالی ہے۔

ص ۷۶ چاہت، وصلت، رنگت میں تے زائد اور قابلِ ترک ہے۔ چاہت میں تو وہ بالکل فتیح ہے کیونکہ چاہ ہندی لغت ہے۔ اس کے ساتھ تے بقاعدہ فارسی ہرگز نہیں آسکتی۔ زائد کا تو سوال الگ رہا۔ صرف چاہ کا مفہوم وہی ہے"۔

رضا صاحب ایک لمبی مدت تک نیروبی (مشرقی افریقہ) میں مقیم رہے۔ اور وہیں سے آپ نے استاد سے سلسلۂ اصلاح جاری رکھا۔ حیرت کا یہ مقام ہے کہ رضا صاحب نے اس دور دراز فاصلے سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اکتسابِ فن کیا۔

ان خطوں میں جابجا جوش صاحب نے جو اشعار اپنے یا اساتذہ کے ذہن میں آئے، رضا صاحب کے تفنن کے لیے لکھے ہیں لیکن رضا صاحب نے انھیں محض تفنن تک ہی محدود نہیں سمجھا بلکہ ان سے بڑا فیض اٹھایا۔ جابجا مشاعروں کا ذکر اور دوسری ادبی کیفیتوں کا حال بھی ان خطوں میں لکھا ہے جس سے کتاب کی افادی حیثیت بڑھ گئی ہے۔ اپنے خواجہ تاشوں کا ذکر خاص طور پر اُن کے کلام کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً مہر گوالیاری، نوح ناروی، بیخود دہلوی وغیرہ۔ امیر مینائی کے شاگردوں کا بھی ذکر بڑے احترام سے فرمایا ہے جن میں جلیل مانکپوری کے علاوہ ان کے بیٹے اختر مینائی بھی شامل ہیں۔ اس کتاب میں رضا صاحب نے جگہ جگہ حواشی سے بہت سی باتوں کی توجیہ و توضیح فرمادی ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ پڑھنے کی چیز ہے۔

ایک بات اس کتاب سے بہت نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت جوش ملسیانی جہاں رموزِ فن پر قدرت رکھتے تھے وہاں دیانت میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ رضا صاحب نے ان سے متواتر ان کی تصنیفات یا دوسری ادبی کتابیں طلب فرمائیں اور آپ نے پیسے پیسے کا حساب چکایا۔ ان شعراء کی طرح نہیں جو شاگردوں سے کتابوں کے چوگنے دام وصول کریں اور تحفے تحائف لیں۔

بہرحال اس کتاب کو شائع کر کے رضا صاحب نے ایک بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے اور حضرت جوش ملسیانی کی زندگی سے متعلق بھی بہت سی روشنی پڑتی ہے۔ جوش صاحب کسی عزیز کے شعر سے خوش ہوتے تھے تو دل کھول کر اس کی داد ہی نہیں دیتے تھے بلکہ جہاں موقع ملتا اس شعر کو اچھالتے بھی تھے۔ مثال کے طور پر ساحر جالندھری کا یہ شعر انھیں بہت پسند تھا

مرنے کے بعد پرسشِ اعمال بھی ضرور
یا رب سرائے موت گئی کس حساب میں

اپنے ہم عصروں اور دوستوں کی بھی حتی الامکاں مدد کرتے تھے۔

جناب رضا صاحب کو تحقیق کا بھی جنون ہے۔ چنانچہ ایک بار وہ دلگیر لکھنوی کے سلسلے میں اس بات پر بضد ہوگئے کہ دلگیر نے اسلام کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے خاص کر لکھنو کے چعادری نقادوں نے یہ کہا کہ دلگیر کو میاں دلگیر کہا جاتا تھا۔ میاں کے لفظ کی تشریح کرتے ہوئے جوش صاحب نے رضا صاحب کو ایک تفصیلی خط لکھا جس کا ذکر ناگزیر ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو

"اخلاص پرور عزیز القدر

۱ یاد آوری کا شکریہ۔ میاں عام بول چال میں مستعمل ہے مثلاً میاں ہوش کی باتیں کرو۔

۲ ناخواندہ آدمی کسی بھی پیر مرد کو میاں کہہ لیتے ہیں مثلاً بڑے میاں کیا کرتے ہو۔

۳ میاں مکتب کے ملا کو بھی کہتے ہیں۔ یہ بچوں کی زبان میں شامل ہے۔

۴ برابر اور چھوٹوں کے لیے اس لفظ سے مخاطبہ کرتے ہیں۔ میر تقی میر کا مصرع

میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

۵ میاں، شوہر کے معنی میں بھی آتا ہے۔

۶ کسی ہندو شاعر کے نام کے ساتھ محاورے میں بول سکتے ہیں۔

۷ پنجاب میں ہندو راجپوتوں کے نام میں بھی شامل ہے، مثلاً میاں جیت سنگھ

زیادہ دعائیں"۔

رضا صاحب نے یہ کتاب زر کثیر صرف کر کے شائع کی ہے۔ یہ اُن کی استاد اور اردو زبان سے محبت پر دال ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی اور اہل ذوق اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

☆☆☆

منشوراتِ جوشؔ ملسیانی

اعجاز سیمابی

اردو شاعری میں پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی کا پایہ نہایت مستند ہے۔ جوش صاحب کا درجہ استاد صرف ان کے حضرتِ داغ دہلوی سے شرف تلمذ کی وجہ سے نہیں ہے اس دستار فضیلت کو خود قدرت نے ان کے سر باندھ دیا ہے۔ اس لیے کہ ان کا تمام تر علم وہبی تھا۔ ابھی تک یہ محض خیال تھا اور اس ایک بنیاد پر کہ وہ پنجاب کے ایک معمولی دیہات میں بیٹھ کر کس طرح اردو شعر کے نازک نوک پلک سے واقف ہوگئے۔ ان کی سوانح سے یہ ضرور عقدہ کھلتا ہے کہ وہ بیس روپے کی معمولی تنخواہ سے دس روپے صرف کتابوں کی خرید پر خرچ کرتے تھے۔ ٹھیک ہے۔ اس سے مطالعہ سے ان کے فن میں نکھار آیا۔ لیکن ہمیں تو حیرت اس وقت ہوئی جب ہم کتاب سے بھی آگے ان کی معلومات کے خزانے کو دیکھتے ہیں اور یہ صرف نظم کی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ نثری میدان میں وہ ایسی ایسی گل افشانیاں کر گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

منشوراتِ جوشؔ جو جوش صاحب کے اٹھارہ مضامین پر مشتمل ہے، اس بات کا کامل ثبوت ہے کہ ان کا علم یقیناً وہبی تھا۔ اسی وجہ سے ان میں وہ انکسار پایا جاتا ہے جو اس درجہ کے لوگوں کی فطرت نہیں ہوتی۔

جوشؔ ملسیانی اردو املا پر حاوی تھے۔ اس کا واضح ثبوت اس کتاب کے پہلے تین مضامین خصوصاً پہلا مضمون "املا کی خاص غلطیاں" پڑھ کر ہوتا ہے۔ وہ اِس اور اُس اور اِن اور اُن کے فرق کو بھی اپنے طور پر جانتے تھے۔ کونسے الفاظ املا میں ملا کر لکھنے چاہئے، کون سے نہیں اور کیوں، یہ جوشؔ صاحب کی خود اپنی معلومات کا وسیع اور مفید خزینہ ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب کی "اردو املا" کی کتاب میں بھی اہم راز اور عام فہم و روز مرہ کی املا کی غلطیوں کا انکشاف نہیں کیا گیا ہے جو منشوراتِ جوشؔ ملسیانی کے مضامین میں واضح کیے گئے ہیں۔

"نہیں کے بعد ہے"، اڑنا، اڑانا، اہم مضامین ہیں۔ شعر میں تخفیف الفاظ کا طلسم بھی ایک مضمون سے ظاہر ہے۔ کھانا مصدر کے محاورات پیر اردو شاعری کے بارے میں چند ایسے نادر حقائق منشورات میں ملتے ہیں جو منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ آج اردو لسانیات کے سلسلہ میں ہم حسن الفاظ و محاورات یا روزمرہ بیان کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں ان کے بارے میں یہ مضامین مفید ہیں۔

اردو املا کی غلطیاں جو منشورات کا پہلا مضمون ہے اسے پڑھ کر یہ پردہ اٹھنے لگتا ہے کہ آخر آج کتنے ادیب و شعرا صحیح املا لکھتے ہیں۔

منشورات میں چند شعراء مثلاً مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی، بے خود بدایونی، بے خود دہلوی اور نوح ناروی پر عمدہ معلوماتی اور مفید مضامین لکھے گئے ہیں۔ اور ان مضامین میں ایسے ایسے گوشے واضح کیے گئے ہیں جو ان

شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔ دوسرے ادباء کے مضامین کی رسائی سے آسماں کی طرح بلند ہیں۔ ذوق سے باالصافی ایک ایسا مضموں ہے کہ ہم ذوق کے درجہ کو پہچان جاتے ہیں۔

ایک مضموں بعنواں "کبھی ہم بھی نئے نئے تھے" نہایت دلچسپ بیانیہ انداز بھی سوانحی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے خود مصنف کی زندگی کے بعض امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اس مضموں کے بارے میں پیش لفظ میں جناب کالی داس گپتا رضا نے بتایا کہ یہ ۱۹۴۰ء میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا۔

جناب رضا نے اپنے استاد جوش ملسیانی کے بارے میں پیش لفظ کے آخر میں کہا ہے کہ "ان مضامین کا مصنف ایک ایسا صاحب کمال ہے کہ بر اعظم ہند و پاک میں ان کے ایسے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں"۔ مجھے اس سے کلیتاً اس اضافے کے ساتھ اتفاق ہے کہ اب ان انگلیوں پر گنے جانے والوں کے شمار کرنے والوں کی بھی کمی ہے۔ کتنے ایسے ہیں جو ان انگلیوں پر گنے جانے والوں کے تحریرات کو عروس شعر و ادب کی آنکھوں کا سرمہ سمجھ کر محفوظ رکھتے ہیں۔ اب تو ان کے قدر داں بھی گنتی ہی کے ہیں۔ اور ان میں وِل پبلی کیشنز کے ذمہ داراں شامل ہیں جنھوں نے یہ کتاب بطور اضافہ زباں و ادب میں شامل کی ہے۔

☆☆☆

بابِ نظم

نظم سمندر سے

عبد اللہ کمال

۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۰ء تک کی بیشتر نظمیں غیر مطبوعہ ہیں اور رضا صاحب کی شاعرانہ بیاری پر شکوہ کہاں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ رضا صاحب کی نظمیہ شاعری کا Turning Point یہی نظمیں ہیں۔ ان نظموں کی ہیئت، اسلوب، مزاج، آہنگ، فضا، لفظیات اور لب و لہجہ سے نہ صرف ان کی تازگی کا احساس ہوتا ہے، بلکہ اقبال اور جوش کے بعد اردو نظموں میں جو ایک واضح فرق پیدا ہوا ہے، وہ ان نظموں میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ "لاشعور سے شعور تک"، "شب نشیں"، "بے کتابی کا ایک لمحہ"، "پانچ بیعد" اور "رقص" جیسی نظمیں سیاسی اور قومی مسائل سے مختلف بھی ہیں اور بلند بھی۔ موضوع و مواد کے لحاظ سے ان کی حیثیت دستاویزی نہ سہی، مگر انفرادی سوچ، خود آگہی، دانشورانہ تنہائی اور احساسِ جمال کے تناظرات میں ان کی فنی اہمیت اور تخلیقیت کہیں زیادہ ہے۔ ان نظموں میں شاعر بیرونی سطح پر محض ہاتھ پانو مارنے کے بجائے "زیر موج تہہ نشین" کے داخلی تجربوں سے بھی آشنا ہوتا ہے اور اندرون کے خطرات سے جھوجھتا، اُن سیپوں تک رسائی حاصل کرتا نظر آتا ہے، جن کے اندر گوہر آب دار بند ہیں۔

☆☆☆

کالی داس گپتا رضا کی نظم ... ایک مختصر جائزہ

ظہیر غازی پوری

اس جہاں آب و گل کی تمام تر رنگا رنگی انسان کے عقل و شعور سے عبارت ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں انسان نے وہ حیران کن کارنامے انجام دیے ہیں جن پر ہر عہد کے لوگ انگشت بدنداں رہے ہیں۔ تکنیک و سائنس کا شعبہ ہو، علم و تجربہ کی دنیا ہو، کھیل کا میدان ہو یا شعر و ادب کی وسیع کائنات، سب کی سب محیر العقول کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ ایک توجہ کی نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ سائنس و ادب کا ارتقائی سفر ساتھ ساتھ اور شانہ بشانہ آگے بڑھتا ہے۔ ان دونوں ہی کی کوئی منزل آخر نہیں ہے، اس راہ میں تو ملتے نہیں سنگ میل تک! اس کے باوجود شعر و ادب پر دنیا بھر میں سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ یہی ہر دل عزیز بھی رہا ہے اور اسی کے ذریعہ شعور بالیدہ ہوا ہے۔ علم اپنے عروج تک پہنچا ہے اور ہر نسل کے لیے ذہنی آسودگی فراہم ہوئی ہے۔ تاریخ ادب پر ایک طائرانہ نظر بھی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس میدان کارزار میں بے شمار فن کاروں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ کسی نے صرف ایک صنف کو اپنے کمال سے نام عروج تک پہنچایا اور بعض شخصیتوں نے ہمہ جہت ادبی کارنامے انجام دے کر تاریخ ادب میں اپنی جگہ محفوظ کرالی۔ ایسی ہی مایہ ناز، ہمہ جہت عبقری شخصیت کالی داس گپتا رضاؔ کی ہے جو بنیادی طور پر شاعر ہیں مگر غالبیات پر بے مثال تحقیقی کام کر کے انھوں نے بلند قامت محقق کا درجہ بھی حاصل کرلیا۔ انھوں نے تنقید بھی لکھی، تبصرے جائزے، انشائیے، افسانے اور مضامین بھی لکھے۔ انھیں تاریخ گوئی اور عروض دانی سے بھی شغف رہا اور موسیقی سے بھی۔ غزل اور رباعی کو انھوں نے امتیازی وقار بخشا اور نظموں کے ذریعہ بھی انھوں نے اپنے تجربوں کے روشن نقوش مرتسم کیے جن پر وقت کی گرد نہ اب تک جم سکی ہے اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے۔

میں کالی داس گپتا رضاؔ صاحب کی نظم پر یہاں مختصر سی گفتگو کروں گا۔ جب لفظ شاعری زبان پر آتا ہے تو تمام شعری اصناف دائرۂ نظر میں ہوتی ہیں اور جب صرف نظم کا تصور ہو تو ماضی بعید سے عہد رواں تک مختلف ہیئتوں میں لکھی جانے والی تخلیقات کا ادراک ہوتا ہے۔ جس میں پابند، آزاد، معریٰ اور نثری نظم شامل ہے۔ اپنے طویل مقالہ "نظم کی دریافت" میں حامدیؔ کاشمیری نے دو مختلف مقامات پر لکھا ہے کہ

"نظم میں موسیقیت بھی ایک لازمی عنصر کا کام کرتی ہے۔ موسیقیت نظم کی تخیلی فضا کو طلسم آفریں بناتی ہے اور شاعر مناسب و موزوں اور مترنم لفظوں کا گہری ریاضت سے شعوری طور پر انتخاب کرتا ہے، انھیں ترتیب دیتا ہے"۔

گویا نظم مترنم لفظوں اور موسیقانہ طرز اظہار سے عاری ہو تو لطف و تاثر دونوں میں کمی آجاتی ہے۔ حقیقتاً نظم ایک بیان ہے جو شعری تلازموں سے آراستہ ہوتا ہے۔ اس لیے جہاں شعریت اور لفظی نغمگی ہوتی

سے وہاں ہر حال موسیقیت اور غنائیت بھی پائی جاتی ہے۔ نظم کے اس وصف خاص کے کائل داس گپتا رضا ہمیشہ قائل رہے۔

"رضا صاحب شاعری میں غنائیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ شاعری ان کی نظر میں تب تک شاعری نہیں جب تک وہ نغمہ کی زبان نہ بن جائے۔ (مدیر فتح پوری جہاں گپتا رضا)

رضا صاحب کی نظم میں کس قدر غنائیت ہے، اس کا اندازہ درج ذیل دو نظموں کے ایک ایک بند سے ہو جائے گا۔

☆ سفر خود آگہی تو ہے
فنا بقا یہی تو ہے
یہ آفتاب کا سفر
یہی جہاں کا راہبر
نہ وہ رُکا نہ تم رُکو
گھٹاؤں میں ہواؤں میں
خلاؤں میں ملاؤں میں
نہ وہ جھکا نہ تم جھکو
بڑھے چلو بڑھے چلو
بڑھے چلو بڑھے چلو

☆ اے زندگی بتا دے
یہ خواہش نمو کیا
کھلنے کی آرزو کیا
گلزار رنگ و بو کیا
ہم کیا ہیں اور تو کیا
اے زندگی بتا دے
(سوال)

ان دونوں اقتباسات کو کئی بار پڑھیے، موسیقیت اور غنائیت کی دل پذیری زیادہ محسوس ہوگی۔ دونوں نظموں کی بحریں بھی مترنم ہیں اور ترنم ریز کیفیت پیدا کرنے والے لفظوں کے استعمال نے اسے کچھ زیادہ ہی پرکشش بنا دیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ نظم ایک شعری بیان ہے۔ ان تجربوں اور مشاہدوں کا بیان جو شعور و لاشعور میں محفوظ ہوتے ہیں، ان حالات کا بیان جس سے شاعر متصادم ہوتا ہے۔ ماحول، معاشرہ اور کائنات میں

ہلچل پیدا کرنے والے محرکات کا بیان جو شاعر کے وجود کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ نظم خود احتسابی بھی ہے اور دنیا کے منظر ناموں کی عکس تابی بھی۔ نظم میں شاعر کا نظریہ، مزاج اور عقیدہ بھی پھول میں خوشبو کی طرح رچا بسا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ دیکھنا لازمی ہے کہ اپنی نظموں میں رضا صاحب کس کس رنگ روپ میں سامنے آتے ہیں۔ اس کا اندازہ بعض مشاہیر اہل قلم کی آراء سے بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ آیئے دیکھیں

"ان کی (رضا صاحب کی) شاعری پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ جس وادی کو انھیں چھلنی پاؤں، لخت لخت سینہ اور زخمی ہاتھوں سے طے کرنا چاہیے تھا اسے وہ عصائے سخن سے پار کر گئے"۔ (وارث علوی)

"رضا کی نظموں میں قومی وقار، وطنی محبت، بلند انسانی کردار اور دردمند دل کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مذہبی رواداری، وسعت قلبی، انسان دوستی اور حق و صداقت کا ان میں ایک بیباک اظہار ہے۔" (اعجاز صدیقی)

"ان کا (رضا صاحب کا) ذہن ہر طرح کے مذہبی تعصب سے مبرا ہے۔ وہ جس جذبے، عقیدت اور گہرائی سے ہندو دھرم پر نظمیں لکھتے ہیں، اسی جذبے، عقیدت اور گہرائی سے نعت، سلام اور منقبت بھی پیش کرتے ہیں"۔ (طالب کاشمیری)

"رضا صاحب نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہر صنف کے تقاضوں سے عہدہ بر آ ہونے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں ان کے کلام کے مطالعے سے محبت وطن، انسان دوست اور خلوص و سچائی پر ایمان رکھنے والے نیک دل انسان کا کردار سامنے آتا ہے اور یہ سب ایسے اوصاف ہیں جن کی قدر کی جانی چاہیے"۔ (مخمور سعیدی)

"جس طرح ان کی (رضا صاحب کی) غزلوں نے محسوس طور پر اپنی نئی آواز، نے اسلوب اور نئے لب و لہجہ کا خیر مقدم کیا ہے، اسی طرح نظمیں بھی بتدریج اس تبدیلی سے گزری ہیں۔ نئے موسم و مناظر، نئی امیجری اور نئی فکری جہتیں لاشعوری طور پر ان کی نظموں کے بھی ہیئت و آہنگ پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ غزلوں میں بعد امکانی سے زیادہ ابعاد زمانی کا احساس ہوتا ہے اور نظموں میں زمانی مکانی دونوں ابعاد واضح ہیں"۔ (عبداللہ کمال)

یہ آراء ہمیں عرفان کراتی ہیں کہ کالی داس گپتا رضا کی نظم نگاری پر مشاہیر ادب عہد بہ عہد اپنی رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور ان آراء سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ زندگی کی سخت ترین منزلیں بھی انھوں نے اعجاز سخن کے سہارے طے کی ہیں۔ انھوں نے قومی وقار، حب الوطنی، انسانی اقدار، دردمندی، مذہبی رواداری اور حق و صداقت کی ایسی شمعیں روشن کی ہیں جو طوفان خیز ہواؤں میں بجھنے کی بجائے اپنی لو اور بڑھا لیتی ہیں۔ وہ مذہبی تعصبات کے کبھی قائل نہیں رہے۔ وہ خلوص، یگانگت اور ایمان داری کی بے مثال اقدار کا جیتا جاگتا شاہکار تھے اور ان کی نظمیں نئی امیجری اور نئی فکری جہتوں کی آئینہ دار ہیں۔ شاعری چاہے کسی صنف و ہیئت میں کی جائے وہ محض نثری بیان نہیں ہوتی۔ وہ شعریت کے کسی نہ کسی تقاضے کو ضرور پورا کرتی ہے۔ ارنلڈ نے

نظم و شعر کو "تنقید حیات" اور زندگی کا ترجمان قرار دیا تھا مگر اس میں تخیل اور شعری رمز و کنایہ کا عمل دخل لازمی ہوتا ہے۔

ہم آج کی نظم میں اسلوب کی تازہ کاری، لفظوں کی نادرہ کاری، استعارے اور علامت کی طلسماتی فضا اور احمال و کیفیت کی خوبیاں تلاش کرتے ہیں۔ جو شعر و نظم، ان اوصاف یا ان میں سے کسی بھی وصف اور خوبی سے مبرّا نہ ہو، اسے اہمیت نہیں دیتے یا زیادہ سے زیادہ ایک منظوم نثر کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ یہ شعری صفات نہ تو ترقی پسندوں کی پیدا کردہ ہیں اور نہ جدیدیت نوازوں کی۔ شعری صفات کا قائل تو مشرقی نقاد آسد ورد ھن بھی تھا جو صرف قافیے جوڑنے کی بجائے شعر میں صنعت گری اور لفظ کے تخلیقی استعمال پر زور دیتا تھا اور ارسطو نے تو صاف لفظوں میں لکھا کہ

"شعر حقیقت میں وہی ہیں جن میں اشیاء اصلی صورت میں جلوہ گر نہ ہوں بلکہ اصل کے مماثل ایک حسن کارانہ شکل میں پیش کی جائیں"۔

یہ حسن کارانہ شکل ہی دراصل استعاریت اور علامتیت اور شعری تلازمات ہیں جو مختلف رنگ و روپ میں نظم کی دل آویزی بڑھاتے ہیں اور اسے غور و فکر کے لائق بناتے ہیں۔ آتش نمرود میں کود پڑنا یا آگ کے دریا میں ڈوب کے جانا وہ شعری تلازمے ہیں جو ضرب المثل بن جاتے ہیں۔

ابتدا میں موسیقیت اور غنائیت کے حوالے کے طور پر میں نے دو نظموں کے دو مختصر اقتباسات نقل کیے ہیں۔ پہلی نظم کے پہلے مختصر سے مصرعہ "سفر خود آگہی تو ہے" غور و خوض کی دعوت دیتا ہے۔ ہمارے یہاں زیادہ سے زیادہ سفر کرنے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ سفر ہمارے علم، تجربہ اور آگہی میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ اب صرف "خود آگہی" پر توجہ مرکوز کیجئے۔ یہ اپنے آپ کو جاننے کی کوشش ہے یا خود احتسابی کا عمل۔ کارزار حیات میں ہر باشعور انسان کو قدم قدم پر ان دونوں کا جائزہ لینا پڑتا ہے ورنہ بے سمتیت (ذہنی و فکری) حاوی ہو جائے گی۔ اس بند میں "آفتاب" مسلسل سفر اور عزمِ بے پناہ کا استعارہ ہے جو آگے اور آگے بڑھنے کی قوت اور جسارت عطا کرتا ہے۔ دوسری نظم میں زندگی سے کیا گیا ہر سوال معنی خیز ہے۔ خواہش نمو کیا ہے؟ کھلنے کی آرزو کیا ہے؟ گلزار رنگ و بو کیا؟ ہم کیا اور تو (یعنی زندگی) کیا ہے؟ خواہش نمو صحرا کی سنگلاخ زمیں کی یاد دلاتی ہے جس میں بے پناہ قوت نمو موجود ہوتی ہے۔ کھلنے کی آرزو کے پس پردہ مرجھانے اور بکھر جانے کی کیفیت کا اظہار ہے جو بذاتِ خود ایک اٹوٹ سلسلہ ہے۔ اپنی تشکیل کا خمیازہ بھگتنے کے لیے پھول کھلتا ہے اور انسان اپنی عمر کی منزلیں طے کرتا ہے۔ گلزار رنگ و بو ہم اور زندگی سب کے سب تلازمات شعری ہیں۔ کائنات تشکیل ہوئی تو گلزار نے اسے سنوارا، اور رنگ و بو نے اسے زینت بخشی۔ ہم اسی کائنات ہیں۔ خدا کے بعد عظیم بھی ہیں۔ کالی داس گپتا رضا نے علامہ اقبال کے حوالے سے لکھا ہے کہ وید کے برعکس قرآن کائنات کو حقیر اور انسان کو عظیم (اشرف المخلوقات) قرار دیا ہے۔ اب رہی زندگی کی بات تو اس کی تفسیر و توضیح شعراء

فلسفی، دانشور اور صوفیاء کرام نے اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ زندگی عناصر کا ظہور ترتیب بھی ہے، رہبر کمرے کا پیمانہ بھی اور ریت پر تعمیر عالی شاں گھر بھی۔ یہی زندگی جسے دیکھنے، پڑھنے اور جاننے کے لیے قلم و قرطاس اور بصیرت عطا ہوئی ہے۔

میرے جائزے کے مطابق کالی داس گپتا رضا نے زندگی کو مختلف رنگ و روپ میں دیکھا ہے، اور اس کی غرض و غایت کو سمجھا بھی ہے۔ اسی وجہ سے بقول گیان چند اردو ادب کے سیٹھ جی س کر انھوں نے ایسی شاعری کی جو کھیل تماشے کی بجائے اکتساب علم و ادب کی چیز بن گئی اور چکبست، داغ، اقبال سے والہانہ عشق پیدا کر کے اپنی زندگی سنوار لی۔ یقیناً رضا صاحب نے اپنے طور پر زندگی کی عظمت کو سمجھا کہ یہ محض کھاپی کر گزار دینے کی چیز نہیں بلکہ یہ اس لیے عطا ہوئی ہے کہ زندگی گزارنے کے عمل سے الگ ایسا کارنامہ انجام دیا جائے جو یادگار رہے اور اس عالم رنگ و بو میں اضافے کا باعث ہو۔ لہٰذا انھوں نے آخری دم تک زندگی اور کائنات کو کچھ نہ کچھ عطا کرنے کی جدوجہد کی۔ اس سلسلے میں پروفیسر مسعود حسین لکھتے ہیں کہ

"ایسا محسوس ہوا کہ گپتا رضا صاحب اب اپنے قلم کی ایک ایک سطر اپنے شائقین اور دوستوں کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ مہینے دو مہینے کے اندر انھیں لمبے سفر پر جانا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ ع تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور "

حس سچائی کی جانب پروفیسر مسعود حسین نے اشارے کیے ہیں، ان کا اظہار تو خود کالی داس گپتا رضا نے اپنے آخری ایام میں اپنے بعض اشعار میں کر دیا تھا۔ ان کی مارچ ۲۰۰۱ء میں تخلیق کردہ غزلیں رہنمائے تعلیم دہلی کے مارچ اور اپریل ۲۰۰۱ء کے شماروں میں شائع ہوئی ہیں۔ ان دونوں کے ابتدائی دو دو اشعار ملاحظہ ہوں

نہ سنائے گی زباں اب غم درد کا فسانہ ۔۔۔ نئے موڑ مڑ رہی ہے مری فکر کامرانہ

رہ زیست پر ابد تک چلے ہم مسافرانہ ۔۔۔ کبھی آ گئے پلٹ کر کبھی ہوگئے روانہ

☆

تمغہ سے شجاعت کے مزین مجھے کر جا ۔۔۔ اے شوق شہادت تو رگِ جاں میں اُتر جا

آغوش قضا دیکھ کے بے طور بکھر جا ۔۔۔ تو زندۂ جاوید ہے اُٹھ جی سے گزر جا

شاعر اس سے زیادہ واضح الفاظ میں اپنے انتقال مکانی کے بارے میں اور کیا کہہ سکتا ہے۔ ہر انسانیت نواز شاعر کی چھٹی حس ہمیشہ بیدار رہتی ہے اور اس سے وہ باتیں کہلواتی رہتی ہے جو انکشاف یا پیش گوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یقیناً اس لیے کہ شاعر تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے اور پھر رضا صاحب تو وحدانیت، تصوف اور حسینیت کے بھی قائل رہے ہیں۔ میں ان کی نظم کے بعض حصوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے بہت دور نکل آیا۔ مجھے اس مختصر سے مضمون میں بعض اور اہم باتیں پیش کرنی ہیں اور حوالوں سے ثبوت بھی فراہم کرنے ہیں مگر پہلے میں ان کی نظموں کے چند اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں تاکہ سطور بالا میں مذکورہ باتوں کی توثیق ہو جائے

حس دور کی آغوش میں ہم دوست بے تھے　　مذہب کے محافظ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے

(ہماری دوستی)

تجھے میں جانوں گا اس وقت جب تری ہمت　　سر رعونت و بے داد کو کچل دے گی

کرے گی اونچا زمانے میں پرچم انصاف　　ستم گری کے ہر آئین کو بدل دے گی

(رکشہ کھینچے والا)

تیری عزت، تیری عظمت سے اجازت مانگ کر　　کہہ رہا ہوں قصۂ حق و صداقت اے حسینؑ

(حسینیت)

نام کے عالمو اخلاص رده رر طلبو　　دست بستہ میری درخواست ہے یہ

مرا سب لے لو مجھے میری کتابیں دے دو

(بے کتابی کا ایک لمحہ)

یہ وہ اشعار ہیں جو رضا صاحب کو دوست نواز، محب وطن، مذہبی قدروں کا پاسدار اور علم و ادب کا سچا پرستار ثابت کرتے ہیں۔ ان کی حب الوطنی کے موضوع پر لکھی ہوئی نظمیں "ہند کا سپاہی"، "لکشمی مائی" اور "عروس وقت تو ہے منتظر　　" بہت زیادہ نہیں تو بھی نظم نگاری کی عام روش سے ہٹ کر اپنی انفرادی پسند اور مزاج کے مطابق تخلیق کی گئی ہیں اور قاری کو کسی نہ کسی سطح پر ضرور متاثر کرتی ہیں۔ "گوتم بدھ کا تیاگ" اور "ترک دنیا کیوں" فکری و نظری سطح پر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں مگر باشعور قاری کو لمحہ فکریہ عطا کرتی ہیں۔ رضا صاحب کی بعض نظمیں "وحشی جی اٹھا"، "گھٹن"، "سوکھا سہاپنا"، "لہو کا لالہ زار"، "یا انساں"، "شعور" اور "زندگی کے صحرا میں" وغیرہ میں خوبصورت شعری انسلاکات، رمزیت اور استعاراتی فضا ہے اور یہ سب نئی نظم نگاری کے تقاضوں سے ہم آہنگ، نظر آتی ہیں۔ بقول عبد اللہ کمال

"جدت، جودت کی نئی شمعوں، نئی لفظیات کی نئی دھمک اور نئی تکنیک کے آہنگ سے لیس ہو کر عصر حاضر کے نئے عرصۂ جہاد میں داخل ہوتی ہیں"۔

رضا صاحب روایت کے پاسدار ضرور ہیں مگر انھوں نے نئے شعری رویوں اور بدلتی ہوئی جہتوں پر ہمیشہ نظر رکھی۔ انھیں آزاد نظم کا اسلوب بھی پسند تھا اور پابند نظم کی شعری روایت بھی عزیز تھی۔ انھوں نے بیس سال افریقہ میں گزارنے کے باوجود اردو زباں کے فنی جمالیاتی تقاضوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ بقول حضرت ابرار حسنی گوری "رضا صاحب کی زبان پر افریقہ کی زباں کا اثر نہیں پڑا۔ یہ باتیں قابل رشک ہونے کے ساتھ ہی قابل فخر بھی ہیں"۔

کالی داس گپتا رضا نے زبان و فن کے تحفظ کے ساتھ اپنے ہندوستانی کلچر، معاشرتی تہذیب اور ادبی و شعری تاریخیت کو بھی افریقہ کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ انھیں یقیناً اس قول کا بھی عرفان حاصل تھا کہ "جس

سر زمین پر رہو اس کے لیے اپنی جان مال سب کچھ قرباں کر دو"۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے افریقہ اور کینیا کی آزادی اور بعض اہم مسائل پر بھی اظہار خیال کرنے سے گریز نہیں کیا۔ بقول ماہر القادری "ان کی چند نظمیں کینیا کے ماحول کی عکاسی کرتی ہیں"۔ ان کی نظم "داخل زنداں ہونا" اسی حدے کی عکاسی کرتی ہے اور "لیک نواشا" میں کینیا کی ایک خوش منظر جھیل کا شاعرانہ بیاں ہے۔ یہاں صرف دو اشعار ملاحظہ ہوں

بس گئی آرام کی بستی اہورو آگیا   چھائی خاص و عام پر مستی اہورو آگیا
ناعماں کا بھر گیا دامن گل امید سے   چار جانب کھل اٹھی ہستی اہورو آگیا

"اہورو" کے معنی روز آزادی کے ہیں۔ ظاہر ہے آزادی حاصل ہونے کے بعد آرام و آسائش، عیش و مستی اور امید کے گوہر بے بہا سے دامن بھر جاتا ہے۔ ایک سرشاری اور کیف بے پناہ کا عالم ہوتا ہے۔ اس وقت ایک عام آدمی بھی یہی سوچنے لگتا ہے کہ ہمیں وہ سب کچھ مل گیا جو ہمیں چاہیے تھا مگر اکثر و بیشتر یہی ہوتا آیا ہے کہ سیاسی رہنما اور دولت مند طبقہ عیش کرتا ہے اور عام آدمی دانے پانی کو ترستا ہے۔ شاید اسی لیے رضا صاحب نے اپنی نظم "جہد ناکام" کے آخری شعر میں کہا ہے کہ ۔

جہد ناکام ، مشقت ، محنت   میں کوئی اور نہیں اس کے سوا

اور اپنی نظم "شعور" میں عزم محکم اور جرأت سے کام لینے کا مشورہ دیتے ہیں ۔

جس کا رنگ سرشتۂ نظر کا   اسے حسن حقیقت سے نہ جوڑو
جھکی ڈالی کی کلیاں توڑنا کیا   کوئی زنداں کوئی زنجیر توڑو

کالی داس گپتا رضا نے نظم کے ذیل میں اتنے اچھے اور معیاری گیت لکھے ہیں کہ حضرت اعجاز صدیقی کو بعد افتخار یہ کہنا پڑا، "ہر چند مجموعے (شعلۂ خاموش) میں آٹھ گیت شامل ہیں۔ ان میں بڑا رس اور اثر ہے۔ رضا صاحب اگر گیتوں پر توجہ دیں تو وہ اس صنف کو اور چمکا سکتے ہیں '۔ اردو میں گیت پہلے بھی لکھے گئے ہیں اور آج بھی لکھے جارہے ہیں۔ رضا صاحب ممکن ہے نظم کی اس ترنم ریز صنف کو نئی بلندیوں تک پہنچاتے مگر غالبیات کے اہم، مشکل اور پیچیدہ کام میں کچھ اس طرح الجھے کہ نظم، رباعی اور غزل کے علاوہ بہت کم اصناف پر خصوصی توجہ دے سکے۔ اس کے باوجود انھوں نے تاریخیں کہیں اور مذہبی حیثیت کو نئی جہتیں عطا کیں۔ ان کی نظم "دیپ مالا" اور "ترک دنیا کیوں" اور بعض نعت و منقبت کے مطالعے سے اندازہ ہو جائے گا کہ رضا صاحب نے جسے چھو دیا اسے ایک نرالی کیفیت حاصل ہو گئی۔

ساری عمر رضا صاحب اپنے شعر و فن کے تئیں ذمہ دار اور ایماندار رہے۔ جو کچھ لکھا غور و فکر کے بعد لکھا۔ جب بھی وہ شہر کے ہنگاموں سے اکتاتے اپنے پونہ کے فلیٹ میں آجاتے اور وہیں نظم، رباعی یا غزل کے فنی و فکری تقاضوں کو پیش نظر رکھکر شعر کہتے اور شعر گوئی کا حق ادا کرتے تھے۔ جب تک مکمل سکون اور یکسوئی حاصل نہ ہو اور وجدانی کیفیت طاری نہ ہو، اچھی، بڑی، قابل توجہ اور معنویت انگیز شاعری نہیں کی جاسکتی۔

کالی داس گپتا رضا نے وہ کارنامے انجام دیے ہیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ افتخار امام صدیقی نے لکھا ہے کہ "جب تک غالب کا نام باقی ہے رضا صاحب کا نام بھی باقی رہے گا۔ فی زمانہ غالب کی شخصیت اور فن پر سب سے زیادہ کام انھوں نے کیا ہے"۔ غالبیات کے باب میں ان کی بیس کتابیں ضرور ہیں مگر اب تک ان کے چودہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور بقول عبد اللہ کمال ابھی رضا صاحب کی ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۰ء تک کی بیشتر نظمیں غیر مطبوعہ ہیں اور یہ نظمیہ شاعری کا Turning Point ہیں کیونکہ ان میں عصری آگہی اور نئے فکری رویوں کی تابناکی دیدنی، تاثیریت افزوں اور تخلیقی رویوں کی عکاس ہیں۔ کچھ لوگ رضا صاحب کو غزل اور رباعی کا اہم شاعر کہنے کا حق رکھتے ہیں مگر ان کی نظم نے بھی ادہاں پر ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو انھیں یقینی طور پر ایک اہم نظم نگار کی حیثیت سے بھی نئی پہچان اور انفرادی شناخت عطا کریں گے۔

☆☆☆

بے کتابی کا ایک لمحہ

کالی داس گپتا رضا

ابھی سب کچھ تھا، ابھی کچھ بھی نہیں
ادھ کھلی آنکھوں کی بے رحم جھپک
آدھے لمحے کا بھی وقفہ نہ ملا
لے اُڑا کون اُسے، کس کو وہ دھن پیارا تھا

ایسا بیدار، سمجھدار، کہاں اب کوئی
میرے مخطوطوں، کتابوں کی جو چوری کر لے
بیش تر آج تو احمق ہی جیا کرتے ہیں
میرا بوسیدہ ذخیرہ، وہ مری بوڑھی متاع
پُرزہ پُرزہ سے ورق
کچھ ادھورے، کئی بے ربط
کئی رنگین، منقش، خوش خط
لکھنے والے کا کہیں نام نہیں، سنہ غائب
قلمی چیز مگر کس کا قلم؟ کس کا دماغ؟
یا پھر ایسے کہ ہے ترقیمہ نہایت کامل
نام، تاریخ، پتا، درج جلی حرفوں میں

یعنی مخطوطہ بھی اور صاحبِ مخطوطہ بھی
اور وہ بھی طبع شدہ پچھلی کئی صدیوں کا
اک خزانہ جو مرا ہی حق تھا
جس پہ چغتائی کے دیوانِ مصوّر قرباں
جس کی نم دیدگی اوراقِ جدیدہ پہ نثار
جس کی دہلیز پہ دہن آج بھی ہے سر بہ سجود
حاجت اب جس کو مصنف کی نہیں
ملکہ ہے قاریٔ خود گم کی تلاش
جو اسے پڑھ سکے، جتلا سکے اس کی قیمت۔
لے اُڑا کون اسے، کس کو وہ دھن پیارا تھا
ایسا بیدار، سمجھدار، کہاں اب کوئی
بیش تر آج تو حامل ہی حیا کرتے ہیں

کون ہوگا وہ چرانے کو چرانے والا
ہو نہ ہو ہوگا کوئی بُک سیلر
درس و تدریس کے شعبے سے کوئی کیا ہوگا
اس کو فرصت ہی کہاں انجمنوں، جلسوں سے
سیمی ناروں سے، اداروں سے، ملاقاتوں سے
درس و تدریس تو اک نام ہے۔ اور نام میں کیا؟
اور کچھ کہہ لو اسے، جیسے کہ شہرت طلبی
یا کہو شعبے کو بازار، جہاں تقییس کی
اَدھ پکی، لوٹی ہوئی جنسِ گراں بکتی ہے

نہیں ہرگز نہیں تعلیم کے شعبے والے
کیوں چرانے لگے بوسیدہ، پرانے اوراق؟
کون پڑھ پائے گا ان کو، کسے فرصت ہے یہاں؟
اور ہوں گے کوئی

پر کوئی بھی ہوں لوٹنے والے تو ہیں
اے لوگو!
نام کے عالمو، اجلاس زدو اور طلبو!
دست بستہ مری درخواست ہے یہ
میرا سب لے لو۔ مجھے میری کتابیں دے دو
(۱۹۸۰ء)

لاشعور سے شعور تک

کالی داس گپتا رضا

میں کہ تھا پردہ نشیں، خانہ نشیں، گوشہ نشیں
اپنے ہی حول میں سرمست رہا کرتا تھا
زیست ہی زیست
اُفق تا بہ اُفق
کوئی اُمید نہ غم
کوئی شکوہ نہ گلہ
یک بیک ایک گولہ ہوسِ باطن کا
ذہنِ خاموش سے ٹکرانے لگا
ایک جھنکار اُٹھی
زیست اور موت کی تفریق نمودار ہوئی
کوئی کہہ اُٹھا کہ
"اس زیست کا بھی کوئی دمِ آخر ہے
موت وہ نام ہے غالب ہے جو اس ہستی پر
ساری خوشیوں پہ
خرافات پہ، مدمستی پر"
اس نئی بات پہ میں چپ تھا
سبھی چپ تھے
مگر دُور کہیں
وا ہوئے ہونٹ بکھرتے ہوئے سناٹوں کے
اور آواز اُٹھی
"زیست ممکن ہے مگر موت تو ممکن بھی نہیں
موت احساس ہے، احساس کا پیکر ہی نہیں
تو جسے موت سمجھتا ہے
یہی ہستی ہے
یہی قاتل
یہی مقتول
یہی اُوج
یہی پستی ہے"
پھر یہ آواز رگ و پے میں مرے دوڑ گئی!

(۱۹۹۰ء)

بابِ غزل

کالی داس گپتا رضا کی غزلیں

ساحل احمد

کالی داس گپتا رضا کی غزلیں اپنی سلاست و روانی اور بے ساختہ بیانی کی وجہ سے انجذاب و کشش کا باعث بنیں۔ اُن کی غزلوں کی پہلی بنیادی خصوصیت یہی سادہ بیانی اور سلاست و روانی ہے۔ منتخبہ الفاظ و تراکیب کو نوقی تناسبات دینے اور انھیں مخصوص حالات و مواقع پر اُجالنے اور مہکانے کے لیے حسن حلیم و متین اسلوب کی ضرورت لازم ہے وہی ان کا طور و طریق ہے۔ باریافتی کا یہی عمل شعری ادراک کی پہلی شرط ہے۔ چنانچہ انھوں نے کثیر تجربات کو فکریاتی لہو سے مصور کیا اور پھر انھیں منتخبہ الفاظ کے حوالے کر دیا تاکہ وہ تجربہ وسیع تر حلقے میں رسائی پا سکے اور جب کوئی تجربہ فکر و احساس کی ارضی سطح کو چھو لیتا ہے تو یہی چھواں عمل انتقائی کا موجب بن جاتی ہے۔ عمل انتقائی خیال جس شاعر کی دوست بن جائے وہ ہر خلی و خفی لوتتے کو دست احساس پر منتشکل کر سکتا ہے۔ رضا کے شعروں میں اسی عمل انتقائی خیال کی عنائیت، رمزیت اور شعریت موجود ہے۔

زمانہ، حسن، نزاکت، بلا، حیا، شوخی
سمٹ کے آگئے سب آپ کی اداؤں میں

یادوں کے مہ و سال، رفاقت کا وہ اک پل
کردار تو سو سال کے، افسانہ ذرا سا

اک آنسو میں سمٹ کر آگیا ہے
سمندر بے کراں ہوتے ہوئے بھی

روتے روتے وہ لمحے یاد آئے، پھر کیا تھا
رنگ کی پھواریں تھیں، روشنی کا دریا تھا

اندھیری شب، چلا کون انجمن کو
اجالا ہے زمیں سے آسماں تک

میرے اندر تصادم کم نہیں ہے
تری دیوار سے سر پھوڑنا [illegible]

آسماں تھوڑا سا، تھوڑی سی زمیں اپنی ہے
[illegible] دنیاؤں کا کچھ ہم نے برا چاہا ہے

انھوں نے سماجی انتشار، [illegible] کو کم و بیش محسوس کیا۔ زندگی کے [illegible] احساسات کو تجرباتی روش [illegible] یا تاکہ کوئی کشید خیال حیات موجود [illegible] نہ ہو جائے۔ کوئی بھی صاف اور راست خیال شعری تونگری کا موجب بن سکتا [illegible] لازم ہے کہ خیال کی ترسیل میں کوئی الہام یا غلو حائل یا داخل نہ ہو کیونکہ شعر کی سالمیت اس کی سادگی اور راستی پر ہے۔ شعر کو گنجینۂ معنی بنا دینا شعری حکمت تو ہو سکتی ہے لیکن شعری گنجلکی نہیں۔ شعر میں گداختگی یا نغمگی کی موجودگی مشکل ضرور ہے لیکن اس موجودگی کو مصور کرنے کے لیے جن حسی عوامل کی ضرورت ہوتی ہے نہ وہ سب شاعروں کا مقدر ہے اور نہ حق۔ رضا صاحب نے اس شعری اجمال کو خود میں ضم کیا اور پھر اس کو انتہائی حلیمی اور بردباری سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ منتقلی کا یہ عمل نہ صرف جذبۂ فطری کی مثال ہے بلکہ لمسی، حسی اعصاب کا اظہار بھی۔ چونکہ تخلیق شعر کے لیے اعصابی فکر لازم ہے۔ اچھے شعر کی تخلیق سے

لیے نیک نیتی اور خلوص لازم ہے۔ لمسیاتی خوشبو ہو یا حسیاتی لمحات کی گویائی، اُن کے ساتھ شاعر کا برتاؤ دوستی کا نہیں محبت کا ہونا چاہیے تاکہ کوئی خیال یا موضوع بے دریغ شعری منطقے میں داخل نہ ہونے پائے۔ کیونکہ کوئی بھی شعری منطقہ تشکیلی مراحل میں نظام لفظیہ کا پابند نہیں ہوتا ہے۔ رضا صاحب اس پابندیٔ خیال یا اصولِ شعریہ کے انکاری نہیں۔ انھوں نے ضابطے کے تحت اس شعری لوازمات کا احترام کیا۔

اچھا ہوا جو سوکھ گیا آنکھ میں آنسو — بے چارے کا دھرتی پہ کوئی گھر بھی نہیں تھا
لہو صحرا نشینوں کا نہیں انکار سے خالی — جہاں دو بوند بہہ جائیں وہیں گلزار ہو جائے
وہ اپنے آپ کا قیدی اگر سنتا ہے آہٹ بھی — پہن لیتا ہے زنجیریں، رہا ہونے سے ڈرتا ہے
زوالِ آشیاں ہوتے ہوئے بھی — مکیں چپ ہیں زباں ہوتے ہوئے بھی

رضا صاحب کی غزلوں میں ایک اور خوبی ہندی لب و لہجہ کی کھنک اور اس کی للک منتہائے خلوص کا حصہ معلوم دیتی ہے۔ اشعار میں اس نوع کی خوبی ست رنگی کی ہی زائیدہ نہیں نوائے احساس کی پروردہ بھی ہے۔ غزل میں جب گندھی رنگ جھلک اُٹھتا ہے تو شوخ و شنگ تتلیاں، ملہارتے پرندے، مہکتے گلزارتے پھول، صبح و شام کے دھندلکے، چاند ستارے اور بادلوں کے جھروکے جب مجتمع ہو جائیں تو رنگوں کی پھوار سے کس کا دامن نہیں بھیگے گا۔ انھوں نے ہر موقع و محل کی مناسبت سے فکر و احساس کے دریچوں کو کھلا رکھا۔ جب خوشبو اور آواز کی سفارت کسی شعر کو میسر آجائے تو معنویت دو چند ہو کر منتہائے عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ شعری ارتفاع کا یہ سفر رضا صاحب کی تخیلی وحدت کا اثبات ہے۔

اُڑنے والا تو ستاروں کی خبر لاتا ہے — تم وہی صدیوں کا ٹوٹا ہوا پر دیکھتے ہو
دھواں اُٹھا تو چھت کی راہ نکلا — مکاں میں کھڑکیاں ہوتے ہوئے بھی
پنکھ تولو، مگر خیال رہے — اب اصول اور ہیں اڑانوں کے
دل ہزار چنچل تھا، بھاگ کر کہاں جاتا — ہم نے ترے آنچل میں اس کو باندھ رکھا تھا
ننھے منے موتیوں سے بھر گیا جھیلوں کا منہ — سوکھی دھرتی کے لبوں پر کون ابر رکھ گیا
تیرے آنے نے پلک تر کر دی — پیاسے برتن بھی بھرے لگتے ہیں

یہی وہ احساسی فکریہ کے نو شگفتہ استعارے ہیں جن کے توسط سے شعر کو نطق گویائی میسر آئی اور رضا صاحب نے اشعار کے ایسے ایسے گل بوٹے سجائے جن میں ہر موسم کی خوشبو اور ہر لمحے کی آواز اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ احساس دلانے کا یہ ہنرمندانہ طریق سب کو کہاں میسّر ہے۔

دور کہیں موجود میں ہے گھر، ابھی ناؤ نہ باندھو — مانجھی رے ! باقی ہے سفر، ابھی ناؤ نہ باندھو

☆☆☆

Sadia Arts and Culture, L I G 10, Neem Sarai, A D A Colony, Munedra Chak, Allahabad - 11

کالی داس گپتا رضاؔ کی غزل کے زمانی مدارج: مختصر جائزہ

عبد الاحد ساز

کالی داس گپتا رضا صاحب شعر و ادب کے اس مقام پر اپنی عمر عزیز کے تکملے سے بہت پہلے ہی آ چکے تھے، جہاں ایک مستند شاعر اپنی طویل فنی خدمات اور اپنے شعری سرمائے کی مسلمہ و مصدقہ حیثیت پر مطمئن اور اس کے سامع و قاری اُس کی خاموشی پر بہ صد احترام قانع ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایسے میں اگر وہ فنکار نئی اور شگفتہ دھنوں کے ساتھ اپنی نغمہ سرائی جاری رکھے، بلکہ اس کی تازگی و ندرت بھی روز افزوں ہو، تو یہ اس کے پرستاروں کے لیے تسکین و سرشاری کی ایک دیگر ہی صورت ہوتی ہے۔ رضا صاحب کے تواتر شعر گوئی کی یہ کیفیت اُن کی آخری سانسوں تک رہی۔ ان کا آخری شعری مجموعہ "ابھی ماؤ نہ ماندھو" ۱۹۹۹ء کے اوائل میں شائع ہوا جو اُن کی ۹۳ء تا ۹۸ء کے دوران کہی گئی تازہ غزلوں اور اُن کے ساتھ ۱۹۴۱ء سے ۹۳ء تک کہی گئی غزلوں کے مبسوط انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس طرح نصف صدی سے زیادہ پر محیط ان کی غزلیہ شاعری کی یہ ایک سیر حاصل نمائندگی ہے۔ تعداد کے لحاظ سے یہ ان کی چودھویں شعری تصنیف ہے، جس پر مستزاد یہ کہ اس دہائی میں ان کی غزلوں، نظموں اور نعتوں کے تین مجموعے علی الترتیب "غزل گلاب"، "نظم سمندر" اور "احترام" شائع ہو چکے ہیں۔ غزل کے علاوہ بیشتر پابند اصناف نظم، آزاد نظم اور رباعی بھی رضا صاحب کے شعری اظہار کا اہم حصہ ہیں۔ ان کے ابتدائی مجموعوں "شعلۂ خاموش" اور "شورش پنہاں" میں بھی غزلوں کے ساتھ نظمیں شامل ہیں اور رُباعیات کا الگ سے ایک مجموعہ "شعاعِ جاوید" ۱۹۸۵ء میں آ چکا ہے۔ تاہم ان کے شعری کردار کی بھرپور نمائندگی ان کی غزل ہی کرتی ہے۔ کیفیت کے اعتبار سے بھی اور کمیت کی رو سے بھی کالی داس گپتا رضا صاحب پر بحیثیت ماہر غالبیات، بطور محقق و مؤلف اور اُن کی ادبی شخصیت کے دیگر پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اُن کے کلام پر ناقدین کی توجہ نسبتاً کم مرکوز ہوئی ہے اور اس دائرے میں بہت کچھ لکھا جانا ابھی باقی ہے۔

رضا صاحب کی پختہ کلامی، کہنہ مشقی، نغز گوئی اور فنی دسترس کے بارے میں کچھ کہنا تو محض اک اعادہ ہی ہوگا کہ یہ اوصاف کب کے تسلیم شدہ ہیں، جو بات اُن کی تازہ غزلوں میں خاص طور پر متاثر کرتی ہے، وہ ہے عصری افکار و احساسات سے پوری وابستگی کے ساتھ اک ایسا تازہ پیرایۂ اظہار جس میں روایت اور کلاسکیت کی لفظی و معنوی لطافتیں تو ہیں ہی، جدت کے اچھوتے رنگ اور عکس بھی ہیں۔ انھیں کسی حد تک جدید اور مابعد جدید بھی کہا جاسکتا ہے اور یہ ان اصطلاحی دائرؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ان سے الگ چہرے دیگر بھی ہیں اس کمیاب امتزاج کے حسن کو اُن کی تازہ غزلوں کے چند اشعار میں مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے

کبھی اک آنسو ڈھلک کر ٹھہر گیا تھا وہاں
پلک پلک پہ وہی انتظام ہے اب تک
جب ایوان کی بنیادوں میں جھوٹ بھرا ہے
سچ کو گرتی دیواروں میں کیا چنوانا
پرانی قدروں کا مرکز بھی تھا وہی احوال
ہیٹکی سی لہو میں دوام ہاتھوں میں
کیا جانے کس معنوں میں الفاظ لہو روئے
کچھ رحم کے چھل جانے کا منظر بھی نہیں تھا
جدید ذہن سے اپنا فسانہ کہتے ہوئے
رضا قدیم زمانے میں جا اترتا ہے

رضا صاحب نے اپنی غزلوں کی اس نمائندہ پیشکش کو زمانی ادوار میں تقسیم کیا ہے اور اس کی ترتیب کو کتاب میں معکوس رکھا ہے، یعنی ابتدا میں ۹۸۔ ۱۹۹۳ء تک کا کلام پھر ۷۴ء تا ۱۹۹۲ اور پھر ۷۱۔۱۹۷۳ء تخلیقی سفر کے ادوار کے اس اختصاص کے پیچھے یقیناً شاعر کا اپنے ذہن و فنی رویوں کے مدارج کے بارے میں خود کا ایک احساس رہا ہوگا، لیکن بادی النظر میں بھی ۱۹۷۴ء کے بعد کی اور اس کے پہلے کی غزلوں میں بین فرق نظر آتا ہے۔ ۱۹۷۴ء کے بعد کی غزلیں تازہ کاری کے اسی رخ پر رواں ہیں، جس پر تازہ غزلیں آگے اور مزید آگے بڑھی ہیں۔ کسی بھی عہد کی اچھی شاعری صرف اسی عہد کے پیش پا افتادہ کوائف میں محصور نہیں رہتی بلکہ وہ اپنے عصر کا ادراک زندگی کے دائمی تناظر میں کرتی اور کرواتی ہے۔ اس میں عصری تجربے کا کشاد آفاقی شعور کے تحت ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ کالی داس گپتا رضا جیسے بالغ نظر شاعر سے یہ توقع ہی نہیں کی جانی چاہیے کہ وہ محدود اصطلاحی معنوں میں جدید غزل کی ہم نوائی کریں گے۔ ہاں البتہ وسیع معنوں میں وہ ہم عصر غزل کے ہم قدم ہی نہیں، رہنما و سرپرست بھی نظر آتے ہیں۔ ۷۴ء تا ۹۲ء کے عرصے میں کہی گئی غزلوں کے چند اشعار دیکھئے اور یہ اندازہ بھی لگائیے کہ ان میں خو، بو، انہیں اشعار کی سی ہے، جس کی مثال اوپر تازہ غزلوں میں سے دی گئی ۔

چاہیئے تھا، سوچتے رک کر نقاب خو فروش
کل پہ ہم رکھتے گئے، سودا گراں ہوتا گیا
افق سے دو قدم آگے ملے گی حدِّ یقیں
یہیں سحر کو ہوئی تھی خدا سے بات مری
نکالئے تو کہ ذہن پاتے تھے اس سے ٹھنڈک
وہ سرد خانوں میں رکھی نادانیاں کہاں ہیں

ہمارے کام کرے کا یہی ڈھب
غلط کر کے صدا پر چھوڑ جانا
سمجھ ہی کو نہ منزل مان لینا
یہ پگڈنڈی بھی انجانی بہت ہے

رضا صاحب کی غزلوں کا ایک خاص وصف "سہل ممتنع" بھی ہے۔ پتھر کو پانی کرنے کا فن، خیال کے لوہے کو تخلیق کی آنچ پر پگھلا کر سیال کرنے کا ہنر۔ یہ وصف گزشتہ تیس برسوں کی غزلوں میں برابر ملتا آتا ہے، بلکہ اس کا تناسب بڑھتا بھی آتا ہے ۔

موت ہے ایک ہاتھ کی تالی
زندگی دونوں ہاتھ کی پیکار
کہہ چکوں بات تو پھر دم بھی لوں
بول سانسوں سے بڑے لگتے ہیں
ساگر میں اک مٹھی صحرا
ڈالا تھا اب گھول رہا ہوں
جو لمحے انگلیوں سے چھو چکے ہیں
ابھی تک کہہ رہے ہیں داستاں کیوں ؟
کون کس کو ڈھونڈتا ہے
خاک سے دور سمو ، تک

۱۹۷۰ء کے پہلے کی غزلوں میں مگر روایتی رنگ گہرا ہے۔ اس کی طرف مصنف نے اپنے پیش لفظ میں خود بھی اشارہ کیا ہے۔

"لگ بھگ ربع صدی غیر ممالک میں گزارنے کے بعد جنوری ۱۹۷۰ء میں میرے ہندوستان پلٹنے تک میری شاعری کم و بیش انہی (روایتی) خطوط پر رواں دواں رہی۔ پھر میں نے یک لخت اپنی غزل کو روایتی و اتباعی شاعری سے آزاد کر لیا۔ زبان و فن کے استعمال میں احتیاط تو برتی، مگر شاعری کا تفکیری رُخ بدل گیا"۔

اس دور کی غزلوں میں زبان و بیان کے روایتی رکھ رکھاؤ کے ساتھ خیال کی ادائیگی نسبتاً صریحانہ ہے۔ ان میں وہ لطیف اشاریت و ایمائیت کم ہے جو بعد کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ گپتا صاحب کی شاعری کو غور سے پڑھنے والے طالب علم یا قاری کے لیے مگر ان غزلوں کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے کہ ان میں معانی کے گہرہائے آب دار، کلاسیکی طرز ادا کی نفیس سیپیوں میں خوبصورتی کے ساتھ بند ہیں ۔

حیات لاکھ ہو فانی مگر یہ سن رکھئے حیات سے جو ہے مقصود، غیر فانی ہے

موئے سفید ہجر کا کانٹا تھا غالباً
لگ کر جو میرے پاؤں میں سر سے نکل گیا

ہے عین لطفِ اصل کی مداخلت ورنہ
تھا شعار زمانے میں زیست مر رہتی

حالِ دوست پہ بھی معصیت کے ہیں آثار
ضرور کوئی گنہ گار خلوہ گاہ میں ہے

ابتدائی غزلوں میں جو ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۰ء کے بیچ کہی گئی ہیں، بیشتر لطفِ سخن آرائی اور شوقِ شعر گوئی سے عبارت ہیں، جس میں کرافٹ آرٹ پر غالب ہے اور لفظوں کی تخلیقی و اختراعی دروبست کی جگہ مرصع کاری اور مہارت آفرینی کے عنصر نمایاں ہیں، اگرچہ اس دور میں بھی شاعر کے تشکیل پاتے ہوئے ذہن کی اپج، اُٹھان اور طبیعت کی جولانی متوجہ کرتی ہے ۔

نقشِ حسن کرم فرما کے ایما سے بنایا تھا
تعجب ہے اُسی نے آگ زیرِ آشیاں رکھ دی

روتے روتے تھک گئے رُک رُک کے دم آنے لگا
ہچکیوں نے آ کے ٹکڑے کر دیے فریاد کے

چھپا نہ آپ تخیل کو اے رضا ہرگز
یہ تیغ وہ ہے جسے حاجتِ نیام نہیں

کم و بیش ساٹھ برسوں کے اس طویل غزل سفر کی کامرانی و سرشاری کا احساس خود شاعر کو بھی ہے اور اس سفر کو جاری رکھنے اور قدیم کو کلیجے سے لگائے، جدید کو آنکھوں میں بسائے بڑھتے چلنے کا حوصلہ اور توانائی بھی۔ اس کیفیت کا اظہار کس قدر لطف کے ساتھ ان دو شعروں میں ہوا ہے ۔

لکھ چکا ہوں میں سبھی، خواب، روایت، حسرت
وقت باقی ہے، کوئی بات نئی بھی لکھوں

بوتا ہوں نئی نویلی فصلیں
پُرکھوں کو لگان دے رہا ہوں

اور اسی کیفیت کا غماز اُن کے آخری مجموعۂ غزل کا نام 'ابھی ناؤ نہ مانجھو' بھی ہے، جو شاعر کے تحت الشعور سے بے ساختہ اُبھر کر کتاب کے سرورق پر نمایاں ہو گیا ہے، جس کی پہلی غزل کا پہلا شعر ہی یہ ہے۔

دور کہیں موجوں میں ہے گھر ، ابھی ناؤ نہ مانجھو
مانجھی رے باقی ہے سفر ، ابھی ناؤ نہ مانجھو

اُن کی عمر کی کشتی اچانک کنارے آ لگی ورنہ جو لوگ رضا صاحب سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ ابھی ناؤ مانجھنے کے حق میں بالکل نہیں تھے۔ اپنی غزل کے طویل سفر میں کالی داس گپتا رضا نے نہ صرف اساتذہ اور اسلاف کے نقوشِ پا اجاگر کیے ہیں بلکہ وہ اپنے ساتھ کے اور اپنے بعد کے غزل کہنے والوں کے لیے ہم عصر غزل کے نئے راستوں کو تلاش کرتے ہوئے خود اپنے نقوش بھی فراہم کر گئے ہیں۔

☆☆☆

غزل گلاب

مرحوم ڈاکٹر خ زماں انصاری

کالی داس گپتا رضا کی تازہ غزلوں کا انتخاب "غزل گلاب" ۱۹۹۲ء میں جلوہ نما ہوا ہے۔ اس طرح رضا صاحب کی شاعری زندگی کے پچاس برسوں پر محیط ہے۔ کہتے ہیں، چالیس برس کے قریب آدمی کے ذہن کے دریچے وا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ یہاں تو شاعری کے پچاس برس کی بات ہے۔ اس اعتبار سے "غزل گلاب" رضا صاحب کی شاعری کا گولڈن جوبلی نمبر ہونا چاہیے۔ ان پچاس برسوں میں شاعر نے شاعری کی تمام تر اصناف پر اپنی کامیاب دسترس کا ثبوت دیا ہے۔ غزل گلاب نامور محقق اور بلند مرتبہ شاعر کا ایسا ہی انتخاب ہے جو نہ صرف شاعر کو قاری سے پوری طرح روشناس کرتا ہے بلکہ اہل فن کی پوری توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی صفت کے ساتھ شاعر کے مقام کو متعین کرتا ہے اور بلحاظ فن، عروض، شعر گوئی، زباں دانی، کلام کی تازگی اور شگفتگی کا پتہ دیتا ہے۔

کسی شعری مجموعہ پر تبصرہ لکھنا زیادہ مشکل کام نہیں لیکن کالی داس گپتا رضا کے کلام کو تبصرہ کے کوزے میں سمو دینا کارے دارد۔ اس لیے کہ رضا صاحب کی حیثیت اتنی گوناگوں اور تہہ دار ہے کہ ایک شخص کس کس بات کو نظر انداز کرے۔ غزل گلاب کے اشعار کی پاکیزگی، صفائی، روانی، کفایت الفاظ اور معنویت پسندی کے پس پشت یہاں ابو الفصاحت حضرت جوش ملسیانی کے نقش قدم پر چلنے کی سعی بھی شامل ہے۔ حضرت جوش نے جو شعر اپنے بارے میں کہا تھا، حرف بہ حرف درست تھا ؎

ہم نے زمیں شعر کو زر خیز کردیا   جو نخل بو دیا وہی گل ریز کردیا

اس بات کا ثبوت کالی داس گپتا رضا اپنی تصنیف میں بغیر دعوے کے پیش کر چکے ہیں۔ حضرت جوش کے یہاں زباں و بیاں کی صفائی اور سادگی، محاورہ کو سچائی اور خوبی سے نظم کرنے کی بڑی اہمیت ہے۔ حضرت جوش نے اس سلسلے میں اپنے استاد حضرت داغ دہلوی کی مکمل پیروی کرتے ہوئے اپنے کلام کو کبھی داغدار نہیں کیا۔ لیکن داغ کی شاگردی کا دم بھرنے والے وہ شعراء جو ابتذال کا شکار ہوئے، خود کو رسوا کرنے کا باعث بنے لیکن حضرت جوش ہر طرح اس طرح کے فعل سے محفوظ رہے اور استاد کی طرز سخن کو بھی بدنام ہونے سے بچایا، یہی شیوہ جناب رضا نے اختیار کیا ہے کہ کلام میں پاکیزگی اور صفائی کا ہر قدم پر خیال رکھا ہے اور اس طرح حضرت داغ اور جوش کی صفات کو زندہ رکھنے کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ حضرت جوش کی طرح رضا صاحب نے تمام متروکات کا خیال رکھتے ہوئے شعر کو بلاغت کی طرف پرواز کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ رضا صاحب کی قادر الکلامی مشکل سے مشکل بحر میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہے اور یہ مظاہرہ "محض قافیہ پیمائی" سے کوسوں

دور ہوتا ہے، ان کے یہاں غزل کا کوئی شعر ضائع نہیں جاتا اور شعر کا ضائع نہ جانا استاد کی پیروی کا حصہ ہے۔

"غزل گلاب" کے اشعار، رضا صاحب کی پچھلے دس برسوں میں کہی گئی غزلوں کا صرف ایک حصہ ہیں اور یہ حصہ (انتخاب) بھی کیسا کہ ۸۸ غزلوں میں سے بیشتر غزلیں صرف چار چار شعر پر مشتمل ہیں۔ عبد اللہ کمالؔ نے (انتخاب کے متعلق جو بات (کہانی) کہی ہے میں شاید اس سے اتفاق نہ کر پاؤں، ہاں اس صورت میں یہ بات قابل قبول ہے کہ رضا صاحب نے اسے بھی استاد محترم کی تقلید جانا ہو کہ خود حضرت جوش ملسیانی نے ۵۷؍ برس کی عمر میں جب مجموعہ چھاپا تو وہ بھی انتخاب ہی تھا۔ غزل گلاب میں عبد اللہ کمال کا مبسوط پیش لفظ جو ۲۵؍ صفحات پر محیط ہے، شامل ہے اور محنت سے لکھا گیا ہے، سوائے ان کی اس پریشانی کے کہ فاروقی صاحب ان کو (رضا صاحب کو) کس نسل کے خانے میں رکھیں گے۔ میری نظر میں رضاؔ کی شاعری پر لکھتے ہوئے اشعار کی روشنی میں یہ سوال اٹھانا ہی غلط ہوگا۔ رضاؔ صاحب کی حیثیت ایک Spiritual Guide (مرشد) کی سی ہے اس لیے کہ مرشد ایک زمانے، ایک عصر کا شاہد ہوتا ہے، جس کی عصری بصیرت سے انکار ممکن نہیں، باوجود اس کے کہ اس کے ارشادات Latest Terminology کے بغیر بھی قابل قبول ہوتے ہیں۔

رضا کے اندر کا شاعر جس کی نگاہ اپنے عصر پر خوب ہے۔ اچھی طرح واقف ہے کہ جو وقت کا ساتھ نہیں دیتا، وقت اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ چنانچہ اسلوب کی سطح پر اس کا ڈکشن نہ تو روایتی ہے اور نہ تقلیدی بلکہ اپنا تلاش کردہ، تخلیقی اور فطری ہے، آج کے Senario میں قدیم و جدید کے درمیان ان کا اسلوب ایک پل کا کام انجام دیتا ہے۔ اس لیے قدیم و جدید ذہن دونوں انھیں کسی نام سے پکارنے کا موقع تلاش نہیں کر سکتے، اس لیے کہ رضا صاحب کے آگے پیچھے کوئی لکیر نہیں کوئی حدِ فاصل نہیں، کوئی شجر ممنوعہ نہیں۔

مجروحؔ ترقی پسندوں کی بھیڑ میں رہ کر بھی آبروئے غزل ٹھہرے، کیوں؟ محض اس لیے نا کہ مجروحؔ نے اس دور میں بھی غزل کا دامن نہ چھوڑا مگر اس دور میں غزل کی آبیاری صرف مجروحؔ ہی نہیں کر رہے تھے، کئی اور نام تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ وہ شعراء اس قطار میں گنہگاروں کی طرح شامل نہیں تھے جہاں اہل وفا کا نام لکھا جا رہا تھا اور اس طرح مشتہر ہونے کے جرم سے بری تھے۔ رضا صاحب کی غزل گوئی کے معترف آج مجروحؔ، قتیل شفائی اور علی سردار جعفری بھی ہیں۔ علی سردارؔ جعفری نے بجا طور پر ایک نظم میں رضاؔ صاحب کے فن، ان کی علمیت، قادر الکلامی اور مجاہدانہ صفت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ (تبصرہ کی طوالت نظم نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔)

۶۰ء اور ۶۵ء کے بعد نئی شاعری کے تحت اپنے غالب رجحانات کے ساتھ ساتھ نظم اور غزل نے جو نئی صورتحال اختیار کی اور نئے شعراء نے جو قابل قدر اضافے کیے، نئے اسلوب کے ساتھ غزل کو ایک شناخت دی، یہی پہچان ترقی پسندی اور نئی شاعری کی حد فاصل ہے۔ پچھلے تیس برسوں میں وہ دائرہ (Cycle) پورا ہو گیا ہے، چنانچہ میں عبد اللہ کمال کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ رجحانات کی بناء پر شاعری کو مختلف خانوں میں بانٹنے سے گریز کرنا چاہیے اور شاعری کو صرف شاعری اور شاعر کو صرف شاعر قرار دینے پر اصرار کرنا چاہیے۔

کالی داس گپتا رضاؔ کی غزلوں کا عروضی تجزیہ

شارقؔ جمال

"غزل" اپنے چاہنے والوں میں ہمیشہ مقبول رہی ہے۔ یہ ہر دور میں شعری اوب پسند کرے والوں کی محبوب رہی ہے۔ غزل کی سدا بہار جوانی نے ہر طرح کے قاریوں کے اور سامعین کے دلوں کو لبھایا ہے۔ اپنے تمام پڑھے والوں اور سنے والوں کو رجھایا ہے۔ عزل کا سدا بہار حسن خزاں کی رُت سے ہر رمانے میں محفوظ رہا ہے۔

اردو زبان کے شعری اوب میں کئی اصناف شاعری نے سر اُبھارا۔ ان میں کئی بھارتی اصناف شاعری ہیں اور کئی بدیسی اصناف سخن بھی ہیں، لیکن کسی کے مقدر میں قسامِ ارل ے اتنی مقبولیت اور محبوبیت نہیں لکھی۔ اس صنف غرل کے مقبول عام ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غرل گو شعراء ے اور غرل کے تخلیق کاروں نے اس صنف شاعری کے لیے مترنم اور روح میں اُتر جانے والی لے پر آدھارت بحر داوراں ہی کو منتخب کیا ہے۔ ولیؔ دکنی سے آج کے شعراء تک سب ہی ے عزل گوئی کیلئے مترنم بحروں کا انتخاب کیا ہے۔ عرل کے اشعار تخلیق کرنے کیلئے شعراء نے رواں دواں بحروں کا ہی انتخاب کیا۔ ہمیشہ رواں دواں بحروں ہی کو برتا ہے۔

غزل کی رواں دواں بحروں میں ایک شعر کے دو مصرعوں میں اختصار و ایجار کے پیش نطر شاعروں ے حو بھی بات پیش کی ہے وہ روح میں اُترتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مقبول عام شاعروں میں مثلاً میر تقی میرؔ، مررا غالبؔ، سیمابؔ اکبر آبادی نے بھی عزل کے اشعار کی تخلیق کے لیے مترنم بحور کا انتخاب حس طرح کیا ہے بالکل اسی اندار میں ماہر غالبیات آنجہانی کالی داس گپتا صاحب رضاؔ نے بھی اپنے پیشرو شعراء کی طرح انھیں مترنم بحروں میں عزل کے اشعار تخلیق فرمائے ہیں۔

کالی داس گپتا رضاؔ، ماہر غالبیات ہونے کے ساتھ ایک عروض داں ہونے کی حیثیت سے بھی عروضی منازعات میں اردو دیا کے ماہر عروض رازؔ علامی سے تحریری مباحثے کیے ہیں۔ ان تحریری مباحثوں سے پتہ چلتا ہے کہ رضا صاحب کو علم عروض سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ اور جس اہل قلم کو علم عروض سے دلچسپی ہو وہ شعر ساری کے فن میں بھی عروضی کاری گری دکھاتا ہے۔ عروضی قواعد و نکات کو نظر میں رکھ کر شعر ساری کے عمل کو قرطاس کے حوالے کرتا ہے۔

اس وقت میرے سامنے رضاؔ صاحب کی غزلوں کا پورا پورا سرمایہ تو نہیں ہے۔ کچھ غزلیں برادرم نذیرؔ فتح پوری نے فراہم کی ہیں۔ اور کچھ سہ ماہی رسالہ توارن سے لی ہیں۔ انھیں کا مجھے عروضی تجزیہ کرنا ہے۔ اور قارئین کو بتانا ہے کہ اردو دنیا کے دوسرے عروض دانوں کی طرح رضاؔ صاحب نے بھی علم عروض پر نظر رکھ کر غزل کے اشعار تخلیق فرمائے ہیں۔ اس ماہر غالبیات نے غالبؔ کی (قریب قریب) عزلوں کے بحروں میں،

حن میں غالب نے اشعار کہے ہیں، اشعار تخلیق فرمائے ہیں۔ لیکن کچھ اور بحروں میں بھی شعر ساری کے عمل کو بڑھایا ہے۔

رضا صاحب نے اب تک جن بحروں میں غزل کے شعر تخلیق فرمائے ہیں، وہ بحریں یہ ہیں

۱)	بحر متقارب	مزاحف
۲)	بحر ہزج	سالم و مزاحف
۳)	بحر رمل	سالم و مزاحف
۴)	بحر رجز	مزاحف
۵)	بحر خفیف	مزاحف
۶)	بحر مضارع	مزاحف
۷)	بحر مجتث	مزاحف
۸)	بحر مقتضب	مزاحف

رضا صاحب نے ان آٹھ بحروں میں بحر ہزج اور بحر رمل میں سالم و مزاحف ارکاں میں اور بحر رجز، بحر خفیف، بحر مضارع، بحر مجتث، بحر مقتضب اور بحر متقارب کے مزاحف ارکان میں اشعار کی تخلیق کی ہے۔

بحر متقارب میں رضا صاحب نے جو اشعار کہے ہیں، وہ ارکاں مزاحف یہ ہیں۔ ذیل میں ارکاں کے ساتھ شعر بھی نقل کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں

بحر متقارب کے ارکان

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع	دھرتی ، امبر سے ٹکرانے والا میں
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع	دکھ سے مٹی ہوجانے والا میں
فعلن فعلن فاع فعولن فاع فعل	پھلواری کے روپ کا ضامن ہو نہ سکا
فاع فعولن فاع فعولن فعلن فع	وادی وادی، چوٹی چوٹی گھوم آیا

(ارکاں اثلم۔ اثرم۔ محذوف۔ ابتر)

فاع فعولن فعلن فعلن فاع فعول	دہن کھلا تو لفظوں نے دیوار بنادی
فعلن فعلن فاع فعولن فاع فعولن	تب آیا در کی رگوں سے شور مچاتا

(ارکان اثلم۔ اثرم)

فاع فعولن فاع فعولن فعلن	آج عدالت شب کو کھلے گی شاید
فاع فعولن فاع فعولن فعلن	صبح سے مصف، میری سرا لکھتا ہے

(ارکان اثلم۔ اثرم)

مندرجہ بالا شعر کے ارکان دونوں مصرعوں کے ایک ہی ہیں۔ لیکن اسی غزل کا ایک مصرع جس کے ارکان ان رکنوں سے الگ ہیں، وہ مصرع اور ارکان یہ ہیں

فعلن فعلن فاع فعولن فعلن — خط بیٔں تو وہ خود کو خدا لکھتا ہے

ایک غزل میں ارکان کی اس طرح کی تبدیلی اصولا درست ہے

فعلن فاع فعول فعولن — کب سے سولہ سنگھار کرو ہو

فاع فعولن فاع فعولن — کونسی منزل پار کرو ہو

فعلن فعلن فعلن فعلن — توڑو ہو اٹھتی کونپل کو

فعلن فعلن فاع فعولن — سیدھے دل پر وار کرو ہو

ایک غزل کے یہ دو شعر، چار مصرعے بھی اپنا الگ الگ وزن و ارکاں لیے ہوئے ہیں۔ یہ بھی اصولاً درست ہے کہ عروضی قاعدے کے مطابق ہی ہے۔ اس طرح کا اجتماع بحر متقارب میں جائز ہے۔ بحر متقارب میں اسی طرح کی اور بھی عروضی، زحافات کی باری گری ہے جس کو اساتذۂ فن نے درست قرار دیا ہے۔ اسی بحر میں ایک اور طرح کے ارکان ہیں

فعولن فعلن فعول فعلن فعول فعلن — وہ پھیلے صحراؤں کی جہاں مانیاں کہاں ہیں

فعولن فعلن فعول فعلن فعول فعلن — یہ سب تو گھر جیسا ہے وہ ویرانیاں کہاں ہیں

(ارکان محذوف۔ اثلم)

ان ارکاں میں ایک مزاحف رکن مقصور، "فعول" ہے۔ زحاف قصر عروض و ضرب یعنی آخری رکن کیلئے مخصوص ہے۔ لیکن اس وزن مقصور، اثلم میں کافی شعراء اور اساتذہ کے اشعار ملتے ہیں۔ یہ وزن "عروض سیفی" (فارسی) میں بھی موجود ہے۔ اس لیے اسے رضا صاحب نے بھی سامنے رکھ کر غزل کے اشعار کہے ہیں۔

بحر رمل کے ارکان

بحر رمل کے جن سالم و مزاحف ارکان میں رضا صاحب نے بھی اشعار کی تخلیق کی ہے، وہ یہ ہیں

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن — مہرباں ہو جب طبیعت زیست ہنستی بولتی ہے

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن — ساز بھی لب کھولتا ہے، شاعری بھی بولتی ہے

(ارکاں سالم)

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلان — مَیں نے کچھ پروا نہ کی، رکھی دکانِ عشق گرم

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن — نقدِ دل لٹتا گیا، نقصانِ جاں ہوتا گیا

(ارکان رکن آخر پہلا، مقصور، دوسرا محذوف)

اس بحر رمل میں رکن آخر اول مصرع میں فاعلان دوسرے مصرعے میں فاعلن بالترتیب مقصور، محذوف ہیں۔ چونکہ یہ اجتماع بھی اصولاً جائز ہے، اس لیے رضا صاحب نے اس قاعدے سے دوسرے شعراء کی طرح فائدہ اٹھاکر شعر کی تخلیق کی ہے۔

علاتن فعلاتن فعلاتن فعلن — نئے یگ کی تھی بشارت، کہ کہانی کیا تھا ؟

اعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن — شاہدِ صبح کا پیغامِ ربانی کیا تھا ؟

اعلاتن فعلاتن فعلاتن فعِلن — وہ جو لاوا سا بہا، دور مجھے پھونک گیا !

اعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن — آگ تھی اشکوں کی ، یا شعلوں کا پانی، کیا تھا

(ارکان ابتر، مخبون، مخبون محذوف)

ان دو شعروں کے پہلے مصرع کا پہلا رکن مزاحف فعلاتن مخبون ہے۔ یہ مخبوں رکن حشو میں بھی ہے۔ پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرع کا رکنِ آخر فعلن، عین ساکن ابتر ہے۔ تیسرے مصرع کا رکنِ آخر فعِلن، عین متحرک مخبوں محذوف ہے۔ یہ اجتماع بھی جائز ہے اور قاعدے کے مطابق ہے۔ اسی غزل کا ایک مصرع ہے اور اس کے ارکان ہیں

اعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان — اک تصادم تھا کہ تھا جہل کا اپنے اقرار

اس مصرع کا رکن آخر فعلان، عین ساکن ابتر مسبغ ہے۔ یہ اجتماع بھی اصولاً درست و جائز ہے۔ ر رکن آخر فعلان کی جگہ فعِلان عین متحرک مخبون مقصور بھی لایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی عروضی قاعدہ کے مطابق درست ہے۔ اس کا اجتماع بھی جائز ہے۔

انھیں عروضی قاعدے کے مطابق بحر رمل مثمن کے علاوہ بحر رمل مسدس میں بھی رضا صاحب نے شعار کہے ہیں۔ بحر مسدس میں بھی مندرجہ بالا ارکان میں مصرع کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

اعلاتن فعلاتن فعلن — پیاس، بے پانی کے نل پر جیسے

اعلاتن فعلاتن فعلن — زیست قربان اجل پر جیسے

(ارکان سالم۔ مخبون۔ ابتر بالترتیب)

علاتن فعلاتن فعلن — دلِ ناکام پہ حسرت کا نشاں

اعلاتن فعلاتن فعلن — داغِ محنت کفِ شل پر جیسے

(ارکان مخبون۔ مخبون محذوف۔ ابتر)

اعلاتن فعلاتن فعلان — میری تکمیل تمنا کی نہ پوچھ !

(ارکان سالم۔ مخبون۔ مشکول بالترتیب)

اعلاتن فاعلاتن — اے خموشی کے سمندر

فاعلاتن فاعلاتن   اک   ذرا   ہونٹوں   کو   رحمت

(ارکان سالم)

بحر رجز

بحر رجز کے ارکان سالم میں رضا صاحب نے غالبًا کوئی غزل نہیں کہی اگر کہی بھی ہوگی تو میری دسترس سے باہر ہے۔ ہاں مزاحف ارکانِ بحر میں جو شعر کہے ہیں، ان میں سے ایک شعر ذیل میں نقل کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں

مفتعِلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن   لمحۂ گل کا حسن ہے ، میری نوا میں اس لیے
مفتعِلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن   تم نے بھی جو سنا سا ، میں نے بھی جو کہا کہا!

(ارکان مطوّی مخبون بالترتیب)

بحر رجز کے رکن سالم 'مُستفعِلن' کا مزاحف مطوی رکن 'مفتعلن' ہے۔ اور مزاحف مخبون رکن 'مفاعلن' ہے۔

بحر ہزج

بحر ہزج میں شعرائے اردو نے کثرت سے شعر سازی کے عمل کو قرطاس پر لایا ہے۔ رضا صاحب نے بھی اس مذکورہ بحر میں جو اشعار کہے ہیں، ان کے ارکان رضا صاحب کے کہے ہوئے شعر کے ساتھ ذیل میں درج کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن   ہوائے شوق کا جھونکا تھا ، کندھوں پر اُٹھا لایا
مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن   مَیں اپنے پاؤں سے چل کر ترے کوچے میں کب آیا؟

(ارکان سالم)

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن   سلگتے دل کو کیوں کر آنسوؤں سے خشک کیجئے
مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن   دھوئیں ہی کا بگڑ کر نام تو بادل ہوا تھا

(ارکان سالم۔ محذوف)

بحر ہزج کے اس مثمن وزن رکن آخر محذوف میں کم ہی شعرائے اردو نے طبع آزمائی کی ہے۔ سالم بحر میں تو خوب کہا گیا ہے لیکن مثمن محذوف لآخر رکن میں شعر سازی کے عمل میں وزن سنبھالنے میں جو دِقّت ہوتی ہے، اسے شعراء خوب جانتے ہیں۔

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن   درویش کے ہاتھوں سے لٹتے ہیں زر و دولت
مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن   بے صبر کی نظروں میں ، ہر ہاتھ سوالی ہے

(ارکاں اخرب سالم)

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن	خوش رو بھی تھا گل ، باغ کے ماہر بھی نہیں تھا
مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن	سونگھا تو وہ کانٹے کے برابر بھی نہیں تھا

(ارکان اخرب۔ مکفوف)

مفاعیلن مفاعیلن فعولن	وہی کہتے رہے ، ہم تو نہ بولے
مفاعیلن مفاعیلن فعولن	نہ جانے دھر گئے الزام کیا کیا

(ارکان سالم۔ محذوف)

مفعول مفاعیلن فعولن	ہر چند انگلیاں قلم ہیں
مفعول مفاعیلن فعولن	ہر سانس پہ زمزمے رقم ہیں

(ارکان اخرب۔ مقبوض۔ محذوف)

بحر ہزج کا یہ وزن بھی زیادہ مستعمل نہیں۔ ارکان کا وزن اور تقطیع کے قواعد سے ماہر شاعر ہی نے اس وزن میں شعر سازی کے عمل کو قرطاس پر لایا ہے۔ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں کہ اس کے وزن کو سنبھالے اور بحر کے مطابق شعر کہے۔

بحر خفیف

بحر خفیف کے مستعملہ اوزان میں رضا صاحب نے بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

فاعلاتن مفاع لن فعلن	اک نظر دیکھ دوستوں کی طرح
فاعلاتن مفاع لن فعلن	کھل اٹھوں گا ترے لبوں کی طرح

(ارکان مخبون۔ مخبون محذوف لآخر)

فاعلاتن مفاع لن فعلان	پا بہ زنجیر ہیں مرے افکار
فاعلاتن مفاع لن فعلن	گو میں شاعر ہوں، پر برا نہ کہو

(ارکان مخبون ابتر مسبغ۔ مخبون مخبون محذوف)

فاعلاتن مفاع لن فعلن	حرف ترتیب پا گئے کیسے
فاعلاتن مفاع لن فعلن	دل کو دھڑکن بتا گئے کیسے

(ارکان مخبون۔ ابتر)

فاعلاتن مفاع لن فع	تو رضاؔ ایک پل پہ ناراں
فاعلاتن مفاع لن فع	میری نظریں دوام پر ہیں

(ارکان مخبون۔ مجحوف)

بحر خفیف کے اس مندرجہ بالا مخبون۔ مجحوف لآخر وزن میں نہیں کے برابر ہی اشعار کی تخلیق کی گئی

ہے۔ ایسی بحروں اور اوزان میں عروضی بصیرت رکھنے والا شاعر ہی قدم اٹھا سکتا ہے۔

بحر مضارع

بحر مضارع میں رضا صاحب کی صرف ایک تخلیق ہی میرے سامنے ہے۔ اس تخلیق کا یعنی بحر مضارع میں مزاحف ارکاں میں کہی ہوئی غزل کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں

مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن — کیا کیا نہ وار کاسۂ سائل پہ آئے ہیں
مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن — بے شک یہ سارے رحم مرے دل پہ آئے ہیں

(ارکاں اخرب۔ مکفوف مکفوف۔ محذوف بالترتیب)

بحر مجتث

بحر مجتث مزاحف میں رضا صاحب نے جو اشعار کہے ہیں، ذیل میں ارکاں کے ساتھ درج ہیں

مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلن — یہ دل بھی کیسے پرندے پہ ناز کرتا ہے
مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلن — جو زور ڈال سے گرتا ہے، زور مَرتا ہے

(ارکاں مخبون، مخبون، مخبون، ابتر)

مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلن — سکیڑ دیتی ہے جب وسعتوں کو سرد ہوا
مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلن — سخن تب آگ کے آنگن میں پاؤں دھرتا ہے

(ارکان مخبون محذوف الآخر۔ ابتر)

رُکن آخر میں چونکہ فعلن۔ عین متحرک اور فعلن عین ساکن کا اجتماع جائز ہے، اس لیے رضا صاحب نے اس قاعدے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

بحر مقتضب

بحر مقتضب کے مزاحف ارکان میں بھی رضا صاحب کے اشعار ملتے ہیں۔ ایک مطلع ہے

فاعلات مفعولن فاعلات مفعولن — روتے روتے وہ لمحے، یاد آئے پھر کیا تھا
فاعلات مفعولن فاعلات مفعولن — رنگ کی پھواریں تھیں، روشنی کا دریا تھا

(ارکان مطوی۔ مقطوع)

مندرجہ بالا بحور و اوزان کے علاوہ ممکن ہے اور بحروں میں بھی رضا صاحب نے اپنے قلم کا جادو دکھایا ہو جس سے میں لاعلم ہوں۔ مندرجہ بالا بحور و اوزان کے علاوہ جو شعر تخلیق فرمائے ہوں گے وہ اگر میری دسترس میں ہوتے تو میں ان کا بھی عروضی تجزیہ کرتا۔

ماہر غالبیات کالی داس گپتا صاحب رضا نے غالب کی کہی ہوئی تقریباً سب ہی بحروں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ علاوہ ازیں ان مشکل بحروں میں بھی شعر کی تخلیق کی ہے جن بحروں میں غالب کے شعر

نہیں ملتے۔ یا غالب نے ان بحروں کو برتا ہی نہیں ہے۔

جن بحروں میں غالب نے طبع آزمائی نہیں کی ہے اور رضا صاحب نے اشعار تخلیق کیے ہیں اور جو چند ہی بحریں ہیں، وہ یہ ہیں

(۱)	فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع	بحر متقارب
(۲)	فعلن فعلن فاع فعولن فاع فَعَل	بحر متقارب
(۳)	فاع فعول فاع فعول فعلن فع	بحر متقارب
(۴)	فاع فعول فعلن فعلن فاع فعولن	بحر متقارب
(۵)	فعلن فعلن فاع فعول فاع فعولن	بحر متقارب
(۶)	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن	بحر رمل
(۷)	فاعلاتن فاعلاتن	بحر رمل

کالی داس گپتا رضا صاحب جن کا انتقال ۲۱ر مارچ ۲۰۰۱ء کو ہوا ہے، ماہر غالبیات کے ساتھ ماہر عروض بھی مانے جاتے رہے ہیں۔ آپ نے مستعملہ اور اس شاعری میں بھی شعر کہے ہیں اور مشکل بحروں میں بھی شعر کہہ کر ادبی دنیا کو اپنی عروض دانی سے بھی متعارف کرایا ہے۔ جو شعر تخلیق کیا ہے پوری فنی چابک دستی کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ رعایات کی کاری گری پر بھی نظر رکھی ہے۔ اور ان کا بر محل استعمال بھی بطریقِ احسن خوب خوب کیا ہے۔

کالی داس گپتا رضا ایک شاعر، ایک محقق، ایک غالب شناس، اور ماہر عروض ہونے کے ساتھ ایک رقیق القلب، مخلص انسان بھی تھے۔ ادبِ اردو کی خدمت زبانی یا صرف قلم ہی سے نہیں کی ہے۔ مالی طور پر بھی یہ خدمت انجام دی ہے۔ رات دن کی پچاس، پچپن سالہ ادبی مصروفیات کے نتیجے میں آپ کی تقریباً ساٹھ کتابیں شائع ہو کر اہل ادب کے ہاتھوں تک پہنچی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی طرح کی کئی موضوعات کی کتابوں کے مسودے ہیں۔ جنھیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہونا ہے۔ اگر کچھ دن اور زندگی وفا کرتی تو یقیناً کئی اور کتب غالب شناس دیگر کتب کے ساتھ منظر عام پر آجاتیں۔

بہر حال جتنی بھی کتابیں رضا صاحب نے دنیائے ادب کے حوالے کی ہیں وہ سب اہم ہیں۔ ان کی مخلصانہ تحقیق و فکر کا نتیجہ ہیں۔ آپ کی نصف صدی سے بھی زیادہ محنت اور تحقیق اور فطری صلاحیت کا آئینہ ہیں۔ یہی وہ رضا صاحب کی کتب ہیں جو انھیں ادب کی دنیا میں زندہ رکھیں گی۔ غالب شناس، ماہر غالبیات کے ساتھ ساتھ ماہر عروض کی حیثیت سے آپ ہمیشہ دنیائے ادب میں زندہ رہیں گے۔

☆☆☆

Takia Masoom Shah, Momin Pura, Nagpur - 18, M S

نظم و غزل کا پہلا شعری مجموعہ

روشنی سب کو ملے

محمد ایوب راز (کویت)

P. Box No. 19852,
Pin Code : 83809
Old Khaitan, Kuwait
ayyub_raaz@hotmail.com

بابِ رباعی

کالی داس گپتا رضاؔ : اور چار مصرعوں کا سمندر

عبد الاحد ساز

آنجہانی کالی داس گپتا رضاؔ ایک ہمہ جہت ادبی کردار کے مالک تھے۔ چونکہ وہ بیک وقت ایک اعلیٰ پائے کے محقق بھی تھے، دانشور بھی اور شاعر و ادیب بھی اور چونکہ وہ بطور محقق اور بالخصوص بحیثیت ماہر غالبیات سند کا درجہ پا چکے تھے لہٰذا بطور شاعر ان کی حیثیت خود میں ثانوی سی ہو رہتی تھی اور ان کی محققانہ بالا قامتی خود ان کی شاعرانہ قامت کے آڑے آتی تھی۔ ان کی تحقیق و تدقیق پر تو درجنوں قلم کاروں نے خامہ فرسائی کی مگر ان کی شاعری پر اتنے انہماک اور سنجیدگی سے نہیں لکھا گیا جتنا کہ اس کا استحقاق تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے نہ صرف ایک اہم پختہ کار، ماہر اور صاحب نظر شاعر تھے بلکہ زبان و بیان، فن شعر و علم عروض پر ان کی قدرت بھی مسلمہ تھی۔ اولین مجموعہ کلام "شعلہ خاموش" سے لے کر آخری مجموعہ کلام "ابھی تازہ ماندہو" تک رضا صاحب کی کل چودہ شعری تصنیفات ہیں جن میں غزل، نظم، نعت، گیت، بھجن، سلام اور رباعی بھی شامل ہیں۔ ان کی غزل پر تو پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے لیکن ان کی نظم بالخصوص آزاد نظم اور رباعی ہنوز ناقدین کی خاطر خواہ توجہ کی منتظر ہیں۔ اگر ان کی رباعیات کا بغور جائزہ لیا جائے تو وہ ایک بڑے نہ سہی مگر ایک بہت اچھے اور اہم رباعی گو شاعر کے روپ میں بھی ابھر کر سامنے آئیں گے۔

کسی قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر کا رباعی کے میدان میں طبع آزمائی کرنا لازمی تو نہیں، تاہم رباعی ایک ایسی صنفِ سخن ضرور ہے جو کہ اپنی ساخت اور تکنیک کے اعتبار سے کسی بھی پختہ کار شاعر کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ رباعی کے تقطیعی اوزان کی پیچیدگیوں، صوتی حرکات و سکنات کی نزاکتوں اور اس معنوی و موضوعاتی نظام کو جسے اساتذہ نے قائم کیا ہے، اپنے دست اختیار میں لے لینا، ایک عمر کی فنی ریاضت اور ذوق و شعور کی بالیدگی کے بغیر ممکن نہیں۔ رباعی کو چار مصرعوں کے ایسے سمندر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس میں ایک نمائندہ قاری ایک کامیاب رباعی گو شاعر کے ہمراہ، لہروں کے زیر و بم پر تیرتا، غوطے لگاتا، کبھی سمندر کے اندرونی نظارے سے لطف اندوز ہوتا، کبھی ایک جھٹکے کے ساتھ سطح پر آ نکلتا، رکتا اور بہتا ہوا تفہیم کی منزل تک پہنچتا ہے۔

کالی داس گپتا رضاؔ کی رباعیات کے مجموعے "شعاع جاوید" کے بالاستیعاب کے مطالعے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ان رباعیوں کا خالق اس چار مصرعوں کے سمندر کے صوری و صوتی مد و جزر اور معنوی رموز و اسرار کو برتنے پر خاطر خواہ قدرت رکھتا ہے۔ آواز کے زیر و بم کے نشیب و فراز کے ساتھ ہم آہنگ کر کے الفاظ و معانی کی کشاکش کے درمیاں سے اظہار کی سمت متعین کرنے کا سلیقہ و ہنر ان رباعیوں میں کئی جگہ بدرجہ کمال نظر آتا ہے۔

☆☆☆

رضا صاحب بحیثیت رباعی گو

ساحر شیوی

تاریخ ادب کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صنف رباعی اہل عجم کی ایجاد ہے اور سب سے پہلے ایراں کے مشہور و معروف شاعر رودکی کو رباعی کہنے کا شرف حاصل ہوا۔ اردو زبان میں جن شعراء نے صنف رباعی میں طبع آزمائی فرمائی ہے اس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ شعرائے اردو نے شعرائے فارسی کی پیروی کی ہے۔ فارسی کے مشہور رباعی گویوں میں عمر خیام، سرمد، بابا افضل کاشانی وغیرہ کی رباعیاں رباعی گوئی کا اعلیٰ معیار قائم کرتی ہیں اور عام شاعرانہ آواز سے بلند ہو کر کہی گئی ہیں۔ رباعی کے میداں میں ان شعراء کو جو کامیابی اور شہرت نصیب ہوئی وہ اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ صنف رباعی میں عمر خیام کو جو درجہ حاصل ہے، آج تک کوئی شاعر اس مقام تک رسائی نہ کر سکا۔ اس صنف میں عمر خیام کا ایک منفرد مقام ہے اور بلاشبہ وہ شہنشاہ رباعی ہیں۔

اردو زبان میں بھی چند اچھے رباعی گو شاعر ہیں جن میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، تلوک چند محروم، امجد حیدر آبادی اور یگانہ چنگیزی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان شعراء میں دیکھا جائے تو سب سے پیش پیش شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نظر آتے ہیں اور بعض وقت ان کی رباعیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا احساس ہوتا ہے کہ وہ خیال سے بہت قریب ہو کر گزرے ہیں۔ فراق گورکھپوری کے تغزل میں جو بات پائی جاتی ہے وہی رنگ اس کی رباعیوں میں بھی جھلکتا ہے۔ اس کی رباعیات میں جمالیاتی رنگ اس قدر ہے کہ وہ کسی اور کی رباعیوں میں نہیں پایا جاتا۔ ان رباعیاں میں ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے یہ اتنی آسان اور عام فہم زباں میں کہی ہیں کہ ایک معمولی شخص بھی اس کے مقصد کو سمجھ سکتا ہے۔ سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ زندگی کی وہ کیفیت بھی ملتی ہے جس کو حسن و عشق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر یہی بات جوش ملیح آبادی کے کلام میں نہیں ملے گی۔ ان کی رباعیات کا نچوڑ حاصل کرنے کے لیے لغات سامنے رکھنے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی رباعیوں میں فلسفیانہ افکار اور خود کلامی کی کیفیت کا بے باکانہ اظہار کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے فراق کی رباعیاں میری نظر میں سلیس زباں کے سبب عوام میں زیادہ مقبول ہو سکتی ہیں۔ یگانہ کی رباعیاں تیر و نشتر کی طرح ہوتی ہیں اور ان کی گہرائی بھی زیادہ ہے۔ تلوک چند محروم، امجد حیدر آبادی کی رباعیات میں حقائق و معارف کے بیانات، زمانے کی ستم ظریفیوں کے خلاف مضامین نہایت حسن و خوبی سے نظم کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری میں بھی رباعی کی صنف کافی مقبول ہے اور چند شعراء کی رباعیات فارسی شعراء کے ہم پلہ قرار دی جا سکتی ہیں۔

ہر چند رباعی کا میداں بہت ہی محدود ہے۔ چار مصرعوں میں اہم سے اہم اور ملند سے ملند مفہوم نظم
جاسکتا ہے۔ بعض اوقات وہ خیال جو غزل کے ایک شعر میں سمانا مشکل ہو جاتا ہے، رباعی کے دو شعروں میں
مالی کے ساتھ سما سکتا ہے۔ اسے ایک سہی غزل کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ اس طرح رباعی کا دامن مختصر ہوتے
ئے بھی وسیع ہے۔ سید محمد حسن بلگرامی نے رباعی کی اس وسعت کو خیاباں عرفاں کے دیباچے میں اس طرح
ح کیا ہے

"چار مصرعوں کی بساط ہی کیا، لیکن اس مختصر اور تنگ چار دیواری کے اندر معارف و حقائق کی بستیاں
ر آتی ہیں اور اس چھوٹے سے چوکھٹے میں مصوری کے ایسے نادر نکمل نمونے جڑے جاتے ہیں کہ اہل نظر
ں بہ دیوار ہو کر رہ جاتے ہیں "

اردو ادب میں رباعی کو ایک نہایت ہی مشکل صنف کہا گیا ہے اور اسی لیے بہت کم شعراء اس کی طرف
ب ہوتے ہیں اور اس کے پیچیدہ اور محدود اوزان میں الجھنا پسند نہیں کرتے۔ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی
رہ و قلزم کے ابتدائیہ میں فرماتے ہیں

"رباعی ایک بہت بڑی بلا ہے اور نہایت جاں لیوا صنف کلام ہے۔ یہ کم بخت چالیس برس سے پیشتر کسی
ے سے بڑے شاعر کے بس میں آنے والی چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ جب تک کسی شاعر کو بے پناہ مشاقی اور
ہ وری کی بدولت دریا کو کوزے میں بھر لینے کا فن نہیں آتا، اس وقت تک رباعی اس کے قابو میں نہیں آتی"

میں جس شاعر کا ذکر رباعی گو کی حیثیت سے کرنے والا ہوں، اس نے اپنی زندگی کا لگ بھگ ربع
ری حصہ مشرقی افریقہ کے صحراؤں میں پھول کھلاتے ہوئے گزارا ہے۔ اس مشہور و معروف شخصیت کا نام
داس گپتا رضا ہے۔ جس نے ۲۵ر اگست ۱۹۲۵ء کو مکند پور ضلع جالندھر کے مشہور اگروال خاندان میں
ھیں کھولیں اور ۱۹۴۹ء میں مشرقی افریقہ کی دھرتی پر قدم رکھا۔ اپنی ادبی زندگی کے بیس سال گویا وہاں
ارے جہاں اردو کے سورج کی کرنیں نہ پہنچنے کے برابر تھیں۔ اس کے باوجود وہ اردو ادب کی تخلیق کرتے
ہے۔ "شعلہ خاموش" اور "شورش پنہاں" اسی عہد کی یادگار ہیں۔ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے بیاں کے
طابق یہ صنف چالیس برس سے پہلے قابو میں نہیں آتی۔ مگر "شعلہ خاموش" (رضا صاحب کا پہلا مجموعہ کلام
۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا) کے مطالعے سے یہ آگہی ہوتی ہے کہ رضا صاحب چالیس سال کی عمر سے بہت پہلے
اعی کہنے کا آغاز کر چکے تھے۔ "شعلہ خاموش" کی رباعیوں پر جو سنہ عیسوی دیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ
ہوں نے اس صنف پر پچیس سال کی عمر ہی میں قابو پالیا تھا۔ اب انھیں اس پر پورا پورا عبور حاصل ہے۔ سب
ے بڑی بات یہ ہے کہ افریقہ کے صحراؤں اور خارزاروں میں مقیم ہو کر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں اور یہی وہ چیز
ہے جس نے مجھے یہ مضمون لکھنے پر اکسایا۔ "شعلہ خاموش" کے تبصروں میں کوکن کے مشہور شاعر و ادیب بدیع
ماں خاور (مرحوم) نے تو اس مجموعے میں سب سے زیادہ کامیاب حصہ رباعی کا ہی قرار دیا۔ اس مجموعے میں

انھوں نے چالیس رباعیاں ہی پیش کی ہیں۔ میں رضا صاحب کے کافی قریب رہا ہوں۔ لہٰذا میں جانتا ہوں کہ اس وقت ان کی زنبیل میں رباعیوں کا اور بھی ذخیرہ موجود تھا اور مجھے ملاشبہ وہ ایک دن رباعیات کا الگ مجموعہ شائع کر کے میدان رباعی میں تہلکہ مچا دیں گے۔ میرا یہ تصور سچ ثابت ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں ان کی رباعیات کا علاحدہ مجموعہ "شعاعِ جاوید" کے نام سے شائع ہو کر اُردو دنیا سے داد حاصل کر چکا ہے۔ "شعاعِ جاوید" کے پیش لفظ میں گوپی چند نارنگ فرماتے ہیں

"رباعی کو مشکل صنف کہا گیا ہے۔ شاید ہیئت کے اعتبار سے نہیں، معنی کے اعتبار سے کہ تین مصرعوں میں بات کو کھولنا اور چوتھے مصرعے میں مکمل کرنا صرف مصرعے جوڑنے کا معاملہ نہیں بلکہ اکمل، اس طرح سے ہو کہ نکتہ آفرینی کا حق ادا ہو جائے۔ یہ ہے رباعی کا کمال۔ کتنے اہلِ کمال اس پر پورے اترتے ہیں، چار مصرعوں کی "حنگل سدی" تو سب کر لیتے ہیں۔ رضا کی رباعیوں کو پڑھ کر خوشی یوں ہوئی کہ ان میں خیال کو ہتھیلی پر پکڑنے، ان کے رنگوں کو گرفت میں لینے اور ان سے اظہار کا ہیولہ تیار کرنے کا جوہر ملتا ہے اور ان رباعیوں میں سوچنے والا ذہن ملتا ہے "

"کالی داس گپتا (رضا) کی یہ رباعیات جو کم و بیش چالیس سال کی مشقِ سخن کی آئینہ دار ہیں، ہمارے عہد میں رباعی گو کا اعلیٰ معیار قائم کرتی ہیں۔ یوں تو عشقیہ جذبات یا مناظرِ فطرت کی عکاسی یا زندگی کے روزمرہ کے معاملات کی تصویر کشی پر مبنی رباعیات کہی گئی ہیں اور ایسی رباعیاں بھی کم نہیں ہیں جن میں خود کلامی کی کیفیت ملتی ہے۔ کالی داس گپتا رضا کی رباعیاں بیشتر تفکیری رنگ کی حامل ہیں۔ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ شاعر عام انسانی سطح سے کچھ بلند ہو کر عام شاعرانہ آواز سے کچھ اونچی آواز میں گفتگو کر رہا ہے "

عبد اللہ کمال فرماتے ہیں

"یوں تو رضا صاحب کی دوسری اصنافِ شعری بھی اسی خوبی و صفائی، زباں، وسعتِ فکر اور لطافت و نفاست تخیل سے مملوء ہیں، لیکن رباعیوں میں پرواز فکر جس وقار و تمکنت، تہہ داریت اور انسانی جذبہ خیر سگالی سے آشنا ہوئی ہے اس سے ان کے ذہنی افق کی وسعت اور رباعی کی امکانی حدود میں کشادگی کا اندازہ ہوتا ہے"۔

"شعلہ خاموش" کے منظرِ عام پر آتے ہی یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ رضا صاحب کو اردو شاعری کے فن پر قدرت حاصل ہے اور یہ کہ انھوں نے ہر صنف میں خوبصورت پھول کھلائے ہیں۔ مگر رباعی جو کہ مشکل ترین صنف ہے ان کے لیے آسان ترین مشغلہ ہے۔ انھوں نے اس فن کی باریکیوں اور گہرائیوں کو ناپ لیا ہے۔ انھیں علم عروض پر بھی عبور حاصل ہے۔ اس کی ایک مثال مجھے یاد ہے۔ رسالہ شاعر بمبئی شمارہ نمبر ۱۲، ۱۹۶۷ء میں "لحن صریر" پر ادارہ، شاعر کی جانب سے تبصرہ شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ پاکستان کے مشہور شاعر عبد العزیز خالد کی رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس تبصرے پر کم و بیش شعراء اور نقادوں نے تعریف کے پل باندھ دیے۔ اس میں چند ایسے مصرعے دیے گئے تھے جو ادارہ شاعر کے تبصرہ نگاروں کے خیال کے مطابق

اوراں سے ماہر تھے۔ رضا صاحب نے ان تمام اوراں کی جامی کی مشہور رباعیوں سے مثالیں دے کر مصنف کو اس کا حق دلایا۔ ہندوپاک میں بہت سے علم عروض کے ماہر ہیں۔ کسی سے یہ نہ ہوا کہ مصنف کو اس کا جائز حق دلواسکے۔ رضا صاحب کی یہ مثالیں رسالہ شاعر کے شمارہ ۴ اور ۵، ۱۹۶۸ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا حالی وہ پہلے ادیب و شاعر ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں قوم و وطن کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی سعی کی۔ اپنے ملک و ملت سے ان کی الفت کسی بڑے محب وطن سے کم نہ تھی۔ لیکن اخوت اور محبت کا تقاضہ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے مانند محض بیداری انقلاب کے بلند نعروں سے پورا نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اس کے لیے ملت کی بے لوث خدمت کرنا، فرقہ وارانہ منافرت کو مٹا دینا اور سب سے برادرانہ تعلقات رکھنا ضروری تھا۔ رضا صاحب نے ہر چند افریقہ کے صحراؤں میں بیس سال خاک چھانی اور ان کی شاعری یہیں پرواں چڑھی۔ لیکن ان کے دل میں اپنے وطن سے دور رہ کر بھی وطن پرستی کا جذبہ اُمڈ تا رہا۔ وہ فرقہ وارانہ تعصبات کو مٹانے کے دل سے متمنی تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مذہب کے نام پر بھائی بھائی میں خون کی ہولی کھیلی جائے۔ شیخ و برہمن، دیر و حرم کے جھگڑوں سے قوم اُبھر نہیں سکتی۔ ایسے خیالات کو انھوں نے اپنی رباعیوں میں کتنا حسین جامہ پہنایا ہے

باتیں ایک دوسرے کی سہنا سیکھو دریا میں رنگ موج بہنا سیکھو
بے سود ہیں یہ دیر و حرم کے جھگڑے مل جل کر بھائیوں سے رہنا سیکھو

☆

ہر وقت غم قوم مٹاتے رہنا ہر حال میں کام اس کے آتے رہنا
تم بحر شجاعت کے شناور ہو رضا طوفانوں میں بھی کشتی کو چلاتے رہنا

علامہ اقبال نے فلسفہ خودی کو اپنے اشعار میں یوں اجاگر کیا کہ کوئی شاعر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ رضا صاحب بھی اس مقصد کی طرف آتے ہیں۔ وہ بھی اپنی قوم ہی سے مخاطب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں

جو قوم خودی دل سے مٹا بیٹھے گی نام اپنا وہ مردوں میں لکھا بیٹھے گی
بلی بھی اگر ہوگی ضعیف و لاغر کاں اپنے وہ چوہوں سے کٹا بیٹھے گی

وہ کہتے ہیں

موج اپنا پتہ دیتی ہے اٹھ کر بہہ کر ساحل نے صفت پائی ہے ثابت رہ کر
انساں کب انساں کہا جائے گا دھتکارے جو دنیا اسے کتا کہہ کر

موج اپنی خودی کا اظہار اٹھ کر بہہ کر کرتی ہے۔ ساحل نے مضبوط رہ کر اپنی خودی کو قائم رکھا ہے۔ مگر کیا انسان کو اس وقت ہی ہوش آئے گا جب اسے دنیا کتا کہہ کر پکارے گی، اس سے پہلے ہی کیوں نہ خودداری کو سمویا جائے۔ دل میں کیوں نہ ایسے جذبات پیدا کیے جائیں جس سے خود کو ٹھیس نہ لگے اور ذلت اٹھانی نہ پڑے۔

اردو رباعی کو جن شعراء نے نکھارا اور سنوارا ہے ان میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا نام سر فہرست ہے۔ خاص کر اس کو تصویر کشی، منظر نگاری میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ رضا صاحب کا ذہن بھی مناظر قدرت سے خالی نہیں۔ اس کی یہ دو رباعیاں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں، دیکھیے۔ کتنے حسین پیرائے میں اماوس اور پونم کی رات کی منظر نگاری کی ہے

ہر سمت رواں دواں ہے کالا دریا تاریک مہیب ، بے محابا دریا
دل کیسا بہا جاتا ہے بستی کی طرف یہ رات اماوس کی کہ غم کا دریا

☆

ہر سو ہے رواں دواں روپہلا دریا پر نور ، ضیا بار ، مصفّٰی دریا
دل کیسا بہا جاتا ہے حنداں حنداں یہ رات ہے پونم کی کہ ہنستا دریا

"شعلہ خاموش" کے دیباچے میں ایک جگہ آنریبل جسٹس چانن سنگھ فرماتے ہیں

"شعلہ خاموش کا دیباچہ لکھنے کی ذمہ داری لینے سے قبل میں نے اپنے آپ کو پورے طور پر رضا صاحب کی صاف گوئی کی سختیاں برداشت کرنے کے لیے تیار کرلیا تھا اور واقعی مجھے ان سختیوں سے دوچار ہونا بھی پڑا کیونکہ موجودہ زمانے میں انصاف کا پلڑا امیر طبقے کی جانب ہی جھکتا ہے"

قانون کو سیم و زر سے تلتے دیکھا اکثر بھرم انصاف کا کھلتے دیکھا
اڑتی ہے جو خاک عدل کے رستوں سے منصف کو اسی خاک میں رلتے دیکھا

چونکہ آنریبل جسٹس چانن سنگھ کا تعلق بھی کیمیا کے قانون اور عدالت سے تھا، لہٰذا وہ آگے چل کر لکھتے ہیں

"رضا صرف منصفوں اور عدالتوں پر برستا نہیں، وہ اپنے طبقے یعنی زرداروں پر بھی یکساں طور پر حملہ آور ہوتا ہے اور موقع ملے تو دولت مندوں کی کھال کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ دولت مندی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس کی آواز بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ وہ بھی بہت سے لوگوں کی طرح اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ زرداری کا ایک نہ ایک دن خاتمہ ہو کر رہے گا۔ لہٰذا وہ فرماتا ہے

زردار کو ہاتھ زر سے دھونا ہوگا خود ساختہ اعتبار کھونا ہوگا
بکرے کی ماں منائے گی کب تک خیر اک دن تو اسے حلال ہونا ہوگا

اردو ادب میں طنز و مزاح کی اہمیت بھی کم نہیں۔ ابتدا میں یہ شاید ہجو کی صورت میں نمودار ہوئی ہوگی اور رفتہ رفتہ اس نے طنز کی صورت اختیار کرلی۔ ہجو گوئی میں سودا کو مہارت حاصل تھی۔ مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے طنز گوئی میں کسی کو نہیں چھوڑا اور اپنے کلام میں بڑے سے بڑے شاعر کی پگڑی اچھالنے سے بھی باز نہ رہے۔ یگانہ آرٹ نے اردو ادب میں کچھ ایسی شہرت حاصل کرلی کہ تھوڑے سے عرصے میں مرزا یاس کا نام

جگمگانے لگا۔ یگانہ کے بعد واہی، کنہیالال کپور، غلام احمد فرقت، دلاور فگار کے نام پیش پیش ہیں۔ آپ کو ہم رضا صاحب کی چند رباعیاں بھی سناتے ہیں۔ ایسی شاعری جو علم عروض کی دھجیاں اڑانے اور فن شاعری کو مٹانے میں کوشاں ہیں۔ یہ رباعیاں بہت عرصہ پہلے کہی گئی تھیں

اسلاف نے جس راہ میں ڈھوئے پتھر برسوں سے رواں دواں ہو جس رستے پر
لوڑھے کو نئی پگڑی سجے گی کیونکر اے شاعرو بدلو نہ اسے ہوش کی لو

☆

محفل میں بہت تھوڑے ہنر مند ملے مخمل میں کئی ٹاٹ کے پیوند ملے
باقی جو تھے پینتیس وہ "تک بند" ملے چالیس میں بس پانچ ہی شاعر ہوں گے

کچھ ایسے فنکار بھی ہیں جو فن عروض کو جانے کی کوشش نہیں کرتے اور مصرعہ اول اور مصرعہ ثانی اور مصرعہ چہارم میں قافیہ رکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ رباعی ہوگئی۔ رباعی کے اوزان ہیں جو بحر ہزج سے نکلے ہیں اور ان کی تعداد چوبیس ہے۔ اس کے متعلق رضا صاحب کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے

بے راہ روی کا بوجھ سر پر دھر لو اوزان غلط سے اپنا دامن بھر لو
ارماں بحر وری کا پورا کرلو قطعوں کو رباعیات کہنے والو

۱۹۸۵ء میں رضا صاحب کی رباعیات کا جو مجموعہ "شعاع جاوید" کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں کم و بیش ایک سو اسی رباعیاں ہیں۔ اس میں پہلے مجموعہ ہائے کلام میں شائع شدہ رباعیاں بھی شامل ہیں مگر بیشتر رباعیاں نئی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے

اول سے اخیر تک اجالا میں ہوں سورج میں ہوں، چاند میں ہوں، ہالا میں ہوں
ظلمات کو مات دینے والا میں ہوں بخشی ہے حیات کو شعاع جاوید

☆

انسان کا ہوتا ہے دوامی کردار فانی نہ کہو، ہوتا ہے کم اس کا وقار
ہر رات سے پیدا ہیں سحر کے آثار مایوس ہو کیوں وقت کی ظلمت سے کوئی

☆

تکبیر کے پرچم کو گڑا رہنے دے رحمان ہے تو سزا جزا رہنے دے
اک بار جو کھل گیا کھلا رہنے دے اب جشن بہار، اب خزاں، یہ سب کیا

☆

مستقبل کی صدا میں ڈھل جائیں گے ہاں، حال کی پیروی سے ٹل جائیں گے
ہم وقت سے کچھ آگے نکل جائیں گے تم وقت کے ہمراہ نہ پاؤ گے ہمیں

☆☆☆

شعاعِ جاوید (رباعیات): کالی داس گپتا رضاؔ

مولانا حسن عباس فطرت

رباعی فارسی سے اردو میں آئی۔ یہ حادیت سرمد و عمر خیام کی دین ہے اور اردو کے تقریباً سبھی اساتذہ نے اس صنف حسین پر جان دی، مگر دردؔ، انیسؔ، حالیؔ، اکبرؔ، رواںؔ، امجدؔ، جوشؔ، اختر انصاری کے سوا کسی کو دارائی نصیب ہوئی نہ انیسؔ و امجدؔ کے آگے کوئی جاسکا۔

ادھر رئیس امروہوی سے کرشن موہن تک کئی ایک ہندو پاک کے معاصر شعراء نے رباعی کو اپنایا ہے۔ کسی نے اردو ہندی کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ کسی نے فلسفۂ حیات مسمات کی گرہیں کھولی ہیں۔ کسی کے یہاں حکیمانہ نکات ملتے ہیں، کہیں واردات قلبی و تحرمات رندگی۔ اس طرح ہمارے دور میں رباعی کے نو امکانات پہلے سے زیادہ روشن ہوگئے ہیں۔ اور ان امکانات کو اس طرح نمایاں کیا گیا ہے کہ شاعروں کے علاوہ شعر و سخن کے شیدائی بھی۔ اس میں نئے سرے سے دلچسپی لینے لگے ہیں۔ یہ تبدیلی خوش آئند و پر مسرت ہے۔

اردو میں انیسؔ رباعیات کا امام ہے۔ اس نے نازک سے نازک اور باریک مضموں کو فصیح اردو اور روزمرہ میں ادا کرنا سکھایا۔ حالیؔ نے اپنی سادگی بیان و جذبہ کے خلوص کی وجہ سے اس فہرست میں جگہ پائی تو اکبرؔ نے سیاسی و معاشرتی بصیرت و نکتہ آفرینی سے۔ رواںؔ کو لوگ نہیں بھول سکتے۔ جدید فلسفیانہ مذاق اور پیار کی دل آویزی کے باعث، لیکن امجدؔ کا ایجاز، زور بیان اور حسن کارانہ انداز سب کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ لفظوں کی در و بست میں بھی اس کی صفائی حیرت انگیز ہے۔ اگر انیسؔ اردو رباعی کے آدم تھے تو امجدؔ خاتم ہے۔

رباعی کی کامیابی کے لیے قوافی کی موزونیت، الفاظ کی شیرینی، معانی کی لطافت، تشبیہات و استعارات کی ندرت کے ساتھ ساتھ موسیقی کے نقطۂ نظر سے دل پسند آہنگ کی بھی ضرورت ہے۔ رباعی میں نغمگی ترنم کا عنصر لازم ہے اسی لیے اس کے اوزان مقرر کیے گئے ہیں۔ اس سے باہر چار مصرعے ہوں گے، قطعہ ہوگا رباعی نہیں ہوگی۔ عام طور سے مفعول، مفاعیل، مفاعلین و فاع کا وزن زیادہ متداول و مستعمل ہے آسانی کے لیے لا حول و لا قوۃ الا باللہ کا سانچہ سامنے رکھ کے بھی رباعی کہہ سکتے ہیں۔ اسی لیے بابا طاہر عریاں کے چار مصرعی قطعات اور اقبال کی دوبیتی کو رباعیات سے منسوب کرنے والے کو گمراہ کن کہا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ فکر کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے ہر دو شعری مربوط موثر کلام رباعی نہیں ہوا کرتا۔

اس تمہید کی ضرورت یوں پیش آئی کہ کالی داس گپتا رضاؔ جو کم و بیش نصف صدی سے ہر صنف میں طبع آزمائی کرکے داد سخن حاصل کرچکے ہیں۔ قدرت کلام اور فن مہارت کے اعتبار سے انفرادیت منوائے اور غزل و نظم کے کئی مجموعے شائع کرنے کے بعد رباعی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی رباعیاں بہت منجھی اور نکھری ہوئی، معنویت سے بھرپور اور پر شکوہ و اعلیٰ رتبہ کی حامل ہیں۔ انھوں نے لفظوں کی تراش

خراش میں بھی بڑی ہنر مندی و دقت سے کام لیا ہے اور مضامین میں بھی علو اور صلابت کا خیال رکھا ہے۔ رضا کی رباعیات یک رنگی نہیں ہیں بلکہ اس میں انداز بیاں کے مختلف تیور اور انداز ملتے ہیں۔ البتہ رومانی رباعیات کی مقدار بہت ہی کم ہے۔

رضا کی رباعیاں زندگی کے تجربات اور کائنات کی ہست و بود، احساسات کی بلندی و پستی کی پروقار تصویریں ہیں جس میں شاعر نے لہجہ کی چاشنی کے ساتھ لفظوں کے برمحل استعمال سے رنگ بھرا ہے۔ ان رباعیوں کو پڑھئے تو پتہ چلے گا کہ شاعر نے خیالات کے پیکر کا لحاظ کر کے اسے الفاظ کا لباس تو دیا ہے ہی ہے اس سے آگے یہ کہ مصرعوں کی حرکت کی رفتار بھی کافی ناپ تول کے رکھی گئی ہے شمس الرحمان فاروقی نے بالکل درست لکھا ہے کہ "یہ رباعیاں ہمارے عہد میں رباعی گوئی کا اعلیٰ معیار قائم کرتی ہیں۔"

رضا صاحب کے پاس گیان بھی ہے اور دھیان بھی، اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں صفات سے متصف اس کی شخصیت کی پرتیں غزل میں نہیں رباعیات میں ہی کھلتیں دکھائی دیتی ہیں، ملاحظہ ہو

محتاط رہو اور پھرو اجلے اجلے کیوں دیکھ کے کوہ ریت چھاتی دہلے
بس تازہ دموں سے سار کرلیا ہے ہر سانس سے تیں چار سانسیں پہلے

اس رباعی میں لفظی و معنوی کے بہت سے محاسن جمع ہیں۔ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو طوالت ہوگی۔ لہٰذا یہاں ہم بغیر کسی خاص اہتمام کے چند رباعیات نقل کرتے ہیں اور فیصلہ اہلِ نظر کے حوالے کر کے مجبوراً محفل برخواست کرتے ہیں

تا آخر دم، دل سے جواں رہتا ہے بیزار جہاں، مست جہاں رہتا ہے
مذہب بھی ٹھہر جاتا ہے اک نقطے پر انساں سدا رواں دواں رہتا ہے

☆

ہو آنکھ تو خوبیاں عیاں ہوتی ہیں پانی ہو تو کشتیاں رواں ہوتی ہیں
برکھا سے نکھرتا ہے گلستاں کا رنگ انصاف سے اقوام جواں ہوتی ہیں

☆

ظلمات میں مستور ہے منزل تیری افلاک سے بھی دور ہے منزل تیری
کیوں آج تک رہے گرم روی کے حامی بے سایہ و بے نور ہے منزل تیری

حسن اتفاق سے جیسا کلام ہے کتابت بھی اسی معیار کی ہے۔ ڈیڑھ سو سے زائد رباعیات، نو صفحے کا مقدمہ (از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) اور اتنی عمدہ کتابت، گٹ اپ، کاغذ کی نفاست کے لحاظ سے قیمت کم ہے۔

☆☆☆

رباعیاتِ رضاؔ

روش ہے بجھی ہوئی یہ قندیل نہیں — توقیر ہے ہر سانس کی، تذلیل نہیں
ہر لمحہ سفر ، جنبشِ پیہم ، کوشش — یہ زیست عمل کا دن ہے ، تعطیل نہیں

☆☆☆

صناعِ ازل نے کیا بنائی ہستی — پندار ، خمار ، ہوش مندی، مستی
اک ٹھاٹھیں مارتا ، بپھرتا دریا — ہستی ہستی چہار جانب ہستی

☆☆☆

نَے شام کے سائے ، نہ سحر کے انوار — ٹھہراؤ نظر کا ، نہ خرد کی پروار
آفاق ، فنا صفت ، سکوتِ پیہم — انسان ، نحیف سانس ، ہلکی آوار

☆☆☆

جو رہ گئی ان سنی وہ تلقیں ہوں میں — تردید میں لپٹا ہوا آئین ہوں میں
اے سب کو غلط رنگ میں رنگنے والے — بے رنگ بھی ہے رنگ تو رنگین ہوں میں

☆☆☆

شِو شنکر ، وشنو ، بدھ ، رودریش، اکال — گیانی ، دھیانی ، امنت ، آدی سکھ پال
یا تو ، اس میں ہے ، یا یہ سب کچھ تجھ میں — بدمستیِ باطن میں کوئی حال نہ قال

☆☆☆

یہ دیر کہ مسجد ، یہ طرب گہہ کہ کھنڈر — اللہ رے یہ وسعتِ نظر ، یہ منظر
رہتے ہیں آپ تو فلک پر جیسے — ہم اہلِ فلک سے ایک منزل اوپر

☆☆☆

سوکھے ہوئے گلشن سے تو جنگل اچھا — زہر اب بھی پینا ہو تو زرجل اچھا
جو تن کا سفید اور ہو کالا من کا — اس جھوٹے ملمع سے تو پیتل اچھا

☆☆☆

کانوں میں اک ان سنی صدا سی آئی — دامن میں نئی فکر و خبر بھی لائی
تہہ خانوں سے لوٹ سی گئی تاریکی — تخئیل میں یوں سما گئی گہرائی

☆☆☆

جب میں نے حقیقت کی نظر پائی تھی — دکھ درد کا موسم تھا گھٹا چھائی تھی
دن چڑھنے میں باقی تھے ابھی سو لمحے — اور رات بہت نیچے اتر آئی تھی

☆☆☆

کالی داس گپتا رضا کا آخری خط ارشد صدیقی کے نام

محبِ مکرم آداب 12/2/2001

پانچ کتابیں آپ کی اور ایک مجموعۂ کلام محبی نصیر پرواز کا ایک ساتھ ملے۔ میں سمجھتا تھا کہ فنِ شعر و ادب میں آپ مجھ سے آگے ہیں۔ آپ تو عمر میں بھی دو سال آگے نکلے۔ آپ کی تعظیم گویا مجھ پر فرض ہو گئی۔ جستہ جستہ (ضعف بصارت کی وجہ سے) دیکھا۔ کیا کہنا۔ آپ کا کلام ہر طرح سے داد کے لائق ہے۔ زبان و بیان عمدہ۔ مفاہیم و مطالب صالح۔ آپ ہر طرح فائق ہیں۔ میں ان کتابوں کو صحیح مقامات پر پہنچانے کی کوشش کروں گا۔

محبی نصیر پروار بھی خوب لکھتے ہیں۔ اس سے بھی لطف اندوز ہوا ہوں۔ ان سے میرا اسلام کہیں۔

مخلص کالی داس گپتا رضا

ارشد صدیقی کے پانچ شعری مجموعے ایک ساتھ

- نوائے حرف — تازہ غزلیں
- نغمۂ زار — درمیانی عہد کی غزلیات و رباعیات
- طلوعِ سحر — آغازِ شاعری کا انتخابِ کلام
- عنواناتِ درخشاں — موضوعاتی نظمیں اور قطعات
- پسِ عکسِ خیال — انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے

رابطہ مسعود احمد صدیقی

مہتمم مکتبۂ دانشکدہ، بھوپال

63/3، باغ امراؤ دولھا کالونی، بھوپال

مقالات حصہ دوم

کالی داس گپتا رضاؔ کی گیت نگاری

ڈاکٹر فراز حامدی

آنجہانی کالی داس گپتا رضاؔ کی شخصیت مختلف رنگوں کا آمیزہ تھی جس کا ہر رنگ نہ صرف دلکش و دلنواز تھا بلکہ انفرادی حیثیت کا حامل بھی تھا۔ رضاؔ صاحب ایک کامیاب محقق بھی تھے، ناقد بھی، تاریخ گو بھی، ادیب بھی، شاعر بھی، شاعر گر بھی لاریب، رضاؔ صاحب کی شعری و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی خدمات قابل قدر و قابل ستائش ہیں۔ ادبی گلوب پر اس کا نام ہر عہد میں درخشندہ و تابندہ رہے گا۔

رضاؔ صاحب، داغؔ اسکول کے آخری معتبر شاعر تھے یعنی جوشؔ ملسیانی کے چہیتے شاگرد تھے جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اپنا، اپنے استاد کا اور اپنے اسکول کا نام خوب روشن کیا۔

ہندو درشن شاستر کے مطابق لکشمی ایک ایسی دیوی ہے جس کا تعلق دھن دولت سے ہوتا ہے اور سرسوتی دیوی علوم و فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھتی ہے لیکن ان دونوں دیویوں کا آشیرواد ایک ہی انسان کا ورثہ بن جائے ایسا ہونا ناممکن تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن آنجہانی کالی داس گپتا رضاؔ کی خوش نصیبی یہ رہی کہ انھیں لکشمی دیوی اور سرسوتی دیوی، دونوں کا آشیرواد اور وردان حاصل تھا اور زندگی کی آخری سانس تک رہا۔ جس کے سبب رضاؔ صاحب ایک متمول انسان بھی رہے اور مختلف الجہات تخلیق کار بھی۔

گپتا صاحب متعدد کتب کے مصنف و مؤلف تھے لیکن ان کی جن کتابوں کو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ان میں 'شعلۂ خاموش'، 'شورشِ پنہاں'، 'شاخِ گل'، 'غزل گلاب'، 'ابھی تازہ نہ ماندہ ہو'، 'شعاعِ جاوید'، 'نظم سمدر'، 'متعلقاتِ غالبؔ'، 'کلیاتِ چکبست'، 'باقیاتِ چکبست'، 'منثوراتِ جوشؔ ملسیانی'، 'مکتوباتِ جوش ملسیانی'، 'دعائے صباح' قابل ذکر ہیں۔

آنجہانی رضاؔ صاحب اپنے آپ میں ایک ادارہ تھے اور کئی علمی و ادبی اداروں سے منسلک بھی تھے۔ علاوہ ازیں کئی رسائل و جرائد، شعری و ادبی تنظیموں کے سرپرست بھی تھے۔ "بزمِ فکر و فن" ممبئی کے سرپرست بھی رضاؔ صاحب ہی تھے اور اس بزم کے عہدیداران و اراکین میں مرحوم مجروح سلطانپوری، قمر جلال آبادی، پنڈت رویندر جین، عثمان عامرؔ (مرحوم)، کامل چاند پوری (مرحوم)، نقش لائلپوری، اے کے اگروال، نسیم اجمیری (مرحوم)، قاسمؔ قریشی، زہرہ جمال، راقم الحروف (فرازؔ حامدی)، ڈاکٹر اندو متی وشنوئی، رئیس ملوی، عمر سکریا، اقبالؔ قریشی، قتیلؔ راجستھانی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

بزمِ فکر و فن کے سکریٹری مرحوم عثمان عامرؔ کے مدعو کرنے پر جب راقم الحروف (فرازؔ حامدی) "بزمِ فکر و فن" کے اوّلین مجلے کے ترتیب کار کی حیثیت سے اپنے مادرِ وطن حامد مینشن، امیر گنج، ٹونک

راجستھان سے کامارواڑ، امدھیری بمبئی پہنچا اور بزم کے مجلے سے متعلق ذمہ داریاں سنبھالیں تب "بزمِ فکر و فن" کے سرپرست اور عہدیداران و اراکین سے ملاقاتیں ہوئیں۔

ویسے بھی ان سبھی سے میرے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ مجلے کی ترتیب کے لیے سرپرست کے سُجھاؤ میرے لیے بہت ضروری تھے لہٰذا راقم الحروف نے جب جب رضؔا صاحب سے اس موضوع پر بات کی تب تب وہ مسکرا کر ٹال گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، افریقہ کے قصے سناتے رہے، کبھی شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی رہی، کبھی مجھ سے گیت، دوہے اور آزاد نظمیں سنانے کی بات کرتے رہے، کبھی کتابوں اور اپنے مشاغل پر روشنی ڈالتے رہے۔ طرح طرح سے میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ان چار ماہ کے عرصہ میں رضا صاحب سے میری آٹھ دس ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔ ان ملاقاتوں میں راقم الحروف کو انھیں تھوڑا بہت سمجھنے کا موقعہ ملا۔ ان کی عادت و خصلت، ان کی مصروفیات، ان کا رہن سہن، ان کے مشاغل، ان کے کتب خانے و کمرہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ اور ان یادگار ملاقاتوں میں مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ مجلے کی ترتیب کے آخری مراحل میں راقم الحروف نے رضا صاحب سے پھر درخواست کی کہ کہیں مجھ سے کوئی لغزش نہ ہو جائے، اس لیے آپ کی ہدایات اور مشورے راقم الحروف کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ اس کے باوجود رضا صاحب میری حوصلہ افزائی تو کرتے رہے لیکن مشوروں اور ہدایات کے نام پر ایک لفظ بھی ان کے منہ سے نہیں نکلا۔ شاید رضؔا صاحب اپنے سُجھاؤ دے کر مجھے شرمندہ نہیں کرنا چاہتے تھے اور نہ اپنے بڑے پن کا کوئی اظہار۔ راقم الحروف کو ان کا یہ حسن سلوک آج بھی یاد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رضا صاحب کو ڈھیر ساری خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک فطری تخلیق کار تو تھے ہی، ساتھ ہی اعلیٰ قسم کے انسان بھی تھے۔ دوسروں کا دُکھ درد بانٹنا، اُن کے آنسوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا ان کی عادت میں شامل تھا۔

رضا صاحب ایک محنتی اور ذہین انسان بھی تھے۔ آنجہانی ۱۹۴۹ء میں کینیا (مشرقی افریقہ) گئے جہاں وہ ۲۲ - ۲۳ سال قیام پذیر رہے اور اس دوران انھوں نے کیمبرج کے امتحانات پاس کیے۔ بیرسٹری کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ذاتی کاروبار میں بھی مصروف رہے اور شعر و ادب سے بھی جُڑے رہے اور ایسے ایسے نمایاں کارنامے انجام دیے جن سے اردو دنیا بخوبی واقف ہے۔

رضؔا صاحب ایک منکسر المزاج انسان تھے۔ سیکولر ذہن کے مالک تھے، وسیع المشرب اور وسیع القلب بھی تھے۔ ضرورت مندوں کی امداد کرنا، انھیں ماہانہ وظیفے دینا انھیں بیحد پسند تھا۔

آنجہانی رضؔا شطرنج کے اچھے کھلاڑی تھے، فٹبال اور ہاکی کے کھیلوں میں انھیں خاصی دلچسپی تھی۔ علم نجوم سے بھی واقف تھے اور ہومیوپیتھی کے اچھے ڈاکٹر تھے۔ وہ مصور بھی تھے اور ستار نواز بھی، گیت اور سنگیت سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔

راقم الحروف (فراز حامدی) نے آنجہانی رضاؔ صاحب سے غزلیں بھی سنی ہیں اور گیت بھی۔ چونکہ راقم الحروف خود بھی گیت کار ہے لہٰذا رضا صاحب کے گیتوں پر اپنے تاثرات کا اظہار مجھے زیادہ مناسب محسوس ہوا، لہٰذا رضاؔ صاحب کے گیتوں کے لیے میں نے ساحرؔ شیوی، سیم سٹ وسیمؔ اور نذیر فتح پوری صاحبان سے رابطہ قائم کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ رضاؔ صاحب کے کچھ گیت مجھے موصول ہو گئے ہیں۔

آنجہانی رضاؔ صاحب نے سبھی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزلوں، نظموں، رباعیوں سے لے کر انھوں نے گیتوں اور بھجنوں پر بھی زور قلم صرف کیا ہے اور نعتیہ شاعری میں بھی جوہر دکھائے ہیں۔ دیگر اصناف سخن سے قطع نظر ان کی گیت نگاری بھی وقعت و اہمیت کی حامل ہے۔

واضح ہو کہ ہر شخص شاعر ہو سکتا ہے لیکن ہر شاعر گیت کار نہیں ہو سکتا۔ گیت جذبات و احساسات اور قلبی واردات کا آئینہ ہوتے ہیں اور اچھے گیت قاری و سامع کو بہر طور متاثر کرتے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ گیتوں کی دنیا رنگا رنگ ہوتی ہے اور یہ مختلف انداز و ہیئت کے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں گیت لوک صنف سخن کے زمرے میں آتے ہیں جسے عوامی شاعری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کالی داس گپتا ایک دردمند انسان تھے اور رضاؔ ایک حساس شاعر اسی لیے ان کے کلام میں کچھ حصہ گیتوں کا بھی ملتا ہے جو ان کی شاعری کی ایک اہم اور روشن جہت ہے۔ عظمت اللہ خاں نے ہندی ادب سے مستعار لے کر جو نظم نما گیت لکھے اور اندر جیت شرما، مقبول حسین لاری، حفیظ جالندھری وغیرہ نے جب اس سلسلے کو آگے بڑھایا تو اختر شیرانی، حامد اللہ افسر میرٹھی سے ہوتا ہوا یہ کیفؔ بھوپالی اور شکیلؔ اُنتہائی تک پہنچا۔ رضاؔ کو بھی اس سلسلے کی ایک کڑی کہیں تو کچھ بجا نہ ہوگا کیونکہ انھوں نے جو گیتوں کی دنیا سجائی ہے اسے درخور اعتنا نہیں کیا جا سکتا۔ رضاؔ کے گیت واقعی گیتوں کی داخلی کیفیت پر مبنی ہیں جس پر اصل گیت کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اگر ہم رضاؔ کے گیتوں کا ایک طائرانہ جائزہ لیں تو ان کی کچھ خصوصیات از خود نمایاں ہوں گی۔

آنجہانی رضاؔ کے گیتوں کی سب سے بڑی پہچان تو یہ ہے کہ وہ مختصر مختصر گیت لکھتے ہیں۔ طوالت کے برعکس وہ بہت اختصار سے مواد و موضوع سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ بے تلے لفظوں میں وہ دل کی بات کہہ جاتے ہیں اور جامعیت کے ساتھ الفاظ کی بندش کرتے ہیں۔ ان کی پیش کش کا طریقہ نہایت دلپذیر ہے۔ ایک گیت میں ان کا انداز فکر اور طرز ادا ملاحظہ کیجئے

گھائل من ساجن کا کریں
یہ اپنے گھاؤ بھریں
یہ نینا
قید کریں ہر ابھی لاشا کو
لاکر ڈالیں ہر آشا کو

اپنے چر من میں
یہ نینا
کون نہیں ہے اس کا پاگل
یہ مینا متوالے کومل
کس کو پیار کریں
یہ مینا

ہلکے پھلکے لفظوں میں ایک ہلکا پھلکا احساس ہے جس نے گیت کی شکل اختیار کرلی ہے۔ مواد و موضوع اور تفہیم و تکنیک بھی بتاتی ہے کہ یہ خالص گیت ہے، کوئی گیت نما نظم نہیں۔

اردو گیتوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں ہندی لفظیات کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے۔ گیتوں کی خارجی شکل میں اب بھرلش اور برج بھاشا کے اثرات ہم صاف دیکھتے ہیں۔ رضاؔ نے بھی ہندی لفظوں سے استفادہ کیا ہے مگر سبک و شیریں الفاظ ہی انھوں نے کام میں لیے ہیں، اس لیے وہ اردو کے قاری کو گراں نہیں گذرتے۔ ایک دوسرے گیت میں بھی ان کی خصوصیت کو دیکھا جاسکتا ہے

من ساگر میں پھینک کے کنکر، اک طوفاں اُٹھادو
پھر سے سویا پیار جگادو
جاگے پیار تو دیا جاگے
سورج نکلے اندھیرا بھاگے
بہہ جائے جو تن کی ندیا، وہ سنگیت بہادو
پھر سے سویا پیار جگادو
تمہیں تو ہو پریمی کی آشا
مکھ سے کرو پھولوں کی برکھا
دھیاں میں پریمی کے آکر تم، پریم کے پھول کھلادو
پھر سے سویا پیار جگادو
تم والو ہو شیتل شیتل
آئی ہو پیکر گنگا جل
سب کے من کی چنچلتا سے، پیار کو شیت بنادو
پھر سے سویا پیار جگادو

دراصل ہندی الفاظ سے مفر نہیں کیونکہ گیت ہندی ادب کی دین ہے اور کلاسیکی روایت بھی چلی

آرہی ہے۔ گیتوں کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا غنائی پہلو ہوتا ہے۔ اگر گیت میں موسیقیت اور غنائیت فقدان ہو تو گیت کی دلکشی اور تاثیر انگیزی ختم ہو جاتی ہے۔ گیت کسی بھی ہیئت میں ہوں، الفاظ کے زیر و اسے اہم بناتے ہیں۔ رضا کے گیتوں میں ترنم ریزی کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہ گیت صرف کتاب میں پڑھنے دعوت نہیں دیتے بلکہ جاذبیت کے باعث انسان کو گنگنانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ گیت جو آہنگ بناتے ؟ گیت جو موسیقی بکھیرتے ہیں اور گیت جو دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں، رضا کے ایک گیت میں انھیں کیفیا کو ملاحظہ کیجئے

چاند نکل آیا ہے کب کا کالی کالی بدلی سے
چاند سا مکھڑا کب نکلے گا کالی کالی مدلی سے
شیتل شیتل کرنوں سے یہ جیون کب چمکاؤ گے
کب آؤ گے

یہ سونے دن سونی راتیں مانگ رہے ہیں تیرا پیار
رہنے سہنے جوگ نہیں ہے اب یہ چپ چپ کا سسار
میٹھے سرل سوبھاؤ سے آکر کب مجھ کو چونکاؤ گے
کب آؤ گے

آنگن کی پھلواری پر اب کچھ بھی نہیں ہے رنگ نہ روپ
تپتے سورج کی کرنوں میں پھیکی پھیکی سی ہے دھوپ
بولو رونق رنگ بھوں کی تم کب واپس لاؤ گے
کب آؤ گے

کالی داس گپتا رضا کے تمام گیت جذبات اور احساسات میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ کوئی خیال اور جذبہ دل کے دروازے سے ہو کر گزرتا ہے تو اس کی تاثیر دو چند ہو جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے دلی کیف کی تصویر کشی کی ہے اور ہجر و فراق اور رنج و الم کے احساسات کو گیتوں کے دھڑکتے ہوئے قالب میں ہے۔ ان کے گیت پڑھ کر جہاں ایک میٹھی میٹھی خلش کا احساس ہوتا ہے وہیں قلبی طمانیت بھی ملتی ہے۔ کے گیت کی کیفیت دیکھئے۔ مدھر سُروں کی سرساہٹ اور حدے کی گرماہٹ نے ایک عجیب دلکشی پیدا کر دی۔

چپکے چپکے، دھیرے دھیرے کس نے مجھے چونکایا
مجھ کو کون جگانے آیا
اوڑھ کے جیسے پوّں کا آنچل
کاڑھ کے گھونگھٹ ڈال کے کاجل

پلٹ کے اپنی کایا
مجھ کو کون جگانے آیا
پریم مگن ہوں جانوں کیوں کر
سوتے میں پہچانوں کیوں کر
پریتم ہے یا چھایا!
مجھ کو کون جگانے آیا
روپ کی چنری رنگ کے گہنے
پیار کے تن پر پیار سے پہنے
سپنوں کے سنگ آیا
مجھ کو کون جگانے آیا

آنجہانی رضا، غالب پر اتھاریٹی تھے اور غالب اپنی فکر کی بلند پرواری کے لیے مشہور ہیں۔ اگر رضا چاہتے تو اپنے گیتوں کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا سکتے تھے لیکن گیت فکر و فلسفہ کے متحمل نہیں ہوتے۔ غالب نے غزلیں کہی ہیں اور قصیدے لکھے ہیں اور وہ اردو شاعری کا معیار بن گئے لیکن اگر غالب کو گیت لکھنے کے لیے مجبور کیا جاتا تو یقیناً اچھے گیت تخلیق کرنے میں وہ ناکام رہتے۔ رضا نے مختلف اصناف میں اپنی کاوشیں کی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے ہر صنف میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ گیتوں میں بھی وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ ان کی خدمات و احساسات کے اعتراف میں انھیں "پدم شری" کا اعزار ملنے والا تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ قید حیات سے نجات پا گئے۔ مرگ ناگہانی نے انھیں ہم سے بہت دور کر دیا اور ان کے چاہنے والے رنج و غم میں ڈوب گئے مگر ایسا لگتا ہے کہ دور پربت پر سے کہیں ان کی روح ہمیں مخاطب ہو کر کہہ رہی ہو

رہنے دے یہ رونا دھونا
اتنا بھی دکھ میں کیا ہونا
سکھ کی دیوی کا کر پوجن
تیرے یہ آنسو کس کارن

کالی داس کھو گئے، اردو نے بہت کچھ کھو دیا۔ اب ہیہات ہیہات کے سوا رکھا کیا ہے"

☆☆☆

Amani Shah Road,
Shastri Nagar, Jaipur, Rajasthan - 302 016

ظلمات کو مات دینے والا فنکار

انور شمیم انور فیروز آبادی

گفتگو ہے میرے دو بیٹوں وسیم انور اور رحیم انور کے درمیان۔ اور موضوع گفتگو ہیں "کالی داس گپتا رضا اور ان کی ادبی خدمات"۔

اس گفتگو میں بڑے بیٹے وسیم انور کا نکتہ نظر یہ ہے کہ کیونکہ رضا صاحب خود ایک عظیم انسان تھے اسی سب ان کی خدمات بھی عظیم تھیں۔

اس سلسلے میں وسیم انور جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ ہر تخلیق میں بالعموم تخلیق نگار کے مزاج و نفسیات اور کردار کا اثر موجزن ہوتا ہے اس لیے تخلیق کی بلندی یا پستی کا سبب خود تخلیق نگار کا اپنا کردار ہوتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح سمجھئے جس طرح جھیل کے بغیر کنول اور شاخ کے بغیر گلاب کا تصور ممکن نہیں۔

لیکن ذرا سے تصرف کے ساتھ رحیم انور کا اظہار خیال یوں ہوا کہ رضا صاحب کی عظمت کا سہرا ان کی "عظیم انسانی و ادبی خدمات" کے سر ہے۔ یوں سمجھئے کہ "شمع" داں سونے کا ہو یا کانچ کا، روشنی شمع سے ہوتی ہے شمع داں سے نہیں۔ مجموعی طور پر کلیم کی حیثیت جسم کی ہے اور کلام کی حیثیت روح کی۔ فنکار کی عزت "فن پارے" سے ہوتی ہے "فن پارے" کی عزت فنکار سے نہیں۔

یعنی مباحثہ یہ ہے کہ انسان اپنے عظیم کارناموں کی بدولت عظیم ہوتا ہے یا خود انسان کی عظمت کی بدولت کارنامے عزت پاتے ہیں۔

لیکن بہ نظر امعان دیکھیے پر اس مباحثہ سے جو بھی عطر کشید ہوگا اس کی حیثیت اسی اعتراف کی ہوگی کہ بحیثیت مجموعی رضا صاحب کی ادبی خدمات بھی بہت عظیم تھیں اور خود رضا صاحب بھی بہت عظیم تھے۔ ادب کے حوالے سے بھی اور انسانیت کے تعلق سے بھی۔ لہٰذا ان کی اس ادبی و انسانی عظمت کا اعتراف خارجی سطح پر بھی ہوا اور داخلی سطح پر بھی۔ اور یہ اعتراف بار بار ان کی حیات میں بھی ہوا اور انتقال کے بعد بھی۔

جواز کے طور پر ان کے معاصرین میں سے متعدد صائب الرائے مشاہیر کے خیالات پیش کیے جا سکتے ہیں جس کی حیثیت محض "غالب کے طرفدار" کی نہیں "سخن فہم" کی ہے لیکن "سخن فہمی" کے "اظہار" میں بھی ایک "مہذب بے تکلفی" اور ایک خاص قسم کی "صاف گوئی" پائی جاتی ہے۔ وہ تصنع اور نیاز مندی مطلقاً نہیں جسے "شہ کے مصاحب"، "شاہ پرستی کے اظہار کے طور پر" پیش فرمایا کرتے ہیں۔ "دانشورانِ ادبِ اردو" کے اسمائے گرامی کی ایک طویل فہرست ہے۔ کتنے ہی معروف و مستند اہل قلم ہیں جنھوں نے رضا صاحب کے فن اور شخصیت کے حوالے سے بہ لہجہ تحسین گل افشانیاں کی ہیں۔ مثلاً قاضی عبد الودود، ڈاکٹر گیان چند جین،

گوپی چند نارنگ، علی جواد زیدی، مالک رام، خواجہ غلام السیدین، شمس الرحمٰن فاروقی، خلیق انجم، نسیم انہونوی، ڈاکٹر صفدر آہ، عرش ملسیانی، اعجاز صدیقی، ملراج ورما، افتخار امام، شکیل بدایونی، قمر جلال آبادی، علی سردار جعفری، محمود سعیدی، وارث علوی، آغا رشید مرزا، آدم شیخ، محمد انصار اللہ، علیم اللہ حالی، رام لعل نابھوی، مانک ٹالا، حسن عباس فطرت، نذیر فتح پوری، راہی قریشی، محمد ایوب واقف، اعجاز سیمابی، تارا چرن رستوگی، عبد اللہ کمال، ظفر ادیب، عبد الاحد ساز، حمیرا خاتون، اسلم انصاری (پاکستان)، اے بی اشرفی (پاکستان)، طاہر تونسوی (پاکستان)، عابد پیشاوری، کرشن کول (انڈین ہائی کمیشن (نیروبی کینیا)، محمد لطیف (کینیا)، ساحر شیوی (کینیا، حال مقیم انگلینڈ) اور جسٹس چانن سنگھ وغیرہم کے مشاہدات و تاثرات کا نچوڑ جہاں رضا صاحب کو بحیثیت انسان ایک شریف النفس بلند اخلاق، درد مند و رقیق القلب، منکسر المزاج، وسیع المشرب، شگفتہ کلام، غیور، اعلیٰ ظرف، منصف مزاج، صاحب احساس اور مردم شناس انسان ثابت کرتا ہے وہیں ایک صاحب طرز ادیب، ہمہ جہت و ہمہ صفت فنکار، کہنہ مشق شاعر، ماہر عروض و فن، مایہ ناز انشا پرداز، باشعور نقاد، بلند پایہ محقق اور شہرہ آفاق ماہر غالبیات بھی ثابت کرتا ہے۔

اور ظاہر ہے انسانی و ادبی عظمت کا یہ درجہ خرید کر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ حصولِ عظمت کے لیے ارفع انسانی قدروں کے سانچے میں زندگی کو ڈھالنا ہوتا ہے۔ خود شکستگی اور ایثار و قربانی کی راہ پر تواتر کے ساتھ گامزن رہنا ہوتا ہے۔ زندگی کو پوری طرح فراخدلی، وسیع النظری، اولو العزمی، بلند حوصلگی اور خلوص و محبت کے سپرد کردینا ہوتا ہے۔ ایک سخت قسم کی ریاضت علمی ایک مسلسل جاں سوزی، عرق ریزی اور دیانت دارانہ فکر کے خارزاروں سے گزرنا پڑتا ہے تب کہیں یہ مقام و مرتبہ اور اعتبار کی یہ منزل حاصل ہوتی ہے۔

اس تناظر میں یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ رضا صاحب فطری طور پر ہی اس "جنونِ شوق" کے حامل تھے۔ کیونکہ رضا صاحب کی زندگی کے ان ایام کا جائزہ لیا جائے جو زندگی کے انتہائی کیف آور، بیش بہا اور نازک ترین ایام ہوتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے عیش و عشرت کے بھرپور ذرائع حاصل ہونے کے باوجود ان کیف آور، بیش بہا اور نازک ترین ایام کو بھی لیلائے ادب کی زلفوں کو سنوارنے کے لیے وقف کردیا تھا۔ علم و فن کے دشوار و جاں گسل مراحل کو طے کرنے میں صَرف کیا وہ خوشرنگ موسم۔ راہِ شعر و سخن کو طے کرتے ہوئے عروض و فن کی پیچیدہ گلیوں سے بھی گزرے، زبردست مطالعے کی ہمالیائی بلندیوں کی پیمائش میں یہ ایام گزارے، اتنا ہی نہیں بلکہ علم و ادب کی نئی دنیاؤں کے تجسس میں کیسے کیسے بحر ظلمات کا سفر طے کیا۔ سر میں تحقیق کا سودا لیے ہوئے مسلسل مصروف صحرا نورد رہے اور پیروں کے پھوٹے ہوئے آبلوں سے نئے نئے گل بوٹوں کی تشکیل کرتے رہے۔ ایسی قابل رشک گلکاری جس نے لق و دق صحرا کو رشک گلزار بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ایسے زبردست کارنامے انجام دینا صرف انہی اہل جنوں کا کام ہے جو مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے آپ کو "جنونِ شوق" کی تیز و تند آندھیوں کے حوالے کرکے بھی یک گونہ طمانیت محسوس کرتے رہیں۔ ورنہ

اہل نظر بخوبی جانتے ہیں کہ پتھروں سے پانی نچوڑنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ جوئے شیر لانے کے لیے جو جذبہ کوہکن درکار ہے اس پُر جوش جذبے کا حامل ہر دیوانہ کہاں ہوتا ہے۔ لیکن کالی داس گپتا رضا کی حیات کا ایک ایک لمحہ اسی جوش و جذبے اور گرانقدر حوصلے کا شاہد ہے جو اپنے حامل کو تیز و تند آندھیوں میں بھی سفر جاری رکھنے کی تڑپ بخشتا ہے۔

لہٰذا اسی مسلسل سفر کا حاصل ہے خود اعتمادی کا وہ جوش جو ان کے اسلوب کی رگ و پے میں رچا بسا ہوا ہے۔ کہیں کہیں تو اس جوش خود اعتمادی نے 'برملا اظہار' کی صورت بھی اختیار کر لی ہے۔ مثلاً افتخار امام (ایڈیٹر "شاعر" بمبئی) سے ایک خصوصی اور روبرو ملاقات میں دوران گفتگو ان کا یہ اظہار خیال "میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک اچھا شاعر ہوں معمولی شاعر نہیں، یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب اپنے مد مقابل شعراء کو دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بھی کچھ شاعری نہیں بلکہ یہ کہ زباں اور شعری مزاج بھی اکثر کا مجھ سے کمزور ہے"۔

سطحی فکر و نظر اس بیان کو خود ستائی اور لن ترانی قرار دے سکتی ہے لیکن رضاؔ صاحب کی شخصیت اور فن کا دیانتدارانہ اور عمیق مطالعہ اس بیان کو ان کی خود اعتمادی کا ہی حصہ تسلیم کرے گا۔ رضاؔ صاحب کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ تحقیق کی وادیوں میں سرگرم سفر ہونے کے بعد ان کی شاعری میں وہ چمک باقی نہ رہی جو پہلے تھی۔ اس سلسلے میں بھی ان کا جواب ان کی خود اعتمادی کا مظہر ہے۔

جواب تحقیق میرے یہاں بعد میں آئی لیکن شاعری کا رجحان مجھ میں مرا نہیں بلکہ اور بڑھ گیا۔ عشقیہ شاعری مجھے پسند نہیں، ویسے میں جب چاہوں اس طرح کی شاعری بھی کر سکتا ہوں۔ یہ صنّاعی ہے لیکن میں اسے پسند نہیں کرتا۔

اس مقام و مرتبے کے حاملین بشری کمزوریوں کے تحت اکثر خود پسندی و خود سری کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں لیکن رضا صاحب کیونکہ اس نقطہ سے کماحقہ واقف ہیں اس لیے اپنے آپ کو اس راستے سے پوری طرح محفوظ رکھتے ہیں وہ افتخار امام سے اسی ملاقات میں کہتے ہیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ کسی بڑے محقق کی کسی غلطی کی نشاندہی کی جاتی ہے تو وہ خوشی سے اسے قبول نہیں کرتا حالانکہ ایسا ہونا چاہیے۔ مجھ پر ایسا کوئی حملہ تو نہیں ہوا اگر کبھی ہوا بھی تو اپنی غلطی کو میں فوراً قبول کروں گا۔ تحقیق کسی کے گھر کی نہیں ہے جو جتنا اچھا کر لے یا جس کو جتنا اچھا مواد مل جائے۔

اس بیان سے ان کی حقیقت پسندی اور دیانتداری کو بجا طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان کی ژرف نگاہی، وسعت نظر، حرف گیری اور کرید و تجسس کی عادت کا بھی سراغ ملتا ہے۔ حقیقت پسندی کا اظہار اور اپنے کسی سہو کے اعتراف کا جذبہ اپنی جگہ لیکن مرعوب وہ کسی سے نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ استادِ محترم حضرت جوش ملسیانی کے احترام میں سر مو فرق نہیں آنے دیتے لیکن دبے لفظوں میں اعتراض ان پر بھی

کر دیتے ہیں لیکن جواب پاکر مطمئن بھی ہو جاتے ہیں اور کٹ حجتی ہر گز نہیں کرتے۔ رضا صاحب کی شادی پر جوش ملسیانی نے یہ قطعہ ارسال کیا تھا۔

ڈاک نے آج سنایا مژدہ ہونے والی ہے رضا کی شادی
کالے کوسوں کا سفر ہے اے جوش بھیج دو خط میں مبارکبادی

رضا صاحب نے انھیں لکھا کہ "مبارکباد" صحیح ہے "مبارکبادی" نہیں۔ جواب میں جوش صاحب نے داغ کا یہ شعر لکھ بھیجا۔

ہم تجھے دیتے ہیں نوشاہ مبارکبادی کرے مقبول یہ اللہ مبارکبادی

تحقیق کا مادّہ رضا صاحب کی فطرت میں ابتدا سے موجود تھا اور تحقیق کا یہ جذبہ ان پر اس قدر حاوی تھا کہ اکثر استاد کے الفاظ میں بھی اعراب کے سلسلے میں وہ میں میخ نکال دیا کرتے تھے، مثلاً رضا صاحب اپنے تخلص کو رائے مکسور سے لکھتے تھے، جوش صاحب نے انھیں ۱۹۵۰ء میں افریقہ خط لکھا تو پتے پر Raza لکھا تھا۔ رضا صاحب کو یہ کھٹکا اور انھوں نے ملا تاخیر یہ استفسار کیا کہ میرا تخلص رضا بکسر اوّل ہونا چاہیے یا بفتح اوّل۔ جوش صاحب نے جواب دیا انگریزی مجھے نہیں آتی۔ پہلے خط پر سر نامہ جس شخص سے لکھوایا تھا اسی نے رضا کو Raza ر سے لکھ دیا ہوگا۔ 'آر' کے بعد 'آئی' ہی درست ہے۔

معلوم ہوا کہ رضا صاحب کے جذبہ تحقیق اور خود اعتمادی کو احترام کے نام پر جھکنا بھی گوارا نہ تھا لیکن خود اعتمادی کے زعم میں بے ادب ہونا بھی ان کا شیوہ نہیں تھا۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل واقعہ بھی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

جناب گیان چند جین کا مضمون "سرمایہ دار ادب" میرے بیٹے وسیم انور نے پڑھا جس کے درج ذیل اقتباس پر خصوصاً مجھے توجہ دلائی۔

"جوش (ملسیانی) صاحب نے ایک مضمون "املا کی غلطیاں" میں ہدایت کی تھی جن مرکب الفاظ کے دونوں اجزا اہم یا بامعنی ہوں انھیں منقطع لکھا جائے ترقی اردو بورڈ کے املا نامے کا بھی یہی فتویٰ ہے پھر نہیں معلوم کیوں رضا صاحب اپنے نام کو "کالیداس" اور اپنی بلڈنگ کو "جلدرشن" لکھتے ہیں۔ میرے استفسار پر کالی داس صاحب نے بتایا کہ ملا کر لکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ قلم خود بخود ملا کر لکھ دیتا ہے۔

راقم الحروف کو یہاں عرض یہ کرنا ہے کہ اپنے تسامح پر رضا صاحب کا یہ فراخدلانہ اعتراف محض رسمی نہیں بلکہ اصلاح قبول کرنے کے عملی جذبے کا اظہار بھی ہوتا ہے جس کا ثبوت ہے رضا صاحب کا وہ خط جو انھوں نے وسیم انور کی شادی پر میرے نام تحریر کیا تھا اور جس پر اب وسیم انور نے بطور خاص توجہ دلائی۔

22/3/95

محب گرامی تسلیمات

بہت سی مبارکباد
عزیزی وسیم انور اور عزیزہ شانہ ریب
کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے پر
پروردگار انھیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔
مخلص کالی داس گپتارضاؔ

معلوم ہوا کہ اپنے نام کو ملا کر لکھنے کی کمی کا اعتراف محض نمائشی نہیں حقیقی تھا کیونکہ انھوں نے اس کے بعد اپنے نام کو ملا کر (کالیداس) نہیں بلکہ منقطع (کالی داس) لکھا جیسا کہ مندرجہ بالا خط میں ان کے نام سے ثابت ہے۔

بحیثیت مجموعی ملک و بیرون ملک کے مشاہیر اہل قلم اور دانشوران اردو کے قلم سے رضاؔ صاحب کے تعلق سے جن گرانقدر خیالات کا اظہار ہوتا رہا ہے رضاؔ صاحب کی ادبی و انسانی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے وہی کم نہیں لیکن یہ سلسلہ تشنۂ تکمیل رہ جاتا، اگر ان کی رفیقۂ حیات کے خیالات سامنے نہ آپاتے۔ رسول کریمؐ کی ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ کسی شخص کی خوبیاں یا خامیاں جاننا چاہو تو اس کی بیوی سے دریافت کرو۔ لیکن اس مقدس اور معتبر ترین کسوٹی سے کام لینے کے لیے جو پختہ شعور جو عمیق النظری اور نفسیات شناسی درکار ہے اسے بروئے کار لایا جائے تو مشاہدہ سب سے پہلے اس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

کہ اگر کسی مشہور فنکار پر خود اس کی رفیقۂ حیات کا کوئی مضمون شائع ہو تو بالعموم اس میں "داستان" کے ساتھ "زیبِ داستان" کی جلوہ ریزی بھی ہوتی ہے خصوصاً اس وقت جب کسی شہرہ آفاق ادیب یا شاعر کی "اہلیہ محترمہ" نے "یہ کارنامہ" انجام دیا ہو تو مضموں میں سچائیوں کے ساتھ "رنگ آمیزی" بھی دبے پاؤں داخلہ لے چکی ہوتی ہے جو منتخب لیکن "مستعار" الفاظ کی مہک اور "خود تراشیدہ" لیکن دلچسپ واقعات کے چٹخاروں میں اس طرح روپوش رہتی ہے کہ اس کی کار فرمائی کا مطلقاً احساس نہیں ہونے پاتا اس کے باوصف اہل نظر صاف دیکھ لیتے ہیں کہ "اس پردۂ زنگاری" میں دراصل "کون معشوق" ہے۔ جاگتا ہوا احساس بتا دیا ہے کہ "ہونٹ کس کے ہیں، الفاظ کس کے اور آواز کس کی"۔

لیکن اس تناظر میں اگر علامہ کالی داس گپتا رضا کی رفیقۂ حیات، محترمہ ساوتری گپتا کا مضمون دیکھنے کی کوشش کی جائے گی تو مضمون کا دیانتدارانہ تجزیہ واضح طور پر یہ بتائے گا کہ محترمہ ساوتری دیوی کا مضموں "میرے پتی" نہ صرف یہ کہ خود محترمہ ساوتری دیوی کے ہی زور قلم کا نتیجہ ہے بلکہ کسی بھی قسم کی "کاریگری" اور "رنگ آمیزی" سے بھی پاک ہے۔ ان کی اپنی لفظیات ہیں ان کا اپنا اسلوب کیونکہ ایک سچائی یہ بھی ہے کہ گہری نظر سے دیکھنے پر کوئی بھی کثیر المطالعہ شخص کسی بھی مطالعہ شدہ صاحب طرز ادیب کے اسلوب کی شناخت کر سکتا ہے۔ اسلوب کے علاوہ ہر ادیب کے اپنے کچھ مخصوص لفظیات بھی ہوتے ہیں جو غیر محسوس طریقے سے

ادیب کے مضامین میں شمولیت پاجاتے ہیں۔ انہی لفظیات کے وسیلے سے ادیب کی "شناخت" کا مرحلہ ریادہ دشوار نہیں رہتا۔ اس روشنی میں بلا تکلف یہ کہا جاسکتا ہے کہ محترمہ ساوتری دیوی کے مضمون "میرے پتی" میں کہیں بھی رضا صاحب کے قلم کی عکس ریزی نہیں اور راقم الحروف کا یہ دعویٰ محض ر بنائے عقیدت ہی نہیں بلکہ مدلل طور پر کیا جارہا ہے۔

۱ ۱۶ر ۱۷ سال قبل "تناظر" کے کالی داس گپتا رضا نمبر میں شامل محترمہ ساوتری دیوی کا (ہندی سے لیا گیا) یہ مضمون اس عمر کا مضمون ہے جہاں "جذبۂ خود تشہیری کی اکساہٹیں" دم توڑ چکی ہوتی ہیں جہاں بردباری اور سنجیدگی کا وقار و وزن ذہن و دل پر پوری طرح اثر انداز ہو چکا ہوتا ہے۔

۲ مضمون میں کہیں بھی رضا صاحب کے قلم کی مبہم سی بھی عکس ریزی نہیں۔

۳ ہمیں خود بھی یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہم کو رضا صاحب جیسی بردبار اور باوقار شخصیت سے خود بھی کوئی سطحی اور عامیانہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کیونکہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نفسیاتی طور پر وہ خود بھی اس نقطے سے بخوبی واقف ہیں، اس لیے خود انہی کی رفیقۂ حیات کے مضمون میں تصنع کے عناصر کی تلاش بے سود ہوگی۔ لہٰذا ہم حدیث نبویؐ کی صداقت پر یقین کی ساری توانائی کے ساتھ غور کرتے ہیں تو محترمہ ساوتری گپتا کے بیاں میں رضا صاحب کا کردار ایک شفاف آئینے کی طرح نظر آنے لگتا ہے۔ ذیل میں پیش ہیں اس مضمون کی کچھ کرنیں

۱ گپتا جی نے مجھ سے اور میرے بچوں سے بھی زیادہ انڈیا اور اردو سے پیار کیا ہے۔

۲ (افریقہ میں) کہا کرتے تھے۔ جی چاہتا ہے انڈیا جاکر اردو کی بہت سی خدمت کروں، میں کہتی ہوں یہاں کیا کم خدمت کی ہے۔ جنگل میں منگل کر دیا ہے، اتنے لوگوں کو اردو سکھائی اور اتنے شاعر بنا دیئے۔

۳ یہاں آکر برنس اور اردو میں مست ہوگئے بلکہ یوں کہنا چاہیے برنس میں کم اردو میں زیادہ۔

۴ گپتا جی محنت اور کام پر یقین رکھتے ہیں۔

۵ امیر گھرانے سے تعلق مگر طبیعت میں فقیری کی حد تک سادگی ہے، دکھاوے سے کوسوں دور بھاگتے ہیں بلکہ دکھاوے کی زندگی سے از حد نفرت کرتے ہیں۔ پروپیگنڈہ ان کی طبیعت سے میل نہیں کھاتا۔ گھر میں بھی سادہ رہنا۔ سادہ کھانا۔

۶ اپنی کمائی کی روٹی کھانا ہی پسند۔

۷ اگر کوئی ان کو "برا بھلا" بھی کہہ جائے تو اس کا بدلہ نہیں لیتے۔ نقصان تو دشمن کو بھی نہیں پہنچاتے۔

۸ غریبوں کے بھلے کا سوچنا ان کی فطرت ہے۔

جناب علی سردار جعفری صاحب (مرحوم) کی رضا صاحب پر بنائی گئی ڈاکیومینٹری کی ریکارڈ رپورٹ

(Recorded Report) جو ۱۵/ اپریل ۱۹۸۱ء کو رات ۳۲ ے سے ۱۲ ۸ بجے تک آدھ گھنٹے کے لیے ٹی وی پر بعنوان "کتابوں کا خزانہ" دکھائی گئی تھی یہاں اس کے اس حصے کے کچھ سوال جواب (جو مسز ساوتری گپتا سے کیے گئے تھے) پیش کرنا بر محل ہوگا کیونکہ انہی کی بازگشت ان کے مضمون میں پیش کیے گئے، خیالات میں پائی جاتی ہے۔

سردار (باختصار) گپتا صاحب تو سارا وقت بیوپار میں گزار دیتے ہیں یا کتابوں میں گزار دیتے ہیں۔ تو آپ کے لیے کتنا وقت رہتا ہے۔

ساوتری دیوی ہمارے لیے تو اتنا وقت رہتا نہیں ہے۔ ویسے اب میں سمجھ گئی ہوں کہ یہ اتنے بزی (Busy) رہتے ہیں تو مجھے کم ہی ٹائم دے سکتے ہیں۔

سردار گویا معاف کر دیتی ہیں۔

ساوتری دیوی سارا دن یہاں ان کے پاس لوگ آتے جاتے رہتے ہیں جیسے پروفیسرس، ڈاکٹرس، اسٹوڈنٹس، شاعر، ادیب، انڈیا، پاکستان سے آتے رہتے ہیں۔

سردار آپ کو تو خاطر تواضع بہت کرنی پڑتی ہوگی۔

ساوتری دیوی ہاں کرنی تو پڑتی ہے ان کو بھی اس میں بہت خوشی ہوتی ہے۔ گھر آئے کو چائے پانی ناشتہ کھانا تو دینا ہی چاہیے۔ اس سے یہ خوش رہتے ہیں۔

سردار تو ٹھیک ہے اس سے ان کی برائی کا تو کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

ساوتری دیوی بس یہی بات ہوتی ہے کہ کسی وقت بات کہنی ہوتی ہے تو ٹائم دیکھتی رہتی ہوں۔

سردار لیکن کبھی کبھی آپ کے دل میں ان کتابوں کے بارے میں رشک تو ہوتا ہوگا۔

ساوتری دیوی بالکل نہیں۔

سردار جعفری کبھی یہ رشک پیدا نہیں ہوتا کہ ان کتابوں نے آپ کی جگہ لے لی۔

ساوتری دیوی یہ بات کچھ ٹھیک ہے مگر میں دیکھتی ہوں کہ ان کا شوق بہت ہے اور یہ دیکھتے ہوئے میں ان کے رستے میں نہیں آنا چاہتی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ جتنا نام پا رہے ہیں اور بھی پائیں گے۔ اگر میں رکاوٹ ہوں گی تو یہ اچھا نہ ہوگا۔

اب ڈاکیومنٹری کی اس ریکارڈ رپورٹ کے بعد محترمہ ساوتری گپتا کے مضمون ("میرے پتی") سے ان کا درج ذیل بیان پیش ہے۔

میرے لیے ان کے ساتھ نباہ کرنے میں سب سے بڑی دشواری ہو رہی ہے کہ یہ اکثر اوقات اپنے کتب خانے میں منہمک رہتے ہیں کبھی کبھی تو کسی مسئلے میں اتنے مستغرق ہو جاتے ہیں کہ کئی کئی دن ان سے بات

کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اسی انتظار میں رہتی ہوں کہ ان کا مضمون ختم ہو تو کچھ بات کروں۔ کبھی کبھی تو غصے میں کہہ بیٹھتی ہوں کہ غالبؔ تو مر گیا مگر ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر شوہر، شاعر یا محقق ہو تو بیوی بھی محقق ہو۔

محترمہ ساوتری دیوی کے مندرجہ بالا تاثرات میں اپنے شوہر کی ادبی و انسانی عظمت پر گرانقدر ناز کا وہ قابل تحسین جذبہ تو جھلکتا ہی رہا ہے جو ایک مہذب، نیک سیرت، تعلیم یافتہ، اعلیٰ ظرف اور وفا شعار بیوی کا خاصہ ہوتا ہے لیکن یہی تاثر رضا صاحب کے اس شوقِ مطالعہ کا بھی ترجمان ہے جو بڑھتے بڑھتے ایک خوشگوار جنوں کی بلندیوں سے ہمکنار ہو گیا تھا اور جس نے عبادت کا درجہ حاصل کر لیا تھا محترمہ ساوتری گپتا کا بیان محض ایک بیان نہیں ہے۔ ایک روشن دریچہ ہے جس سے جھانکنے کے بعد نگاہِ تجسس واضح انداز میں دیکھ سکتی ہے کہ ایک متمول اور خوشحال شخص جو زندگی کی تمام ظاہری آسائشوں اور سامانِ تعیش سے مالا مال ہے۔ لیکن لیلائے ادب کی زلفوں کا اسیر ہو کر دنیاوی عیش و عشرت سے بے نیاز سر میں شعر و ادب اور تحقیق و تنقید کا سودا لیے صحرا نوردی میں معروف ہے جس کی آبلہ پائی سے نئے نئے گل بوٹوں کی تشکیل ہو رہی ہے۔ ایسی قابل رشک گل کاری جو لق و دق صحرا کو رشک گلزار بنا رہی ہے۔

اب جبکہ علامہ کالی داس گپتا رضاؔ اس دنیائے فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ میں اپنے اس مضمون کو محترمہ ساوتری گپتا کے مضمون "میرے پتی" کے مندرجہ ذیل اقتباس پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔

یہ کئی بار کہا کرتے ہیں، اگر زندگی اچھی ہے اور پراپکا کی زندگی ہے تو ایسے آدمی کی موت سہانی ہی ہوگی۔ لیکن اگر زندگی بھیانک بھی رہی ہو تو ایسے کام کرنے چاہئیں کہ کم سے کم موت ضرور سہانی بن جائے۔ اس پھول کی طرح جو مہک بکھیرتا ہے اور مرجھانے کی فکر نہیں کرتا۔

ان کے انتقال پر مشاہیر عالم ان کے زبردست علمی کارناموں نیز عظیم ادبی و انسانی خدمات پر اپنے اپنے انداز سے جس طرح گلہائے عقیدت نچھاور کر رہے ہیں، اس کی روشنی میں بلا تکلف کہا جاسکتا ہے کہ بیشک زندگی کی طرح ان کی موت بھی سہانی بن گئی۔ اس پھول کی طرح جو مہک بکھیرتا ہے اور مرجھانے کی فکر نہیں کرتا۔ برمحل پیش ہے ان کی ایک غزل کا مطلع اور ایک رباعی

قضا کو دیکھ کے ہم مسکرائے جاتے ہیں
ہوائے تند میں شمعیں جلائے جاتے ہیں

سورج میں ہوں چاند میں ہوں ہالا میں ہوں
اوّل سے اخیر تک اجالا میں ہوں
بخشی ہے حیات کو شعاعِ جاوید
ظلمات کو مات دینے والا میں ہوں

☆☆☆

439, Chouk Hajipur, Firozabad - 293203, U P

کالی داس گپتا رضاؔ ..... ایک مہان یوگی

ستیہ پال ملہوترہ عارف

خالق کل کی کوئی بھی تخلیق خواہ کتنی بھی ادنیٰ کیوں نہ ہو، بے معنی یا بے مقصد نہیں ہوتی۔ پھر انسان تو اشرف المخلوقات ہے، جسے شعور کی نعمت ملی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ عام انسان اس کی عظمت کی ضرورت کو نہیں پہچانتا۔ وہ اس سے مستفید نہیں ہوتا۔ زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا، روٹی روزی کے لیے دوڑ دھوپ کرنا مقصد حیات سمجھ لیتا ہے۔ اعلیٰ و ارفع قدروں کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ تمام عمر اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ روشنی کا متمنی نہیں ہوتا۔ لیکن ایک باشعور انسان اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے۔ اپنے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کے تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اپنے اندر جھانک کر دیکھتا ہے۔ خود سے سوال کرتا ہے میں کون ہوں؟ اس دنیائے فانی میں کیا لینے آیا ہوں؟ کیا کر رہا ہوں؟ لاعلمی کے اندھیروں میں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ روشنی کا جویا ہوتا ہے۔ راستے کا تعین کرتا ہے۔ پھر اس پر پوری تندہی، پوری قوت سے گامزن ہو جاتا ہے اور آخر کار منزل مقصود پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔

میرے پیر و مرشد، میرے کرم فرما، میرے رہنما، میرے محبوب، میرے مونس و غمخوار کالی داس گپتا رضاؔ اُن باشعور انسانوں میں سے ایک تھے جنھوں نے خود کو پہچانا، مقصد حیات کو سمجھا، اپنے فرائض کا جائزہ لیا اور انھیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ پورے انہماک، پوری لگن، پورے خلوص، پورے یقین کے ساتھ میداں عمل میں اُترے اور سرخرو و کامراں منزل مقصود تک پہنچے۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں دولت کی فراوانی تھی، لوازمات زندگی کی کمی نہیں تھی، ہر طرح کی آسائش و آرام میسر تھا "ساہوکارہ" ان کا آبائی پیشہ تھا۔ ان کے والد محترم جہاں اس کاروبار کو سنبھالتے تھے وہاں گھر کی ذمہ داریاں بھی پوری طرح نبھاتے تھے۔ ان کے ہر کام میں ڈسپلن تھا، ایک ضابطہ تھا، ایک سلیقہ تھا۔ پرانی قدروں کے علمبردار تھے۔ ہر چھوٹے بڑے کا احترام ذات پات کے امتیاز سے بالاتر۔ ایک آدرش انسان۔ اردو فارسی کے عالم تھے ادب سے قدرتی لگاؤ تھا۔ فنونِ لطیفہ میں دلچسپی تھی۔ رضا صاحب نے اس فضا میں آنکھ کھولی۔ اس ماحول سے متاثر ہوئے۔ انسانی رشتوں کو پہچانا۔ پیار و محبت کا لمس محسوس کیا۔ قدروں کی عظمت کو جانا۔ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آبائی کاروبار کے رموز و نکات سے آگاہی حاصل کی۔ سرمایہ کی ضرورت سمجھا اور ایک کامیاب تاجر کے طور پر تادم آخر سرگرم عمل رہے۔ لیکن اسے مقصد حیات نہیں سمجھا۔ تمام عمر درویشانہ گزار دی۔ سادہ لباس، سادہ رہن سہن، سادہ خوراک، نجی ضروریات کو کم سے کم رکھا۔ سادہ تھے۔ تکلف ان کی فطرت میں نہیں تھا۔ عیش و عشرت کا ان کی زندگی میں کوئی دخل نہیں رہا۔ ادب ان

لیے تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ فنونِ لطیفہ سے انھیں قدرتی لگاؤ تھا۔ راگ رنگ کی طرف رجوع کیا۔ اس میں گہری دلچسپی لی۔ ساروں پر ریاض کیا۔ شاستریہ سنگیت پر استادانہ مہارت حاصل کی۔ لیکن اسے پیشہ بنانے کا خیال کبھی ان کے دل میں نہیں آیا۔

ہومیوپیتھی سیکھنے کا شوق چرایا، اسے پوری لگن سے سیکھا۔ چاہتے تو ایک کامیاب ڈاکٹر کے طور پر یہ پیشہ اختیار کر سکتے تھے لیکن اپنے اس علم کو رفاہِ عام کے کام میں لائے۔ مالی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اور بھی کئی کام سیکھے۔ کئی علم حاصل کیے لیکن انھیں ذریعہ معاش بنانے کی کبھی خواہش نہیں کی۔

ان میں سے کسی بھی کام میں انھیں مقصدِ حیات نظر نہیں آیا۔ آخر ان کی بصیرت نے رہنمائی کی اور وہ کام لاکر سامنے رکھ دیا جسے ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ علم و ادب کا میدان ان کی عمل گاہ بنا۔ یہی وہ اعلیٰ و ارفع مقام تھا جس میں انھیں منزلِ مقصود کی جھلک دکھائی دی۔ راستہ آسان نہ تھا۔ خارزاروں کا سفر تھا۔ لیکن ادبی سفر ملا تو چل پڑے۔ چلتے رہے تا دمِ آخر۔

شاعری کا شوق انھیں بچپن سے تھا۔ باکمال استادوں کی رہنمائی میں وہ باکمال استاد شاعر کی حیثیت میں دنیائے ادب کے سامنے آئے۔ سینکڑوں ان کی توجہ و التفات سے فیض یاب ہوئے۔ عزت و شہرت انھیں نصیب ہوئی۔ یہاں پہنچ کر بھی وہ رُکے نہیں۔ مقصدِ حیات کی جستجو میں سرگرمِ سفر رہے۔ آخر ان کی نظر تحقیق و تالیف کے کام پر آکر رُکی جو آسان نہیں ہے، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ لگن اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنی بقایا زندگی پورے خلوص اور پوری لگن سے اس کے لیے وقف کر دی۔

مشرقی افریقہ میں تھے تو اردو زبان کی خدمت میں فعال رہے۔ وہاں انھوں نے شمعِ ادب روشن کی اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ مشاعروں و ادبی محفلوں کا اہتمام کیا۔ مقامی اہلِ علم و دانش کے علاوہ ہندوستان و پاکستان سے اردو ادب کے کئی درخشاں ستاروں نے ان محفلوں کو اپنی آمد سے روشن کیا۔ بیشتر مجلسیں ان کے دولت کدے پر ہی منعقد ہوتی تھیں۔

حالات کے تقاضے سے انھیں افریقہ چھوڑ کر اپنے دیش آنا پڑا۔ ان کے یہاں پہنچنے سے پہلے ان کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی۔ ان کے ابتدائی کلام کے مجموعے "شعلۂ خاموش"، "شورشِ پنہاں"، "شاخِ گل" یہاں شائع ہو کر اہلِ نظر سے داد و تحسین حاصل کر چکے تھے۔

یہاں پہنچ کر انھوں نے ذاتی کتب خانے کی از سرِ نو تعمیر کی۔ کچھ ذخیرہ ان کے پاس تھا۔ کئی قیمتی مخطوطے اور نایاب کتابیں انھوں نے یہاں فراہم کیں۔ ذہن میں ایک نقشہ تیار کیا اور ایک باقاعدہ پروگرام کے مطابق کام شروع کیا۔ اور یہیں سے تالیف و تحقیق کا وہ سلسلہ شروع کیا، وہ راستہ اختیار کیا جو انھیں منزل کی طرف لے جانے والا تھا۔

غالبؔ، آتشؔ، جوشؔ ملسیانی، چکبستؔ، داغؔ، ذوقؔ، فراقؔ، اقبالؔ، کن کن آستانوں پر وہ نہیں پہنچے۔ جہاں

جہاں سے بھی انمول موتی ملے انھیں فراہم کیا اور بیحد شائستگی اور سلیقے سے شائقین ادب کی نذر کر دیا۔

اپنی نگارشات کی اشاعت کے لیے انھیں کسی ناشر کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ خود محنت کی اور اپنے پیسوں سے انھیں شائع کیا۔ جو سرمایہ اپنے کاروبار میں لگا کر دوگنا سہ گنا کر سکتے تھے اسے اردو ادب کی نذر کر دیا۔ کسی معاوضے، کسی ستائش، کسی انعام کے متوقع نہیں ہوئے، کسی اعزار کی تمنا نہیں کی۔ اپنی محنت و مشقت، اپنی قابلیت و استعداد کی قیمت طلب کرتے تو یہ غیر قدرتی عمل نہ ہوتا۔ دنیاوی اصولوں کے عین مطابق ہوتا۔ لیکن وہ عام انسان نہیں تھے۔ ایک یوگی تھی، ایک کرم یوگی۔ جو اپنے ہر عمل کو اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتا ہے۔ اسے اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتا ہے۔ انھیں اپنے کام سے کام رہا۔ اسی میں تسکین قلب پائی۔ عمل کو عبادت کا درجہ دیا۔ ثمر کے تمنائی نہیں ہوئے۔ پروردگار عالم جانتا ہے کہ اس کے اس نیک بندے نے اپنے فرض سے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ جس مقصد کے لیے اس نے یہاں بھیجا تھا اور جسے ذہن نشین کرانے میں اس کی پوری رحمت شامل تھی، اسے پورا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ وہ اپنے مالک کے ہر اشارے کو سمجھتے تھے۔ اس کی رحمتوں کو پہچانتے تھے۔ اس سے بڑا عرفان اور کیا ہو سکتا ہے؟ اہل دنیا نے انھیں پہچاننے میں بہت دیری کی۔ جو انعام و اکرام انھیں نصیب ہوئے ان سے کئی زیادہ کے وہ حقدار تھے۔ غالب ایوارڈ، اردو اکادمی دہلی کا کل ہند بہادر شاہ ایوارڈ، قطر عالمی اردو ایوارڈ، پنجاب ساہتیہ شرومنی ایوارڈ اور آخر میں حکومت ہند کا پدم شری ایوارڈ جسے وصول کرنے سے پیشتر ہی وہ اپنے خالق سے جا ملے۔ کیا یہی سب کچھ تھا ان کی محنتوں کا صلہ ؟ ان کی ستیہ کاویوں کا، ان کی ریاضتوں کا ثمر؟

نہ پاؤں کے چھالے اور نہ راستے کے پتھر اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ افتاں خیزاں، بلند حوصلگی، یقین و اعتماد، پورے وقار کے ساتھ وہ آگے بڑھتا گیا۔ منزل کے کئی پڑاؤ سامنے آئے لیکن وہ کہیں رُکا نہیں۔ رُکا تو پروردگار سے پھر چلنے کے لیے دعا مانگی۔

میں رک گیا تھا سایہ دیوار دیکھ کر — منزل ہنوز دور ہے اذن خرام دے

خداوند کریم کی رحمتوں پر اسے کامل یقین تھا۔ اسی کے سہارے اس نے اپنے سفر کو جاری رکھا۔ ان کی صحت اور حالات اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ جسم کو کئی عارضے لاحق تھے۔ دل کی حالت نے کئی کچوکے دیے تھے۔ دماغ پر کئی طرح کے مسائل کا بوجھ تھا۔ لیکن اس نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ کبھی مایوس نہیں ہوا۔ کبھی حوصلے کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ سفر اس کا مقصد حیات تھا۔ جو راہ عمل اختیار کر لی اسی پر تادم آخر گامزن رہا۔ جو کام انھوں نے ہاتھ میں لیا اسے شبانہ روز کی محنت سے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کوشاں رہے جو کچھ لکھا اسے اپنی نجی کمائی سے شائع کرتے رہے۔ بہت کچھ مسودوں کی شکل میں پڑا رہا، شائع نہیں ہو سکا۔ کئی مضامین ان کے ذہن میں تھے جنھیں وہ جامہ تحریر عطا کرنا چاہتے تھے، کر نہیں پائے۔ ابھی کہانی ختم نہیں ہوئی تھی، ابھی ڈرامے کا آخری سین نہیں آیا تھا کہ دست غیب نے پردے گرا دیے۔ تماشائی دم بخود،

گئے۔ سب کچھ نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ کوئی اس انجام کے لیے تیار نہیں تھا۔

ایک کثیر سرمایہ، قابل قدر سرمایہ ادب وہ ہماری نذر کر چکے ہیں لیکن وہ عشر عشیر بھی نہیں جو وہ ہمیں دینے کے متمنی تھے۔ مسودوں کی شکل میں پڑے ہوئے اوراق ممکن ہے کبھی اشاعت پا جائیں، لیکن سینکڑوں اوراق کا مواد جو اس کے ذہن میں تھا وہ ہمیں کون دے پائے گا؟ ابھی ان کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ ابھی مسافر تھکا نہیں تھا۔ ابھی وہ آرام کا طالب نہیں تھا۔ ابھی وہ منزل کا آرزو مند بھی نہیں تھا۔ ابھی اس نے ناؤ نہیں ماندھی تھی۔ ابھی اس کا گہرے پانیوں کا سفر جاری تھا۔ کیسے وہ درمیان ہی میں کٹ گیا۔

مسافر تو کہیں رکنے والا نہیں تھا۔ اپنے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا خواہش مند تھا۔ اس کا دائرۂ عمل محدود نہیں تھا۔ ایک کام ختم کر لیا تو اس کی بے چین فطرت کوئی دوسرا کام اس کے سامنے لاکر رکھ دیتی۔ کام ہی اس کی ریاضت اور کام ہی اس کی عبادت تھی۔ وہ مہان یوگی جسے ہم کالی داس گپتا رضا کی صورت میں جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ وہ یقینا کسی دوسری شکل میں ہماری نظروں کے سامنے آئے گا۔ ممکن ہیں ہم اسے پہچان نہ پائیں۔ وہ آئے گا ضرور۔ اپنی ذمہ داری نبھانے، اپنے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے۔

شائقین ادب کو اس کا انتظار کرنا ہوگا۔

اس ازلی مسافر پر۔ اس مہان یوگی پر ہمارے لاکھ سلام۔

☆☆☆

1707 / 71, Kucha Borhwala,
Khooh Bombay wala, Amritsar - 143 006

بات ایک سمندر کی

اقبال حمید

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کالی داس گپتا رضا صاحب سے ملاقات کا مجھے شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ دوستوں سے اکثر ان کے بارے میں سنتا رہتا تھا۔ وہ استاد شاعر ہیں، ماہر غالبیات ہیں، محقق، ناقد اور اچھے انسان بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک امیر گھرانے سے اں کا تعلق ہے۔ پونہ میں اں کا فلیٹ ہے وہ جب بھی پونہ آتے ہیں متعلق لوگ ان سے ملتے ہیں، استفادہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو علمی و ادبی طور پر اں سے فیض بھی ملتا ہے۔ لیکن میں ان کی صحبتوں سے محروم رہا۔ کسی نے مجھے اں سے نہیں ملوایا اور تنہا ملاقات کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ اں کی سمندر جیسی شخصیت کا خوف دل پر ہمیشہ طاری رہتا۔ میں ادب کے دریا کی ایک ہلکی سی موج، میری بساط ہی کیا کہ میں علم کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر سے آنکھ ملاؤں۔ تاہم اُن سے ملاقات کا اشتیاق کسی لمحہ بھی کم نہیں ہوا۔ موج ہمیشہ سمندر سے ملنے کو بے تاب رہتی ہے اور ایک دن قدرت مجھ پر اچانک مہرباں ہو گئی۔ مولیدینہ ہائی اسکول کیمپ کے مشاعرے میں شرکت کی دعوت ملی۔ اگرچہ میں اُن دنوں ادب کی دنیا میں نو وارد ہی تھا۔ پھر بھی دیگر شعراء کے ساتھ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس مشاعرے کا انعقاد ہنگامی طور پر ہوا تھا۔ جیسے ہی میں مشاعرہ گاہ پہنچا مائک کے توسط سے یہ خبر میری سماعت سے ٹکرائی کہ آج کے مشاعرے کی صدارت کالی داس گپتا رضاؔ فرمارہے ہیں۔ رضا صاحب نے ہنگامی طور پر منعقد کردہ اس مشاعرے کی صدارت قبول فرمائی، اس کے لیے ان کا پیشگی شکریہ بھی ادا کیا جارہا تھا۔

میں نے رضا صاحب کو اس سے پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا لیکن جب میں نے سجے سجائے اور بھرے پورے اسٹیج پر نظر دوڑائی تو تمام آشنا چہروں کی بھیڑ میں ایک ہی چہرہ ایسا تھا جو میرے لیے اجنبی تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہی رضا صاحب ہیں۔ اونچی پوری شخصیت۔ بدن پر سفید براق جیسے کپڑے، کشادہ پیشانی، گہری آنکھیں، بھرے بھرے رُخسار، قدرے اوپر کو اُٹھتی ہوئی ناک، چہرے پر ایک قسم کی معصومیت، اپنے اطراف بیٹھے ہوئے شعراء سے مسکرا کر گفتگو کر رہے تھے۔ نہ علم کا غرور نہ دولت کا نشہ۔ سب کے ساتھ بیٹھے سب کے جیسے لگ رہے تھے۔

اس کے بعد صدارت کا اعلان ہوا۔ پھر کسی نے تائید کی اور مشاعرہ شروع ہو گیا۔ دو شاعروں کے بعد میرا نمبر تھا۔ میں اندر سے گھبرایا ہوا تھا کہ رضا صاحب کی صدارت میں اور رضا صاحب کے سامنے غزل سنانے کا پہلا اتفاق تھا۔ ایک طرح سے دل میں خوشی بھی سر اٹھا رہی تھی کہ چلو آج رضا صاحب کے سامنے غزل پڑھنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ مجھ سے پہلے جن شاعروں نے غزل سنائی تھی ان کے ایک دو شعر پر رضا

صاحب نے داد دی تھی جس سے میرا حوصلہ بھی بڑھا تھا۔ میرے ایک شعر پر بھی رضا صاحب نے داد دی اور مجھے وہ شعر دوبارہ پڑھنے کا حکم دیا تو میں ایک طرح سے گھبرا گیا۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ میں اپنا ہی شعر غلط پڑھ جاتا ہوں۔ یہ میری کمزوری ہے لیکن بعد میں مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ رضا صاحب کو میرا وہ شعر پسند آیا تھا، اس لیے مکرر پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ اس دن میں نے پہلی بار رضا صاحب سے ان کا کلام سنا۔ آپ نے سامعین کی فرمائش پر ایک کے بعد ایک غزل سنائی۔ سیدھا دل میں اُتر جانے والا اسلوب، فارسی، کا اثر کم کم، سادگی میں گہرائی اور گیرائی، بلا کی فصاحت، سامعین نے خوب خوب داد سے نوازا۔ رضا صاحب بھی اچھے موڑ میں تھے۔ خوب دل کھول کر کلام سنایا۔ مشاعرے کے اختتام کے بعد لوگ اُن سے مصافحہ کر کے چلے گئے۔ میرا ذاتی طور پر تعارف پھر بھی نہیں ہوا۔ میری خوشی ادھوری رہ گئی۔ پھر معلوم ہوا کہ رضا صاحب بمبئی تشریف لے گئے۔ پھر ایک سال کے بعد حسب معمول جب میں حکیم رازی صاحب کے مطب پر حاضر ہوا تو میں نے کالی داس گپتا رضا صاحب کو وہاں موجود پایا۔ مدیر فتح پوری اور دلدار ہاشمی بھی موجود تھے۔ حکیم صاحب نے میرا تعارف پیش کیا۔ میں نے رضا صاحب کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، ہاتھ ملاتے ہوئے رضا صاحب نے فرمایا میں ان کو جانتا ہوں پچھلے سال میں نے ان کی غزل بھی سنی تھی۔ پھر رضا صاحب نے میرے اُستاد محترم حنیف ساغر صاحب کی خیریت معلوم کی۔ اس کے بعد مجھے اپنے فلیٹ پر آنے کی دعوت دی۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ دوسرے روز میں نذیر بھائی کے ساتھ اُن کے فلیٹ پر حاضر ہوا۔ اب اجنبیت کے سارے پردے اُٹھ گئے تھے۔ رضا صاحب نے غیر رسمی خاطر مدارات فرمائی۔ پھر میرے کاروبار سے متعلق پوچھنے لگے۔ میں نے کہا تجارت کرتا ہوں۔ سن کر خوش ہوئے۔ فرمایا پونہ کے شاعر مجھے اسی لیے پسند ہیں کہ سب اپنے اپنے کاروبار میں لگے ہیں، شاعری کو کسی نے پیشہ نہیں بنایا۔ جب بھی کہیں پونہ کے شاعروں کی تعریف ہوتی ہے تو میں بہت خوش ہوتا ہوں۔ پہلی ہی ملاقات میں رضا صاحب کا احترام میرے دل میں دوبالا ہو گیا۔ کافی دیر تک ہم دونوں رضا صاحب سے گفتگو کرتے رہے۔ شعر کی باتیں، ادب کی باتیں، غالب اور مختلف شعراء کی باتیں۔ جہاں سے پوچھئے رضا صاحب کے پاس جواب حاضر ہے۔ واقعی وہ علم کا سمندر تھے۔ جب ہم جانے لگے تو میں نے پوچھا کیا میں آئندہ بھی حاضر ہونے کا شرف حاصل کر سکتا ہوں۔ حسب عادت رضا صاحب مسکرائے۔ فرمانے لگے آنے سے پہلے فون کر لیا کرنا۔ ہم اگر باہر چلے جائیں تو آپ کو زحمت ہو گی۔ واقعی وہ اپنے احباب کا خیال رکھتے تھے۔ کوئی اُن سے ملنے آئے وہ نہ ملیں۔ رضا صاحب کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ اس کے بعد وہ جب بھی پونہ آتے میں اکثر ان سے ملنے جاتا۔ گھنٹوں ان کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتا۔ میرا اشتیاق دیکھ کر انھوں نے مجھے اپنی کئی کتابیں عنایت فرمائیں۔ کتابوں پر ایک نوٹ لکھا کرتے، اقبال حمید مطالعہ کریں اس کے بعد دستخط فرماتے اور تاریخ ڈال دیتے۔ پہلی بار جب میں نے قیمت ادا کرنا چاہی تو انھوں نے منع کر دیا۔ ان کی کتاب "سہو در سراغ" کے مطالعہ کے بعد میں نے ان سے کچھ باتوں کی وضاحت چاہی اور کتاب کے مضامین پر گفتگو کی

تو بہت خوش ہوئے۔ فرمایا میں نے اکثر احباب کو کتابیں فراہم کیں۔ لیکن آج تک کسی نے یوں مجھ سے دوبدو میری کسی کتاب کے بارے میں گفتگو نہیں کی۔ بڑی تفصیل سے انھوں نے میری باتوں کا جواب دیا۔

ایک بار مذہب کے تعلق سے باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا ہندو دھرم کی کتابوں میں اتنا تضاد کیوں ہے؟ اُتری اور دکشنی رامائن میں کچھ باتیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتیں جبکہ قرآن شریف مشرق و مغرب، شمال و جنوب چاروں سمتوں میں ایک ہی ہے۔ کہیں زیر زبر کا فرق نہیں ہے۔ فرمانے لگے "مسلمانوں نے قرآن کو بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ قرآن کی حفاظت کے لیے وہ کٹ مرتے ہیں لیکن ادنیٰ سی تحقیف بھی برداشت نہیں کرتے"۔ پھر وہ مسلمانوں سے متعلق کہنے لگے "آج کے اس دور میں بھی مسلمان اپنے ایمان کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ مسلمان آج بھی سچ بولتا ہے اور پورا تولتا ہے۔ میں نے گھر میں اپنی بیوی سے کہہ رکھا ہے کہ سبزی وغیرہ لینا ہو تو مسلمانوں سے لیا کرے کیونکہ مسلمان تو پورا تولتا ہی ہے۔ چیزوں کے عیوب بھی ظاہر کر دیتا ہے"۔ رضا صاحب کے دل میں مسلمانوں کی عزت تھی، اُن کے اکثر ملنے والے مسلمان ہی ہوا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ پانچ سال آر ایس ایس کے کیمپ میں گزار چکے ہیں۔ یہ ابتدائی دنوں کی بات ہے لیکن اس کی زندگی میں، ان کے سلوک میں، اس کے کردار میں، اس کی گفتگو میں کبھی تعصب کی جھلک دکھائی نہیں دی۔ انھوں نے ہمیشہ وسیع القلبی اور وسیع المشربی کا ثبوت دیا۔ بابری مسجد کی شہادت پر انھوں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ ۱۹۹۳ء کے فسادات کے تناظر میں ایک نظم کہہ کر اپنا دکھ اس میں سمو دیا۔

رضا صاحب کی گفتگو کا طریقہ محو کر دینے والا تھا۔ وہ اپنے جملوں کی ڈور سے سامعین کو باندھ لیا کرتے تھے۔ بچپن سے بڑھاپے تک کی اپنی زندگی کے اکثر واقعات چن چن کر سنایا کرتے۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ بے شمار فارسی اور اردو کے اشعار ان کو حفظ تھے۔ شعر سنا کر گفتگو کا حسن بڑھا دیتے تھے۔

غصہ، نفرت اور ناراضگی کا عنصر ان کی طبیعت میں بہت ہی کم تھا۔ ایک واقعہ مجھے یاد ہے، مشتاق مدنی نے ان کی توصیف میں ایک مضمون لکھا۔ جب یہ مضمون بے باک مالیگاؤں میں شائع ہوا تو ایک نومشقیہ نے اس کے جواب میں مضمون لکھ کر اپنا قد بڑھانے کی کوشش کی۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

کتنی آسانی سے مشہور کیا ہے خود کو　　میں نے اپنے سے بڑے شخص کو گالی دی ہے

لیکن رضا صاحب کی سمندر جیسی شخصیت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ خاموش رہے۔ لیکن ان کے دوست مولانا حسن عباس فطرت کو یہ حرکت قطعی پسند نہ آئی۔ انھوں نے رضا صاحب کے حق میں ایسا لاجواب اور مدلل مضمون لکھا کہ اس نومشقیے کو بھاگتے ہی بنی۔

رضا صاحب کے لیے اردو ہی سب کچھ تھی۔ اردو کی خوشبو ان کی سانسوں میں بسی ہوئی تھی۔ ان کا گھر اردو کی نایاب کتابوں کا، رسالوں کا، مخطوطوں کا اور مسودات کا خزانہ تھا۔ وہ اردو میں سوچتے، اردو میں بولتے اور اردو ہی میں لکھتے تھے۔ اردو کے تحفظ کے لیے انھوں نے رسائل کی معاونت کی۔ "اسباق" کی مثال ہمارے

سامنے ہے۔ جب بھی ملاقات ہوتی "اسباق" کے لیے فکر مند رہتے۔ "اسباق" کے فروغ کیلئے اکثر مجھے بھی کہا کرتے تھے۔ پونہ سے انھیں بیحد پیار تھا۔ ملاقات پر پونہ کے مرحوم شعراء کو اکثر یاد کرتے۔ بالخصوص مرحوم رشید اعجاز کو یاد کرتے۔ رشید اعجاز کے انتقال کا انھیں ہمیشہ افسوس رہا۔ رشید اعجاز کی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے۔

رضا صاحب عروضی علم سے آشنا تھے۔ علم نجوم بھی جانتے تھے۔ موسیقی کا درک بھی رکھتے تھے۔ خود ستار بجاتے۔ ہارمونیم پر مشق کرتے تھے۔ راگ راگنیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ ہومیوپیتھی سے علاج بھی کیا کرتے تھے۔ برسوں اپنی اہلیہ کا علاج انھوں نے خود کیا۔ اپنا علاج بھی خود ہی کرلیا کرتے تھے۔ وہ کیا تھے کیا نہیں تھے۔ مجھ ایسے کے لیے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں جو کچھ ایک سمندر کے سینے میں ہوتا ہے۔ ویسا ہی کچھ رضا صاحب کے سینے میں تھا۔ سمندر کو کتنا ہی کھنگالا جائے لیکن سمندر کا راز کوئی نہیں پاسکتا۔ رضا صاحب کو بھی ادبی طور پر کتنے ہی ذہنوں نے کھنگالا۔ کتنے ہی دماغوں نے ڈبکی لگائی لیکن کسی نے بھی مکمل طور پر ان کو نہیں پہچانا۔ سمندر کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں جتنا تلاش کیا جائے اتنی ہی اس کی تہیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہی مثال ہم رضا صاحب کے لیے بھی دے سکتے ہیں۔

وہ یکایک ایسا بچھڑا اجنبی سے موڑ پر
چل رہا تھا جو ہمارے ساتھ ہمدم کی طرح

Kamraj Nagar Yerwada, Pune - 411 006

☆☆☆

علامہ کالی داس گپتا رضا کی اسلامی شاعری

محمد کمال اظہرؔ کی

کویت میں منعقدہ محافل اور احباب کو منظوم خراج عقیدت

تم بھلائے نہ گئے

پہلا حصہ جلد منظر عام پر آرہا ہے۔
تکمیل کے آخری مراحل میں

حرف عقیدت، دو آتشہ، تبرکاتِ ناصر، اور تم بھلائے نہ گئے
کے بعد غزلوں، نظموں اور ہزلوں پر مشتمل محمد کمال اظہرؔ کی چھٹی کتاب

کہو نہ پیار ہے جاناں

دنیائے ادب پبلی کیشنز کراچی کے تعاون سے
طباعت کے آخری مراحل میں

محمد کمال اظہرؔ، مینجنگ ایڈیٹر، کویت جرنل آف
سائنس، کویت یونیورسٹی، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۱۶۰، خالدیہ، کویت۔

Mohd. Kamal Azhar, Managing Editor,
Kuwait Journal Science, Kuwait University,
Post Box No 17160, Khaldiyah, Kuwait (A G)

'الہام'، 'آگہی' اور 'کربلا' جیسے کتابوں کے خالق

ابراھیم اشکؔ

جہاں ترقی پسند و جدید ٹھہر گئے
کہ اشکؔ آگہی اپنی وہاں سے آگے ہے

کیا فرماتے ہیں علمائے ادب ؟

☆ کم از کم زبان کے استعمال کے سلسلے میں انھوں نے کبیر، نانک اور نظیر کی روایت کا اتباع کیا ہے۔ کمال احمد صدیقی

☆ آپ کے شعر میں بڑی جان ہے۔ رچاؤ بھی ہے۔ تازگی اور تیور بھی۔ مجھے اپنا ایک ادنیٰ مدّاح جانیں۔ گوپی چند نارنگ

☆ کوئی شاعر اپنے کلام کو معنی آفریں بنانے کی ایماندارانہ کوشش بھی کرتا دکھائی دیتا ہے تو اسے کافی سمجھنا چاہیے۔ اشکؔ کے یہاں یہ سعی قدم قدم پر ملتی ہے۔ ان کے یہاں روایت اور جدیدت کا حسیں امتزاج ملتا ہے۔ جب وہ روایت سے نکلتے ہیں تو صرف چونکا ہی نہیں بلکہ مذاقِ سلیم کے آتشدان میں ایک ایسا شعلہ بھی بھڑکا دیتے ہیں جو ایک اچھا شعر سننے یا پڑھنے کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ کالی داس گپتا رضاؔ

☆ مجھے کہنے دیجیے کہ ابراہیم اشکؔ کو اپنے تخلیقی تجربات کے اظہار پر فنکارانہ قدرت حاصل ہے۔ اس قدرت کی بنیاد پر اشکؔ نے روایت اور جدیدیت کی توسیع کا فرض انجام دیا ہے۔ عنوان چشتی

☆ اگرچہ بات مبالغہ آمیز نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہر شعر نے متاثر کیا۔ جگن ناتھ آزاد

☆ بہت دنوں کے بعد کسی سچ مچ کے شاعر کا کلام پڑھنے کو ملا۔ نئی نئی آوازوں کے اس شور میں وہ آوازیں بھی گم ہو جاتی ہیں جو دل سے نکل کر دل میں اتر جانے کی صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ لیکن آپ کی آواز ذرا توجہ سے کوئی سنے تو آوازوں کے اس جنگل میں پہچانی بھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عصمت جاوید

کالی داس گپتا رضا کی نعتیہ شاعری

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط

آنجہانی کالی داس گپتا رضا اردو کے شیدائی، ماہر غالبیات، زبردست محقق، اچھے ناقد اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ شاعری میں ان کا سلسلہ استاد داغ سے ملتا ہے، لیکن رضا کو نقد و تحقیق میں جو بلند مقام حاصل ہوا، شاعری میں وہ اس مقام کو حاصل نہ کر سکے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ رضا کی شاعری غیر معیاری ہے۔ بلکہ میرا تو یہ تجزیہ ہے کہ رضا کا کلام بعض کہنہ مشق شعراء کے کلام پر بھاری ہے۔ یہ محض فن میں ان کے اخلاص نیت اور دھن کے پکے پن کا ثمرہ ہے۔ وہ اگرچہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں مشرقی افریقہ کینیا جیسے غیر اردو علاقے میں جاکر بسے لیکن اردو کے دامن کو انھوں نے ہاتھ سے کہیں چھوڑا۔ شاعری میں انھوں نے جوش ملسیانی سے فیض حاصل کیا تھا اور یہ ذوقِ شاعری ۱۹۳۹ء سے تادم واپسیں ان کے لیے باعث تسکین و فرحت رہا۔

ان کے مجموعہ ہائے شاعری میں "اُجالے" اور "احترام" نعتیہ کلام پر مشتمل کتابچے ہیں جن میں کینیا کے دورانِ قیام میں لکھی ہوئی نعتیں شامل ہیں۔ یوں بھی نعتیں لکھنے کی تحریک انھیں کینیا ہی میں ملی تھی۔ انھوں نے ذکر میلاد النبیؐ پر اولیں نعت ۱۹۴۱ء میں لکھی تھی۔ وہ اگرچہ کٹر ہندو تھے اور عقائد میں بھی بڑے سخت تھے لیکن کینیا میں اسلام اور اہل اسلام کی قربت نے ان کے دل میں رسولِ اکرمؐ کی عظمت پیدا کر دی تھی اور اسی سے تحریک پاکر انھوں نے نعتیں لکھیں۔ "اُجالے" ان کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا، بعدہٗ ۱۹۹۷ء میں انھوں نے "احترام" کے عنوان سے اضافوں کے ساتھ دوبارہ شائع کروایا جس میں اکثر کلام "اُجالے" سے ماخوذ ہے۔

مذکورہ دونوں نعتیہ کتابچوں میں شاعر کے پیش لفظ کو پڑھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رضا نے نعتیہ کلام نیروبی (کینیا) میں قیام کے دوران ہی لکھا ہے اور ان کی اشاعت وطنِ عزیز میں واپسی کے بعد ہوئی۔ "احترام" کے پیش لفظ میں رضا نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ "اس سے کم از کم تین گنا نعتیہ کلام ۱۹۷۰ء میں نقل مکانی کے دوران ضائع ہو گیا"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ تمام کلام یکجا کر دیا جاتا تو رضا کا "نعتیہ دیوان" بآسانی ترتیب دیا جاسکتا تھا۔ بہرحال! رضا کا نعتیہ کلام حضورؐ کے تئیں ان کے جذبہ عزت و احترام اور محبت و الفت کی غمازی کرتا ہے اور شاعر کی عقیدت مندی کا پرتو نعت کے ہر شعر میں جھلکتا ہے۔ ایک رباعی میں وہ کہتے ہیں ۔

جو شعر کہا لبِ طہارت سے کہا   جی جان سے، احترام و عزت سے کہا

ہے قابل در گزر غلط بھی میرا　　جو کچھ بھی کہا میں نے محبت سے کہا

"احترام" کی ابتداء ایک شعر سے ہوتی ہے۔ رضا نے اسے "نور ہی نور" کی سرخی دی ہے۔ نور حضورؐ کی صفت ذاتی ہے۔ علماء امت میں سے بعضوں نے آپؐ کی صفت نورانی کی دلیلیں نصوص قطعیہ اور احادیث سے دینے کی سعی فرمائی ہے۔ اردو کی نعتیہ شاعری میں اس موضوع کو اتنا طول دیا گیا ہے کہ "نور ناموں" کے عنوان سے مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اردو شعراء نے آپؐ کی "صفت نور" پر اپنے خلاق تخیل سے عجیب عجیب مضامین باندھے ہیں۔ بعضوں نے غریب و ضعیف روایات کا سہارا لے کر طویل مثنویاں تک لکھ ڈالی ہیں۔ رضا نے ایک ہی شعر میں "نور ناموں" کے سارے موضوع کو سمیٹ لیا ہے۔ اس کی توضیح میں صفحات کے صفحات لکھے جاسکتے ہیں کہ عقیدت و محبت اگرچہ اندھے ہوتے ہیں، لیکن تصور و ادراک باطنی کی آنکھوں سے عقیدت مند سب کچھ دیکھ لیتا ہے جسے سر کی آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔

"احترام" میں دو رباعیاں ہیں۔ ایک رباعی دعائیہ ہے جس میں رضا نے اپنے رب سے "نعت احمد" کہنے کے لیے افکار و خیالات کی کثرت، بے لاگ بات کرنے کی طاقت اور نعت رسولؐ کہنے کی توفیق و فضیلت کی التجا کی ہے۔ دوسری رباعی نعتیہ ہے۔ اس میں شاعر نے نبیؐ کی صفات سے ہر گوشۂ دل کو معمور ہونے کے راز کو واشگاف کیا ہے۔

قطعات میں رضا کے یہاں نعتیہ عناصر کا کامیابی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ یہاں شاعر کی کہنہ مشقی اور فنی چابکدستی نیز حضورؐ کے تئیں ان کی عقیدت اوج پر دکھائی دیتی ہے۔ شاعر نے قطعات میں مختلف موضوعات کو نہایت فنکارانہ انداز میں باندھا ہے۔ رضا، حضور رحمتؐ سے اکرام و شفاعت کے سوا دنیا کی کسی چیز کی طلب نہیں کرتے۔ وہ ذکر نبیؐ میں حقیقت پسندی کے قائل ہیں اور ایسی شاعری کے خواہاں ہیں جس میں شانِ دربار رسولؐ نمایاں ہوتی ہو۔ انھوں نے اپنے بیشتر قطعات میں "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" اور "اتباع رسول" کی توضیح نہایت خوبصورت انداز میں کی ہے۔ مدح رسولؐ میں ان کے قطعات نہایت جاندار ہیں۔ انھوں نے بعض اہم لیکن تفصیل طلب واقعات رسولؐ کو قطعہ کے چار مصرعوں میں قلم بند کردیا ہے۔ ان کے یہاں نعتِ رسولؐ میں استغاثہ اور استمدادیہ لب و لہجہ بھی پایا جاتا ہے درآنحالیکہ وہ "خالق اکبر" سے "ذہن قابلِ توصیف پیمبر" ہو جانے کی دعا شام و سحر کرتے ہیں۔ ان کی نعتوں میں استمدادیہ پہلو ملاحظہ ہو

اے رسولؐ آپ کو اللہ کی رحمت کی قسم　　عشق اللہ کی، اثباتِ نبوت کی قسم
دلِ معصوم کی میراثِ رسالت کی قسم　　نور دیں، نور ہدیٰ، نور طہارت کی قسم

زیست کے راز کو انسان پہ افشا کردیں
اہل دل کو حق و باطل سے شناسا کردیں

رسول کریمؐ سے ان کی عقیدت اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ "ذات احمد کو سب سے بڑا سہارا"، "راہ

تاریک میں رہبر"، "سرکار بھی، ہادی بھی، آئین بھی" سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے قطعات میں ذاتِ والا صفات حضور کو "شاہ دیں"، "فقیر یثرب، صبر و اخلاق کے دھنی" کہا ہے۔ ان کے نعتیہ کلام کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں شانِ الوہیت کا استخفاف پایا جاتا ہے نہ انبیاء کرام کی رفعت شان کا استقصار۔ ان کے یہاں عقیدت میں غلو نہیں پایا جاتا۔

رضاؔ نے نعت گوئی کا آغاز ۱۹۴۲ء سے کیا ہے۔ ان کی اولین نعتیہ نظم "عید میلاد النبیؐ" تھی۔ اس نظم میں شاعر نے آپؐ کی ولادتِ باسعادت سے عالم انسانیت کو ہوئے فوائد کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ آپؐ کی آمد کو "تیرگی میں نور، ظلم و استبداد میں عدل و صفا" اور "غم و اندوہ میں نشاط و انبساط" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس نبیؐ کی آمد کی برکات سے آسمان سے سیکڑوں انوار فرشِ زمیں پر برسے۔ آپؐ کی ولادت سے زمانے نے کروٹ کھائی اور ایک انقلابِ عظیم رونما ہوا کہ جہالت کے اندھیروں میں توحید کی مشعل جگمگانے لگی، ناشائستگی شائستہ روی میں، درندگی انسانیت میں اور بد اخلاقی تہذیب و اخلاق میں بدلیں۔ بھائی چارگی اور امن و آشتی کو فروغ حاصل ہوا۔ "لب خاموش کو اندازِ تکلم"، "قلب سفاک میں ترحم"، "آہ و نالہ کی جگہ ترنم"، "لب افسردہ کو تبسم"، "تشنہ ہائے لبِ انسانیت کو تراوٹ"، "دل حزیں کو مسرت"، "روئے رنجیدہ کو نشاط" اور "روح زخم خوردہ کو انبساط" آپؐ کی آمد سے حاصل ہوا۔

ولادت ناموں (مولود ناموں) کے مروجہ طریقوں کے مطابق رضاؔ نے اپنی نعتوں میں "قبل از ولادتِ رسولؐ" کی عربی تہذیب و معاشرت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ایسے اشعار میں ان کے یہاں تاریخ کو بیان کرنے کا شاعرانہ انداز بڑا پُر اثر ہے۔ اشاروں، کنایوں اور ابہام و استعارات میں انھوں نے قبل از ولادتِ رسولؐ کے سماجی حالات کچھ اس طرح پیش کیے ہیں کہ تاریخ کا خشک و یاس موضوع شعر کے لطیف و نفیس اسلوب میں ڈھل کر بڑا دل آویز بن گیا ہے ۔

نہ غنچے میں چٹک کہیں نہ پھول عطر بیز ہے　　　خزاں کے ظلم و جور سے بہار نالہ ریز ہے
تصور حیات ہے غم و الم کی گود میں　　　ابد کی نیند سو چلا بشر عدم کی گود میں
کسی نے اٹھ کے لذتوں سے دامن اپنا بھر لیا　　　کسی نے تیر عیش سے جگر میں چھید کرلیا
زمانہ ہوگیا اسی ڈگر پہ کائنات ہے　　　اندھیری رات ہے یہاں وہاں اندھیری رات ہے

پھر بعد از ولادتِ باسعادت معاشرے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، اندھیاریوں میں روشنی کی کرن پھوٹی، ظلمتیں چھٹیں، بساطِ غم اُلٹیں، مصیبتوں کا خاتمہ ہوا، رعونت اور غرور و تکبر کے شعلے فرو ہوئے، ظلم و استبداد کی آگ سرد ہوئی، سموم صبا میں بدلی اور باد صرصر خنک و ٹھنڈے جھونکوں میں تبدیل ہوئی ایسے عظیم انقلاب کا نقشہ تحیر و تعجب کے رنگ میں پیش کرنے کے لیے رضا استفہامیہ اسلوب اپناتے ہیں تو تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ صداقت کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے غالب نے بھی یہی اسلوب

اپنایا تھا۔ ع کیا وہ مرود کی صدائی تھی ؟ ؟ "، "ہوئے تم دوست حس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟" اب رضا کا انداز ملاحظہ ہو

مگر یہ آج کیا ہوا ؟ سکوں سا دل کو ہوگیا — کہاں گئیں رعونتیں ، کہاں غرور سو گیا ؟

مگر یہ آج کیا ہوا ؟ ہوا میں گدگدی سی ہے — سموم کا اثر نہیں فضا میں رندگی سی ہے

اس انقلاب عظیم کی انتہا یہ تھی کہ ۔

زمانہ ہو گیا آمادہ سجدہ ریزی پر — کہ سر رہا ہی نہیں اونِ خود سری کے لیے

اگرچہ اس نعت کی ابتداء ہی میں شاعر نے نعت گوئی کے میداں میں اپنے مقتدی ہونے کے ساتھ اپنی عجز بیانی کا اعتراف کیا ہے، لیکن ایک غیر مسلم شاعر کا آپؐ کی مدح سرائی میں کہا گیا مذکورہ بالا شعر بیسیوں نعتیہ دواوین پر بھاری ہے۔ اس ایک شعر میں رضا نے رسول اللہؐ کے ہاتھوں "سوتی مشن" کی کامیابی کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے۔

ناقدین ادب نعت اور غزل کے اسلوب و آہنگ میں فرق محسوس نہیں کرتے۔ بقول شارق جمال "دونوں کا ایک ہی طرز و اسلوب ہے اور بڑی توانا فکر کا متحمل ہے۔" دونوں میں احساسات و کیفیات کو جمالیاتی لب و لہجہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ دونوں میں تخیلات و تفکرات دل و حدیہ سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہاں وہی کی کھڑکیاں دل کے صحن میں کھلتی ہیں۔ دونوں میں حزن و وجداں کی ایسی رنگ آمیزی ہوتی ہے کہ ایک کا رنگ دوسرے کا تکملہ ہوتا ہے۔ دونوں میں لطیف جذبات کی شگفتہ کلیاں فرحت و نشاط آگیں تبسم لبوں پر سجائے ہوئے ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ نعت کے گلشن میں عقیدت شبنم افشانی کرتی ہے غزل میں عقیدت کی خنکی نہیں ہوتی۔ رضا نے غزل و نعت کے مذکورہ اوصاف کو دھیان میں رکھ کر ہی "نعتیہ غزلیں" کہی ہیں جن میں عقیدت و شیفتگی گلے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ رضا اس تجربے پر شاداں و فرحاں ہیں، فرماتے ہیں

نعت کے بدلے رضا آج سنائی جو غزل — واقعی یہ تمھیں میلاد میں سوجھی اچھی

اس پوری نعتیہ غزل میں "خمریات" کا رنگ غالب ہے۔ "میخانۂ احمد" کی مناسبت سے انھوں نے جام، خم، صراحی وغیرہ لوازمات میخانہ کو بطور استعارہ نہایت فنکارانہ انداز میں اپنے اشعار میں باندھا ہے، مثلاً

ساکھ میخانۂ احمد کی ہے کتنی اچھی — جام اچھے ہیں، خم اچھے ہیں، صراحی اچھی

ان کی ایک اور نعتیہ غزل محاکاتی انداز لیے ہوئے ہے۔ اس میں رضا نے رنگ و نور کے حسیں پیکر سجائے ہیں۔ یہاں نعت میں رضا کا تغزل اوج پر نظر آتا ہے۔ غزل کی چاشنی نے نعت کی شیرینی بڑھادی ہے۔ اس نعتیہ غزل میں قصیدے کی تشبیب کا رنگ جھلکتا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

زخم دل کھولے ہی رکھنا کہ اسی کھڑکی سے — دشت یثرب کی وہ مستانی ہوا آتی ہے

کیسے میلاد پہ برسیں نہ خوشی کے آنسو — یہ دن آتا ہے تو رحمت کی گھٹا آتی ہے

ہم کو جنت کی رتوں کی نہیں پروا کہ ادھر　　ابر مکے سے مدینے سے صبا آتی ہے

صنعت تجسیم (Personification) کے استعمال سے اس نعت کا ہر شعر موثر و جمال آفریں بن گیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رضا نے یہ نعت نہایت والہانہ انداز میں لکھی ہے۔ یہ نعت لکھتے وقت ان کے شاعرانہ افکار کا سمندر متموج و متلاطم تھا حسن کی موجوں میں گوہر ہائے معنوی اور دربائے صوری سمٹ کر آئے اور ساحل شعر پر بکھر گئے۔

رضا نے ایک نعتیہ غزل میں صنعت تضاد کا نہایت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ اثر آفرینی کے لحاظ سے یہ نعت دیگر نعتوں میں اونچا مقام رکھتی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے کیا تیور رکھتے ہیں ؎

کیوں نہ ملتا ہم رہیں والوں کو منزل کا سراغ　　آسماں پر شاہ راہِ کہکشاں ہیں آپؐ ہی

ڈوبتے انساں کی نظریں اور کس جانب اُٹھیں　　جو لگا دے پار وہ موج رواں ہیں آپؐ ہی

طائر بے بال و پر ، بے آشیاں تو ہی رضا　　اوج پرواز و سکونِ آشیاں ہیں آپؐ ہی

کالی داس گپتا رضا نے نظم کی ہیئت میں بھی نعتیں کہی ہیں جن میں روانی اور غنائیت دونوں پائی جاتی ہیں۔ نظموں میں انھوں نے الفاظ کے دروبست پر زیادہ توجہ دی اور ان کے لئے و آہنگ کا زیادہ خیال رکھا۔ وہ اس لیے بھی کہ وہ اپنی نعتیں محافل میلاد النبیؐ میں پڑھا کرتے تھے۔ اپنے نعتیہ مجموعے "احترام" میں انھوں نے اس جانب اشارہ بھی کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

بزم میلاد کا یہ کم تو نہیں ہے اعجاز　　کہ یہاں کم سہی آوازِ رضا آتی ہے

ایک مسدس نما نظم میں تو واضح اشارہ اس امر کا ملتا ہے کہ رضا محفلِ میلاد میں شریک ہوا کرتے تھے اور سامعین کرام کو اپنی نعتوں سے محظوظ کیا کرتے۔ چنانچہ انھوں نے کہا ہے ؎

سر بزم آج لگی دل کی بجھانا ہے مجھے　　قصۂ جنگِ حق و کذب سنانا ہے مجھے

پردۂ عارضِ محبوب اٹھانا ہے مجھے　　جلوۂ عظمت توحید دِکھانا ہے مجھے

اے خدا جھولی مری نقد وفا سے بھر دے
منہ مرا قابلِ توصیفِ محمدؐ کر دے

"اے امام زندگی" ان کی ایک نعتیہ نظم ہے۔ اس میں آپؐ کے مشن نبوت کی تصریح نہایت جامع انداز میں کی گئی ہے۔ آپؐ کی لائی ہوئی شریعت سے بنی نوع انسانی میں جو انقلاب آیا اس کو رضا نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اس نظم میں اشاروں، کنایوں میں کہی ایک ایک بات تفصیل کی متقاضی ہے۔ مثلاً

عرش سے لائے پیمبرؐ وہ پیام زندگی　　بڑھ گیا جس سے وقار و احترام زندگی

دین کے بھوکے حدیثوں سے مٹائیں اپنی بھوک　　پیاس قرآں سے بجھائیں تشنہ کامِ زندگی

اس طرح گویا شاعر نے دریا کو کورے میں بھرنے کا اہتمام کیا ہے۔

رضا نے اپنی نعتوں میں غنائیہ بحور استعمال کی ہیں۔ بحر رمل اور اس کے زحافات کے حامل اور ان مترنم اور لے و آہنگ میں رواں ہوتے ہیں۔ رضا نے اپنی اکثر نعتوں میں اس بحر کے حص، بتر اور حذف زحافات والے ارکان استعمال کیے ہیں۔ اس کے علاوہ بحر ہزج، مثمن مقبوض اور بحر مجتث مثمن مخبون ابتر میں بھی ان کا نعتیہ کلام پایا جاتا ہے۔ مسدس، مربع اور شاردہ رکنی بحریں ان کے نعتیہ کلام میں نہیں ملتیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ انھوں نے عربی الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ہی اپنی نعتوں میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً "وحی" اور "علماء" اردو میں تو حرکت "ح" اور سکون "ل" کے ساتھ کہے جاتے ہیں جبکہ عربی میں ان کی صحیح قرأت بالترتیب سکونِ "ح" اور حرکت "ل" کے ساتھ ہوتی ہے۔ رضا نے ان الفاظ کے استعمال میں عربی قرأت کا خیال رکھا ہے۔

رضا کے یہاں حروف کے بیجا "دبنے" اور مصرعوں کے بحور سے خارج ہو جانے کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ کہنہ مشق شاعر کے کلام میں ایسی مثالیں گرفت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ مثلاً عروض کا قاعدہ ہے کہ حروف مدہ کے بعد اگر دو ساکن آجائیں تو اوّل ساکن متحرک اور دوم ساقط ہو جاتا ہے۔ جیسے لفظ "زیست" شعر میں باندھا گیا تو اس کا سین متحرک اور "تا" ساقط ہو جائے گا۔ لیکن رضا نے لفظی ترکیب کے تحت "زیست" کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس کے دونوں ساکن حروف متحرک ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے شعر میں قرأت کی خرابی کے علاوہ شعری سقم بھی در آیا ہے۔ ان کی نعت میں مصرعہ کچھ اس طرح ہے ع "زیستِ آزاد کی لذت عطا کی آپؐ نے" یہ نعت بحر رمل مثمن محذوف کے ارکان (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) میں تقطیع کرنے پر "زی۔ س۔ تِ + آزاد" پڑھا جاتا ہے۔ البتہ دیگر مقامات پر "زیبِ رار زیست" اور "راہِ راست" وغیرہ کی تراکیب لفظی عین وزن کے مطابق ہیں۔

مجموعی طور پر رضا کی نعتیہ شاعری کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے دیارِ غیر اور اردو کے لیے غیر دی ررح زمین میں نعت خوانی اور نعت گوئی کے ذریعہ اردو زبان کو سربلند کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کی نعتوں میں "حبِ رسولؐ" کی جلوہ گری ہے اور جامِ نعت سے صہبائے عشقِ نبیؐ چھلک پڑتی ہے۔ ان کی نعتیں "و رفعنا لک ذکرک" کی دلیل ہیں اور حرم و دیر کے رشتے کو مضبوط کرتی ہیں۔

☆☆☆

"Kashana"
At Post Kalgaon,
Dist Yavatmal, M S

اعلیٰ حضرت گپتا رِضاؔ

رؤف خیر

اردو ادب شروع ہی سے غیر مسلموں کا مرہونِ منت رہا ہے۔ ابتداءً ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور ان کے رفقاء کی دلچسپی کی وجہ سے اردو پھلتی پھولتی رہی۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو فروغ پاتی رہی۔ منشی نول کشور کے احسانات سے بھی اردو کبھی انکار نہیں کر سکتی، وہ چاہے شعر و ادب کا معاملہ ہو کہ مذہب کا، منشور نول کشور نے قرآن اور حدیث بھی اسی احترام سے شائع کی جتنی شعر و ادب کی کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ فرمائیں۔ حضرت مالک رام ہوں کہ دتاتریہ کیفی، رتن ناتھ سرشار ہوں کہ فراق گورکھپوری، تلوک چند، پریم چند، گیان چند اور گوپی چند جیسے بیرنگ زمانہ محسنوں کی وجہ سے آج اردو ادب دیگر زبانوں کے ادب سے آنکھ ملانے کے قابل ہو سکا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک اہم نام اعلیٰ حضرت کالی داس گپتا رضا رہے ہیں۔

میں رضا صاحب کو ہمیشہ "اعلیٰ حضرت" ہی کہا کرتا تھا۔ وہ علم و فن کے جس مقام پر متمکن تھے وہاں انھیں یہ القاب زیب دیتے تھے۔ ماہر غالبیات کی حیثیت سے انھوں نے غالب کی زندگی اور فکر و فن کے بے شمار گوشوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ تاریخی ترتیب سے مرتب کردہ دیوانِ غالب کامل (نسخہ گپتا رضا) ان کا ایسا کارنامہ ہے جو انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت غالب کے علاوہ کئی ادیبوں شاعروں کو زندہ رکھنے کے جتن کرتے رہتے تھے۔ رائے سرب سکھ دیوانہ ہوں کہ کھیم رائے زند، جواہر سکھ جوہر ہوں کہ رتن سکھ زخمی، کیول رام ہوشیار ہوں کہ آفتاب رائے رسوا، منسی دھر ہمت ہوں کہ احمد رضا خاں بریلوی، ہر قابل ذکر شاعر کا آپ نے مدلل جائزہ لے کر اس کی اہم تخلیقات کے حوالے سے اسے زندہ رکھا۔ انھوں نے قدیم شعراء کے ساتھ ساتھ جدید دور کے اہم تخلیق کاروں کی کھلے دل سے پذیرائی کی۔ ش ک نظام، عبد اللہ کمال، رزاق افسر، مدیر فتح پوری، ریاض فیضی اور مخمور سعیدی وغیرہ کے فکر و فن کو سراہتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ یہ بھی ان کی اعلیٰ ظرفی ہے ورنہ غالب و اقبال کی قد آوری کا جائزہ لینے والے کی آنکھوں میں جدید شاعر بھلا کیا سما سکتے لیکن اعلیٰ حضرت نے ان نئے فنکاروں کے اندر چھپے ہوئے کمال کی قدر افزائی کر کے اردو کے روشن مستقبل کی ضمانت دی۔

میں نے علامہ اقبال کے فارسی قطعات "لالۂ طور" کا منظوم اردو ترجمہ کیا۔ یہ جب "قنطار" کے نام سے کتابی صورت میں چھپنے والا تھا تو میں نے اعلیٰ حضرت سے پیش لفظ کی گذارش کی۔ آپ نے حرفے چند کے عنوان سے میری کوششوں کو سراہا اور میرا دل بڑھایا۔ اعلیٰ حضرت کا یہ پیش لفظ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مجھے جو آخری خط لکھا تھا اس میں ترجمے کے علاوہ کوئی طبع زاد کارنامہ دکھانے کی ترغیب

دی۔ اس کا خط میں یہاں درج کرنا چاہوں گا

محی رؤف خیر عمر دراز

خط ملا اور حکم نامہ بھی۔ آپ کے تمام قطعات رجسٹری سے واپس بھیج رہا ہوں۔ ایک صفحہ بڑھا بھی دیا ہے۔ جہاں کہیں مناسب ہو بڑھالیں۔

میں ایک عرصے سے محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اس ترجمے پر بڑا ناز ہے۔ اپنے کام پر ناز کرنا قطعی غلط نہیں ہے مگر یہ ترجمہ ہے۔ ترجمہ کبھی آپ کی تصنیف نہیں بن سکتا۔ یہ محض ترجمہ ہی رہے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنا کوئی کام کریں جو قابل رشک ہو۔ قابل رشک کام ہمیشہ نہیں کیا جاسکتا لیکن کبھی کبھار پرماتما ایسا کام مصنف سے کرا دیتا ہے جو قابل رشک ہوتا ہے اور میں آپ جیسے ذہین شخص سے ایسے ہی کام کی امید رکھتا ہوں۔ زندہ باشید۔

مخلص کالی داس گپتا رضا

خط پر تاریخ انگریزی میں یوں درج ہے 2001 / 1 / 25

اعلیٰ حضرت کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ان کی وہ تخلیقات بھی ہیں جو انھوں نے مارش کائنات و خیر خلقہؐ کی تعریف و توصیف میں بہ صد احترام پیش کی ہیں۔ ایک چھوٹا سا نعتیہ انتخاب "احترام" ان کی عقیدت کی دستاویز ہے۔ اعلیٰ حضرت نے کینیا مشرقی افریقہ میں تقریباً پچیس سال گزارے۔ وہاں نے تعصب ماحول میں آپ نے حضور اکرمؐ کی شان میں مختلف اوقات میں نعتیہ کلام کہا اور بیشتر کلام نقل مکانی کے دوران گم بھی ہو گیا۔ بہرکیف جو کچھ دستیاب ہوا وہ سب "احترام" میں شامل کر لیا گیا ہے۔

کس کس کو گناؤں میں برکات محمدؐ کی دن ہی کی سی روشن ہے ہر رات محمدؐ کی
بڑھ کر ہے فضیلت میں، بہتر ہے فضیلت میں ہر کام محمدؐ کا، ہر بات محمدؐ کی

اعلیٰ حضرت کالی داس گپتا رضا کی نعت گوئی کا مقصد خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے

شعر کہتا ہے وہ شہرت کا طلبگار نہیں درم و دام کا، دولت کا طلبگار نہیں
اے نبیؐ آپ کے اکرام و شفاعت کے سوا یہ سخنور کسی نعمت کا طلبگار نہیں

اعلیٰ حضرت کا یہ حسن طلب بہت ممکن ہے کچھ مفاد پرستوں کی خوش گمانی کے مصداق لگے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ نام کے مسلمان جنھوں نے صرف کلمہ پڑھ رکھا ہے، قرآن و سنت سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ فرائض و واجبات کی ادائیگی اُن پر بوجھ ہوتی ہے۔ بلکہ شعائر اسلام کا مذاق اُڑانے سے بھی نہیں شرماتے اور ایسے ہی بے عمل بندے لہرالہرا کر نعت سناتے ہیں۔ نعت کہتے ہیں اور نعت کو ذریعہ ثواب سمجھتے ہیں، حالانکہ بقول اقبال ؂

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

موہن داس کرم چند گاندھی کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ ان کے مطالعہ میں قرآن بھی کبھی ہوتا تھا۔ یہ سب سیکولر ذہنیت کا غماز ہے۔ اعلیٰ حضرت کی نعت گوئی اور دیگر عام شعراء کی نعت گوئی میں میادی طور پر کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ کافی نہیں کہ اعلیٰ حضرت نے جھوٹی عقیدت اور غلو کے دریا نہیں بہائے۔ مبالغہ بھی دراصل جھوٹ کی حسین شکل ہے۔ احمد کو احمد بے میم سمجھنا اور یہ فرمانا ۔

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر　　اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

نص قرآنی کے باوجود ہی کو بشر نہیں سمجھا، اسی کو عام نعت گو اسلام سمجھتا ہے۔ جبکہ اعلیٰ حضرت گپتار رضا کا کلام زیادہ تر سنبھلے ہوئے لہجے کا حامل ہے لیکن کہیں کہیں وہی روایتی اسلوب بھی آگیا ہے۔ اعلیٰ حضرت گپتار رضا نے جشن میلاد کے موقع پر ولادتِ رسول اکرمؐ کا مسدس کے فارم میں نقشہ کھینچا ہے "اے امام زندگی" کے نام سے آپ نے نبی محترمؐ کی جو تعریف کی وہ بھی آپ کو "اعلیٰ حضرت" کہنے کا جواز پیدا کرتی ہے۔

قلب انساں سے نکالا موت کا خوف آپؐ نے　　زندگی کو آپؐ نے بخشا مقام زندگی

اب کہاں نے تابیٔ دل، ظلمت دل اب کہاں　　نور قرآنی سے ہے لبریز جام زندگی

دین کے بھوکے حدیثوں سے مٹائیں اپنی بھوک　　پیاس قرآں سے بجھائیں تشنہ کامِ زندگی

صحیح دین حاصل کرنے کے دو اہم ذرائع قرآن و حدیث سے جڑ جانے کا یہ مشورہ مسلمانوں کو تازیانۂ عبرت ہے۔ آج کتنے مسلماں ہیں جنھوں نے قرآں کو سمجھ کر پڑھ رکھا ہے اور حدیث سے تو مسلماں جیسے ناآشنا محض ہیں۔ دور رکعتی اماموں اور آباء و اجداد کی تقلید کرنے والے مسلمان اسلامی معاملات کی تحقیق کرنے کا جذبہ ہی نہیں رکھتے۔ صحیح حدیث بتا بھی دی جائے تو انھیں اس پر عمل کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ بہر حال اعلیٰ حضرت گپتار رضا صاحب کی نعت زبان و بیان کے ساتھ ساتھ طہارتِ فکر کی غماز ہے۔

نعت کے علاوہ آپ نے روایتی کربلائی واقعات کے زیر اثر کچھ مرثیے بھی کہے جو "شعورِ غم" کے عنوان سے کتابچہ کی شکل میں موجود ہیں۔ ہمارا بیشتر اردو ادب کربلائی علامات سے بھرا پڑا ہے۔ وہ واقعات کہاں تک سچ ہیں یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ اعلیٰ حضرت گپتار رضا نے روایتاً جو کچھ مرثیے کہے ہیں وہ آلِ رسولؐ سے بے لوث عقیدت کے مظہر ہیں۔ ظاہر ہے ایسی تخلیقات کہنے والے کو تحقیقی روش اپنانے کی ضرورت نہیں۔ علامہ محمود عباسی کی "خلافت معاویہ و یزید"، محسن الملک کی "آیاتِ بینات" اور شاہ عبد العزیزؒ کی "تحفۂ اثناء عشری" وغیرہ انھیں پڑھنے کی حاجت نہیں۔ پاکستان میں تو اس سلسلے میں مزید پیش رفت ہوئی ہے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر، علامہ حق نواز جھنگوی اور شاہ بلیغ الدین کی تحریر و تقریر ایک اور ہی صورتحال کی نشاندہی کرتی ہے۔ ماہر غالبیات اعلیٰ حضرت گپتار رضا سے یہ توقع کرنا کہ اسلامی تاریخ کی تحقیق میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے، زیادتی ہے جبکہ خود سنی مسلماں بھی سنی سنائی روایتوں کی تحقیق فضول سمجھتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت گپتار رضا نے کربلا کے واقعات کے ساتھ ساتھ سبطِ رسول حضرت حسینؓ سے اپنی عقیدت کا جو اظہار فرمایا ہے وہ بھی انھیں اعلیٰ

حضرت کہنے پر اکساتا ہے۔

ان کی غیر جانداری اور بے لوث عقیدت و محبت بھی مجھے ان کا گرویدہ بنا گئی۔ انھوں نے ایک رباعی میں کیا خوب فرمایا ہے ۔

بے کار کی باتوں سے اُبھارا ہم کو عیسیٰ بھی محمدؐ بھی ہے پیارا ہم کو
تقسیم مذاہب سے نہیں کچھ جھگڑا انساں کی تقسیم نے مارا ہم کو

"شعورِ غم" نامی کتابچہ آل رسول پر ہونے والے کربلائی واقعات کے اظہار پر مبنی ہے۔ مگر ابتدائیہ میں چند شعر جو دیے گئے ہیں ان میں کا ایک شعر بڑا فکر انگیز ہے ۔

اے دہرِ کائنات ، تغافل اور اس قدر صدیاں گزر گئی ہیں نہ آیا "شعورِ غم"

بہر حال تحقیق، تنقید، نعت و منقبت وغیرہ وغیرہ ہر میدان میں آنجہانی نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ انھیں اعلیٰ حضرت کہنا ہر لحاظ سے حق لگتا ہے۔ ان کا وصال اردو ادب کا بہت بڑا داغ ہجر ہے جو ہر صاحبِ ذوق کے دل سے مشکل سے مٹے گا۔ کم سے کم میرے دل سے تو یہ داغ نہ جائے گا کہ اس سانحے کو میں اپنا شخصی نقصان سمجھتا ہوں۔

☆☆☆

H No 9 - 10 - 202 / 19
Rasal Bazar Golkunda Fort
Hyderabad - 500 008

شعورِ غمِ حسینؓ اور کالی داس گپتا رضاؔ

نذیر فتح پوری

ہر آنکھ ہے نم، کیا ہے —— جس پہ سبھی روئے —— سوچو تو وہ غم، کیا ہے

ماہر غالبیات، معتبر محقق اور مستند شاعر محترم کالی داس گپتا رضاؔ کا نام اب ادب کے میدان میں اعتبار کی مرحلوں سے بھی آگے بڑھ چکا ہے۔ اب تک ان کی ساٹھ سے زائد کتابیں شائع ہو کر ارباب نقد و نظر سے داد و تحسین وصول کر چکی ہیں۔ "دیوانِ غالب تاریخی ترتیب سے" کی تدوین نے تو رضا صاحب کی ژرف نگاہی کے ایسے باب وا کر دکھائے ہیں جس کی مثال ادب میں اب تک مفقود تھی۔

تخلیقی میدان میں بھی جہاں وہ پرانی قدروں کی پاسداری کو ملحوظ رکھتے ہیں وہاں نئے اسلوب اور نئی حسیات سے بھی روگردانی نہیں کرتے، اس کی بہتر مثال ان کی غزلوں کا انتخاب "غزل گلاب" ہے، مگر ہم یہاں رضاؔ صاحب کی ایک ایسی صنف سخن کا ذکر کریں گے جسے شاعروں کی ایک پوری نسل نے نظر انداز ہی نہیں کیا بلکہ اسے فراموش کرنے کی ایک مجرمانہ کوشش کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ سلام، مرثیہ اور نوحہ کی صنف ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور ان کے افرادِ خانہ پر توڑے گئے بیجا اور معصومانہ مظالم سے دلگیر اور دلبرداشتہ ہو کر بلا امتیاز شیعہ و سنّی ہر شاعر اپنے اپنے طریقے سے، اپنے دل کا درد بیاں کرنے کی کوشش کرتا تھا، شہادتِ امام حسین نے نہ صرف مسلمانوں ہی کو متاثر کیا ہے بلکہ پوری دنیا اس عظیم سانحہ سے متاثر ہوئی ہے۔ ہندوستان چونکہ گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ ہے اس لیے یہاں کے فنکاروں نے اپنے مذہبی نظریات کو مقدم رکھتے ہوئے دوسرے کے مذاہب کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔

اردو کے ایسے سینکڑوں شاعر ہماری ادبی تاریخ کے صفحات میں زندہ ہیں جو ہندو دھرم سے تعلق رکھتے ہیں مگر انھوں نے بانی اسلام حضرت محمد ﷺ کی مدح سرائی میں ایسے ایسے اشعار سپردِ قلم کیے ہیں کہ مسلم شاعروں کو بھی یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ یہی بات واقعاتِ کربلا کے تعلق سے کہی جاسکتی ہے۔ کئی ہندو شاعروں نے سلام، مرثیہ، نوحہ اور منقبت حضرت علی، پوری عقیدت و احترام کے ساتھ سپرد قلم کیے ہیں جنہیں دیکھ کر رشک ہوتا ہے۔

کالی داس گپتا رضاؔ چونکہ اردو کے فنکار ہیں اور اُس تہذیب کے نمائندہ ہیں جس تہذیب نے اس دیش کی مٹی میں محبت کے بیج بوئے تھے اور ایک ایسی گنگا جمنی روایت کی داغ بیل ڈالی تھی جس کی اساس پر آج بھی یہ وِشال ملک ایستادہ ہے۔ اس لیے انھوں نے ایک عرصہ ہوا "اُجالے" عنواں سے اپنی اسلامی نظموں کا مجموعہ پیش کیا تھا۔ اسی سے انتخاب کر کے اور کچھ نیا کلام اضافہ کر کے جناب اعجاز سیمابی نے "شعورِ غم" کے نام سے

ایک اور مختصر کتاب مرتب کی ہے۔ عرض مرتب کے باب میں اعجاز سیمابی لکھتے ہیں

"بیشتر کلام پر یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ کسی شیعہ شاعر کا کہا ہوا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔"

کتاب سے متعلق اپنی ناقص رائے قلمبند کرنے سے قبل میں یہ کہوں گا کہ اعجاز سیمابی کی یہ بات جملہ معترضہ سمجھی جائے گی کیونکہ شاعر جب تخلیقیت کے کرب سے گزرتا ہے تب وہ کسی فرقے یا مذہب کا پیروکار نہیں ہوتا۔ وہ محض شاعر ہوتا ہے اور پورے خلوصِ دل کے ساتھ اپنے افکار و محسوسات کو الفاظ کا لباس پہنا کر سپردِ قلم کرتا ہے۔ "شعورِ غم" کے مشمولات سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا خالق نہ ہندو ہے نہ مسلماں، نہ شیعہ ہے نہ سنی، بلکہ حقیقی معنوں میں ایک شاعر ہے، شاعر جس کے پاس گداختہ دل ہے اور یہی گداختگی اسے دوسروں کے غم کا احساس دلا کر "غم حسین" کو قلمبند کرنے کا شعور عطا کرتی ہے۔

یہ کتاب ۲۱ر نومبر ۱۹۷۹ء مطابق یکم محرم الحرام ۱۴۰۰ھ میں شائع ہوئی تھی۔ چالیس صفحات کی اس مختصر سی کتاب میں سلام ہے، نوحہ ہے، رباعیات ہیں، قطعات ہیں اور منقبت بھی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ اس کتاب کے مرتب اعجاز سیمابی ہیں، لکھتے ہیں

"موصوف نے (رضا صاحب نے) اپنی نجی صحبتوں میں کئی بار مجھے بتایا
کہ اُن کا ذہنی رجحان حسینیت کے معیارِ حق و صداقت کی آفاقیت پر ہے۔ آپ کسی
فروعی غلو کے قائل نہیں لیکن تاریخ کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے
حسین (علیہ السلام) کی شخصیت سے بیحد متاثر ہیں۔ آپ کی نظر میں حسینؑ آج
بھی صبر و رضا کے ایک ایسے مقام پر فائز ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔"

جہاں تک رضا صاحب کی اہل بیت سے محبت کا سوال ہے اس بات کا سب سے بڑا ثبوت تو رضا صاحب کا تخلص ہی قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اہل بیت کے لیے "صبر و رضا" لازم و ملزوم استعارے ہیں اور انہی میں سے ایک کو رضا صاحب نے اپنے نام کا جزو بنالیا ہے۔ یہ تخلص کالی داس گپتا کے نام کے ساتھ ایسا چسپاں ہوا ہے جس کا جواب نہیں۔ یعنی "کالی داس گپتا رضا"

ذکر امام حسینؑ رضا صاحب کو مرغوب ہے وہ تمنا کرتے ہیں کہ

اپنی قسمت سے شب و روز تمنا ہے مجھے ذکر شبیر ادب میں مرا رہبر ہوجائے

یہ شعر پڑھ کر میر انیس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو طبعاً غزل کی طرف مائل تھے بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری، تغزل میر انیس کی طبع شاعرانہ کا جزو اعظم تھا مگر جب وہ حب رسولؐ سے ذکر شبیر پر آمادہ ہوئے تو اسی کو اپنا رہبر و رہنما بنالیا اور غزل کو ترک کر کے سلام اور مرثیے کی تخلیق کے لیے قرطاس و قلم کو وقف کر دیا۔ تاہم رضا صاحب نے ان اصناف کو ضمنی حیثیت ہی دی ہے کہ اُن کے تخلیقی سفر کی سمتیں الگ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ محبت حسین نے بھی ان سے جس قدر تخلیقی کام لینا چاہا لیا۔

شہادتِ امام حسینؓ کی تعریف و توصیف رضاؔ صاحب یوں بیان کرتے ہیں ۔

ہے فلک سے بھی فزوں اوجِ شہادت اے حسین — ماہ و انجم پا سکیں کیا تیری رفعت اے حسین

اس احترام اور پاسِ خاطر کے قرباں جائیے ۔

تیری عزت، تیری عظمت سے اجازت مانگ کر — کہہ رہا ہوں قصۂ حق و صداقت اے حسین

عظمتِ حسینؓ، توقیرِ حسینؓ اور بلندیٔ کردارِ حسینؓ کی ایک مثال یہ بھی دیکھئے

تجھ کو بننا تھا مثال آئندہ نسلوں کے لیے — کیسی دولت، کیسی ثروت کیسی عزت اے حسینؓ

سبحان اللہ! واقعی حضرت امام عالی مقام نے اپنے خانداں کی قربانی اسی لیے دی تھی کہ آئندہ نسلوں کے لیے ایک مثال بن جائے، مگر آج مسلمانوں کی حالت بالکل مختلف ہے۔ مسلماں دولت کے لیے لڑ رہا ہے حکومت کے لیے لڑ رہا ہے۔ جاہ و حشمت اور مال و ثروت کے لیے لڑ رہا ہے۔ ہم لوگوں نے شہادتِ امام حسینؓ کے مقصد کا مطلب ہی بدل دیا ہے۔ بات رضاؔ صاحب کی محبت حسینؓ سے متعلق ہو رہی ہے۔ لٰہذا مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ صحیح معنوں میں رضاؔ صاحب حسینیت کے معیارِ حق و صداقت کے معترف ہیں

تو نے اپنے خوں سے سو رنگ اس میں بھر دیے — پھیکی جب ہونے لگی شانِ حقیقت اے حسین

جو دلِ اسلام کو رکھتی ہے اب تک بے قرار — ہے ترے اک قطرۂ خوں کی حرارت اے حسین

یہ عظیم الشان قربانی کا تیری ہے کمال — بڑھ گیا اسلام میں رنگِ شجاعت اے حسین

اس کتاب میں ایک نوحہ بھی ہے جو "دریا کے کنارے" عنواں سے لکھا گیا ہے۔ پہلے بند میں جنگ کی منظر کشی ملاحظہ فرمائیں ۔

کچھ جمع ستمگار ہیں دریا کے کنارے — کچھ حق کے نگہدار ہیں دریا کے کنارے

کچھ سر کے خریدار ہیں دریا کے کنارے — کچھ مرنے پہ تیار ہیں دریا کے کنارے

کس جنگ کے آثار ہیں دریا کے کنارے

چھ بندوں پر مشتمل یہ نوحہ جنگ کے ابتدائی مناظر سے شروع ہو کر بہتر نفوس کی شہادت کے خوں آشام منظر کے ساتھ اختتام کو پہنچتا ہے۔ رضاؔ صاحب نے ایک طویل داستاں کو محض تیس مصرعوں میں بیان کر کے اپنی اختصار پسندی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ نوحہ کسی زاویے سے بھی تشنہ یا ادھورا معلوم نہیں ہوتا۔ ایک مکمل اور جامع نظم، واقعی سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ایک بند پیش ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت بیانی اور تصویر کشی کے معاملے میں رضا صاحب کتنی مہارت رکھتے ہیں ۔

منہ سوکھ گیا ہے جو حسین ابن علی کا — افسوس ہے پانی کو بھی ، اس تشنہ لبی کا

اس وقت برا حال ہے خشکی کا تری کا — انجام جو ہے پیشِ نظر آلِ نبیؐ کا

سب نقش بہ دیوار ہیں دریا کے کنارے

رضا صاحب کو حضرت علیؑ سے بھی گہری عقیدت ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے ایک منقبت کے توسط سے کیا ہے۔ علی کے اسم گرامی پر جاں دینے والوں کی کمی نہیں۔ ایسے ہی فدایانِ علی کی شان میں منقبت کا مطلع دیکھیے۔

جب علی کے دیوانے راہ سے گزرتے ہیں کانٹے پاؤں پڑتے ہیں پھول نار کرتے ہیں

منقبت کا یہ انداز اپنے آپ میں منفرد اور ناقابل تقلید ہے۔ یہ شعر دیکھیے

ہم کہاں سناتے ہیں داستاں حیدرؓ کی زندگی کے خاکے میں رنگ صدق بھرتے ہیں

حضرتِ فاطمہ ست رسولؐ کی شان میں بھی رضا صاحب نے ایک نظم "سیّدۂ دو عالم" کے عنوان سے سپردِ قلم کی ہے۔ نظم کی ابتدا نہایت ہی منفرد انداز سے ہوئی ہے۔ شاعر خود اپنے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

تجھ کو کمالِ شعر و ادب کا ہے واسطا
ملنے لگا ہے تجھ کو ترے علم کا صلہ
خاتونِ جنتی کے لیے کچھ تو کہہ رضا

والد رسولؐ جس کے ہوں شوہر ہوں مرتضیٰ
کیوں کر اسے نہ کہیے دو عالم کی سیّدہ

رضا صاحب کی اس کتاب پر ایک طویل مقالہ لکھا جاسکتا ہے تاہم اختصار سے کام لیتے ہوئے اتنا ہی عرض کروں گا کہ رضا صاحب کی ہستی بھی غالب کی طرح پہلودار ہے۔ جیسے جیسے ان کے ایوان ہائے ادب سے پردے اُٹھتے جائیں گے نئے نئے انکشافات ہوتے جائیں گے۔ (یہ مضمون رضا صاحب کی زندگی میں لکھا گیا تھا)

☆☆☆

Saira Manzil, 230 - B - 102, Viman Darshan, Sanjay Park, Lohgaon Road, Pune 32

دبستانِ جوشؔ میں نعت

خط بنام نذیرؔ فتح پوری
Mumbai, 21/12/1998

عزیزی! آج سے روزے شروع ہوگئے۔ چند روز پہلے نعتیہ مشاعرے کے لیے یہ کلام میں نے کہا تھا۔ سوچا کہ اس مبارک مہینے کے پہلے ہی روز اسے آپ کے مطالعے کے لیے بھی بھیج دوں۔ کالی داس گپتا رضاؔ

میرے استاد کہ پنڈت تھے
سحور تھے یہ شاگردِ داغؔ
نام جوشؔ اُن کا،
ستائش میں جمالِ شہہِ بطحا کی
کہتے ہیں یہ۔ تضمینِ کلامِ قدسی

"رشکِ خوباں عرب، ہیچ حسینانِ عجم
ماہِ تاباں سے تو بڑھ کر ہیں حسیں تیرے قدم
کیسے حسنِ رُخ و رُخسار کروں ربِ رقم
من بے دل بہ جمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بو العجمی
اے شہِ مکی و مدنی و رسولِ عربی"

میرے استاذ کے فرزند کہ عرشؔ ان کا نشاں
وہ بھی کچھ کم نہ تھے والد سے کہ نعتیں اُن کی
اہلِ باطن کی نگاہوں میں معظم ٹھہریں
دوسرے ورن میں دو شعر سماعت کیجیے

"سزاوارِ فیضِ درِ مصطفیٰ ہے
سوالی کا وسعِ سوال اللہ اللہ
اُتر آئے خود عرش و کرسی سے جلوے
نبوت کا اوجِ جمال اللہ اللہ"

ایک اور اونچے سحور تھے حکن ناتھ کمال
میرے استاد کے شاگرد مگر حود استاد
نعت حب کہتے تھے، خار و خس و خاشاک تلک
جیسے جی اُٹھتے تھے، پھولوں میں بدل جاتے تھے
آمدِ شاہِ رُسُل کا ہے بیاں اور ہیے
کہ یہ اک شاعرِ ہندو کے ہیں اشعارِ بلیغ
بحر گو بدلی ہوئی ہے یہ مدھر ہے اتنی
جیسے حست کی کوئی سہرواں ہاں ہیے

"دنیا پہ جب وہ ساعتِ اکرام آگئی اپنی جگہ پہ گردشِ ایام آگئی
دن ڈھلتے ڈھلتے دھوپ لب بام آگئی تفسیرِ وَالضُّحیٰ کے لیے شام آگئی
اس حھٹ پٹے میں آنکھ ستاروں کی کھل گئی آئی جو چاندنی تو اندھیرے میں گھل گئی
فطرت تمام اوس کے پانی میں دُھل گئی کل کائنات رت جگا کرنے پہ تل گئی
قدرت نے احترام یہ اُس رات کا کیا سُرمہ بنا کے دیدۂ دل میں لگا لیا"

میں کہ ادنیٰ سا ہوں شاگرد، مری ہستی کیا
اپنے استاد کے پیروں پہ جمی دھول ہوں میں
میں فقط اتنی دعا مانگتا ہوں مولا سے
سہ مرا قابلِ توصیفِ پیمبرؐ ہو جائے
میں نے گلیاں تو مدینے کی نہیں دیکھی ہیں
چاپ تو پائے پیمبر کی سی ہے میں نے
عالم خواب میں یہ حکم ہوا تھا مجھ کو
کہ لکھو نعت مگر طرزِ غزل کی رکھنا
پیش کرتا ہوں غزل آپ کی خدمت میں وہی

نعتیہ غزلیں

بزمِ احمدؐ کو چھوکر بھی ضیاء آتی ہے شب دیجور میں سو شمعیں جلا آتی ہے
نہ نماز آتی ہے مجھ کو نہ دعا آتی ہے مرے ہونٹوں سے مگر حق کی صدا آتی ہے

بزمِ میلاد کا یہ کم تو نہیں ہے اعجاز | کہ یہاں کم سہی آوازِ رضا آتی ہے
زخمِ دل کھولے ہی رکھنا کہ اسی کھڑکی سے | دشتِ یثرب کی وہ مستانی ہَوا آتی ہے
کیسے میلاد پہ برسیں نہ خوشی کے آنسو | یہ دن آتا ہے تو رحمت کی گھٹا آتی ہے
آپؐ کا آنا تھا اس شمع کا جلنا، جس سے | روشنی نیر تاباں سے سوا آتی ہے
ہم کو جنت کی رُتوں کی نہیں پروا کہ ادھر | ابر مکے سے، مدینے سے صبا آتی ہے

کیوں رضا بزم میں آئے، اسے کیا آتا ہے
نعت کہہ آتی ہے شاید، وہ بھی کیا آتی ہے

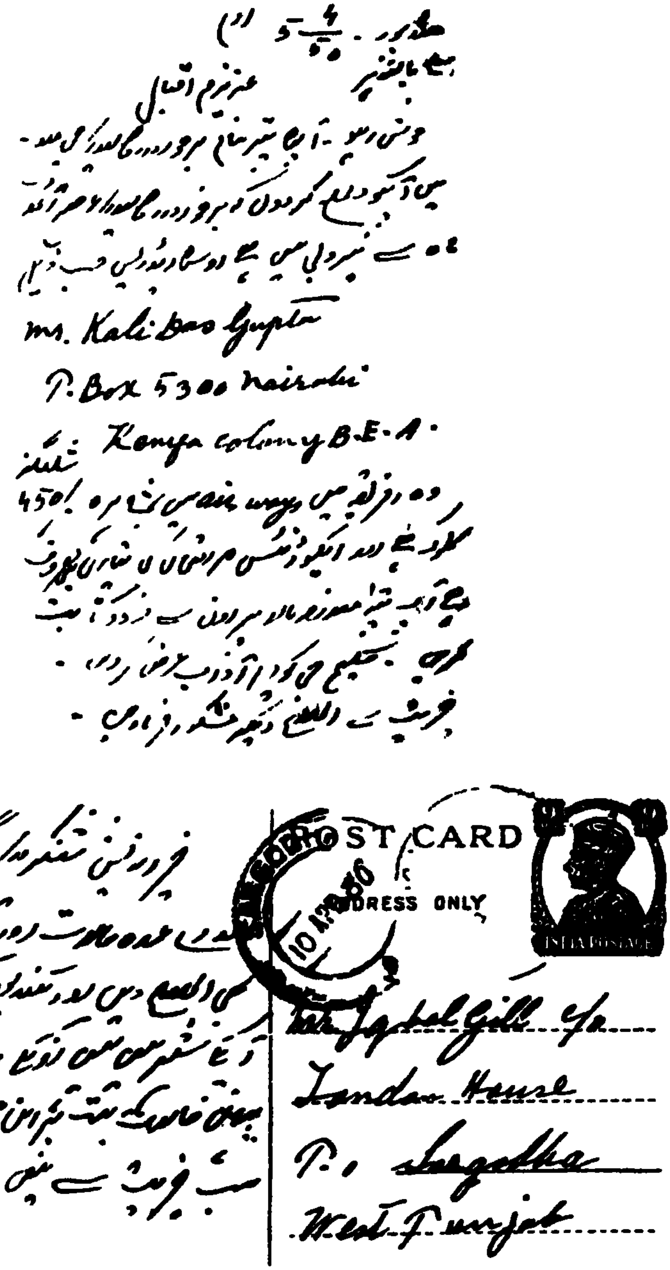
(۲)

ساکھ میخانۂ احمدؐ کی ہے کتنی اچھی | جام اچھے ہیں، خم اچھے ہیں، صراحی اچھی
ناخدا جس پہ فدا ہے وہ محمدؐ کا ہے نام | جس پہ دیندار چڑھا ہے وہی کشتی اچھی
جام و مینا سے نہیں ہم کو سروکار مگر | آپؐ کے نام پہ آجائے تو مستی اچھی
اسوۂ شاہِ رسل کا جو ہوا دیوانہ | اس نے بنیاد طریقت کی اٹھائی اچھی
دین اسلام ہوا اور محمدؐ ہادی | وحی یہ اُتری کہ دونوں میں نبھے گی اچھی
واسطے آپ کے جھیلو تو۔ستم بھی اچھا | عشق میں آپ کے آئے تو بلا بھی اچھی
کوئی مسلک ہی نہیں سیرت حضرت کے سِوا | نیک، مقبول، خوش اسلوب، انوکھی، اچھی
کہہ گئے راہِ محمدؐ سے گزرنے والے | آپؐ ہوں جس کی طرف باٹ اسی کی اچھی

نعت کے بدلے رضا آج سنائی جو غزل
واقعی یہ تمھیں میلاد میں سوجھی اچھی

☆☆☆

(رضا صاحب کے والد محترم شنکر لال گپتا کا خط اقبال گل (اقبال ملکہ پوری) کے نام تاریخ ۱۵ر اپریل ۱۹۵۰ء)



یادیں ...... باتیں ...... ملاقاتیں

کالی داس گپتا رضاؔ
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

قاضی مشتاق احمد

اپنی موت سے کوئی بشر آگاہ نہیں ہوتا لیکن شاید وہ موت کے خاموش قدموں کی آہٹ سن لیتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو کالی داس گپتا رضاؔ اپنی موت سے صرف دو مہینے پہلے یہ کیوں کہتے کہ "اب وہ پونہ کے کسی ادبی پروگرام میں نہیں آئیں گے"۔ بلکہ یہ پیش گوئی انھوں نے "دیوانِ غالبؔ کامل تاریخی ترتیب سے نسخہ رضا" کے تیسرے ایڈیشن کے مقدمے میں بھی کردی تھی کہ "میں آج (۲۵ر اگست ۱۹۹۴ء) سے اپنی عمر کے سترویں سال میں داخل ہورہا ہوں۔ اس لیے احتیاطاً یہ تو نہیں کہتا کہ میں غالبؔ پر مزید کام ہی نہیں کروں گا مگر تن تنہا کوئی موثر اور ضخیم کام شاید اب مجھ سے نہ بن پڑے، اس لیے رخصت!"

اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے رضاؔ صاحب میری کتاب "خوشبو جیسے لوگ" کی رسم اجراء ادا کرنے پونہ تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر سردار جعفری کی یاد میں ایک سیمینار بھی پونہ میں ہوا تھا اس میں بھی وہ شریک تھے۔ سیمینار کے ختم ہونے پر میں اور نذیرؔ فتح پوری ان کے ساتھ کورے گاؤں پارک میں ان کے فلیٹ پر گئے۔ ہمیشہ کی طرح وہ بڑے خوشگوار موڑ میں تھے۔ ساوتری بھابھی بھی ساتھ تھیں۔ ساوتری بھابھی نے کہیں لکھا ہے کہ "گپتا جی نے مجھ سے اور میرے بچوں سے بھی زیادہ انڈیا اور اردو سے پیار کیا ہے"۔ اس وقت بھی گپتا جی ساوتری بھابھی کی موجودگی سے بے خبر انڈیا اور اردو کی باتیں کررہے تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے پڑوسی ملک کی سرکاری زبان اردو ہے لیکن وہاں بھی درخواستیں اردو زباں میں نہیں لکھی جاتی ہیں جبکہ انڈیا میں ایسا ہوتا ہے۔ یہ بات انھوں نے سیمینار میں بھی کہی تھی۔ میں نے انھیں ساوتری بھابھی کے ساتھ میرے یہاں آنے کی دعوت دے دی اور ان سے کہا کہ میں خود انھیں لینے آؤں گا۔ انھوں نے دعوت قبول کرلی۔ دوسرے دن وہ دونوں میرے یہاں آئے۔ ہمارے ساتھ وہ دو تین گھنٹے تھے۔ اردو اور انڈیا کی باتیں پھر شروع ہوگئیں۔ ساوتری بھابھی میری بیگم اور چھوٹی بہو سے بات چیت کرنے لگیں اور ہم دونوں دیگر باتوں میں کم اور اردو میں زیادہ کھو گئے۔ وقت کا احساس اس وقت ہوا جب ساوتری بھابھی نے انھیں یاد دلایا کہ شام میں انھیں کہیں اور جانا ہے۔ میں نے رضا صاحب سے وعدہ کیا کہ اگلی بار جب میں بمبئی آؤں گا ان کے یہاں ضرور آؤں گا۔ اتفاق سے اس ملاقات کے فوراً بعد مجھے بمبئی آنا پڑا۔ گپتا صاحب سے فون پر بات ہوئی، انھوں نے مجھے اپنا وعدہ یاد دلایا۔ میں نے دوبارہ وعدہ کیا لیکن اسی رات مجھے ایک ضروری کام سے اپنے وطن حلگاؤں

جانا پڑا۔ وہاں سے میں پونہ آگیا اور گپتا صاحب سے ملاقات کا وعدہ پورا نہ ہو سکا۔ اس کے بعد نذیر صاحب بمبئی گئے تو گپتا صاحب نے شکایت بھی کی کہ میں ان کے یہاں نہیں گیا۔ میں نے فون پر معذرت طلب کی اور اپنی مجبوری بتائی۔ وہ بمبئی سے باہر جانے والے تھے اس لیے طے ہوا کہ وہ دلّی سے آجائیں تو میں ان سے ملنے بمبئی جاؤں۔ میں بمبئی گیا لیکن اب بمبئی میں رضا صاحب نہیں تھے بلکہ وہ "فلک تک پرواز" کا دعویٰ صحیح ثابت کر کے مالکِ حقیقی سے جا ملے تھے ۔

کہکشاں چاند ستارے ہیں میرے نقشِ قدم — کون کہتا ہے فلک تک میری پرواز نہیں

گپتا صاحب سے میرا غائبانہ تعارف ۱۹۶۱ء میں ہوا جب میں ادارہ صبح امید بمبئی سے وابستہ تھا۔ ایک کے بعد ایک ادبی نوعیت کے خاص نمبر نکل رہے تھے۔ اس میں ایک افریقہ نمبر بھی تھا۔ "صبح امید" کے مالک و مدیر عبد الحمید نوہیرے صاحب سے گپتا صاحب کے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ اکثر گپتا صاحب کا ذکر کرتے تھے۔ گپتا صاحب کا پہلا شعری مجموعہ "شعلۂ خاموش" بھی ادارہ صبح امید کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ کے ذریعہ گپتا صاحب کی شاعری سے میری پہچان ہوئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ "شعلۂ خاموش" محض ایک شعلہ نہیں بلکہ کوہِ آتش فشاں ہے۔ خاموشی دراصل آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس طرح "شعلۂ خاموش" نہایت خاموشی کے ساتھ افقِ صبح امید پر نمودار ہوا اور اس کی روشنی سے کالی داس گپتا رضاؔ کا نام روشن ہو گیا۔ "اُفق" کے لغوی معنی ہے "وہ جگہ جہاں زمیں و آسماں ملے ہوئے دِکھائی دیتے ہیں"۔ گپتا صاحب کی شخصیت بھی شاعری اور تحقیق کا سنگم تھی۔ حالانکہ ان کا فطری میلان شاعری کی طرف تھا لیکن وہ تحقیق کی طرف زیادہ مائل تھے۔ وہ مضامین نو کے انبار لگاتے رہے لیکن غالبیات کے باب میں ان کا تحقیقی کام زیادہ ہے۔ موصوف کے تحقیقی کاموں میں غالبیات میں ۱۷ر کتابیں۔ مختلف موضوعات پر ۲۵ر کتابیں، ۱۴ر شعری مجموعے۔ محقق کی حیثیت سے سب سے بڑا کارنامہ "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے، نسخۂ رضا"۔ جب تک اردو اور غالب کا نام باقی ہے کالی داس گپتا رضاؔ کا نام اس کارنامہ کی بنا پر باقی رہے گا۔ گپتا صاحب جتنے اچھے محقق تھے اتنے ہی اچھے شاعر بھی تھے لیکن تحقیقی کتابوں کے انبار کے سامنے ان کی شاعری جو سمندر سی گہری تھی "جھونکوں کی گنگناہٹ" بن کر رہ گئی۔

کوئی بھی فصل ہو شامل رہا ہی کرتی تھی — چمن کے شور میں نازک سی ایک آہٹ بھی
اسیر بربط و مضراب ، گوش بر آواز — مقام رکھتی ہے جھونکوں کی گنگناہٹ بھی

برسوں کے غائبانہ تعارف کے باوجود بمبئی میں گپتا صاحب سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ پہلی بالمشافہ ملاقات پونہ میں حکیم رازی کے مطب میں ہوئی۔ اس ملاقات کا ذکر میں اپنی کتاب "خوشبو جیسے لوگ" میں کر چکا ہوں۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کے پاس علم و ادب کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ (کہتے ہیں دنیا میں غالبیات کا سب سے بڑا ذخیرہ کالی داس گپتا رضاؔ کے ذاتی کتب خانے میں ہے) وہ شاعری کے علاوہ

بھی ہر ادبی موضوع پر گفتگو کر سکتے تھے۔ ان سے میری ملاقاتیں پونہ کی ادبی محفلوں میں ہی ہوتی تھیں۔ جب ملتے بڑے پیار سے ملتے۔ ڈھیر ساری باتیں کرتے اور یہ ضرور پوچھتے کہ آج کل میں کیا لکھ رہا ہوں۔ اگر مجھ سے ملاقات نہ ہوتی تو نذیر صاحب سے پوچھتے۔ ایک بار نذیر صاحب کے ذریعہ کہلوایا کہ ان کے یہاں آؤں، ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں۔ میں پہلی بار پونہ میں ان کے فلیٹ میں گیا۔ وہ بولتے گئے میں سنتا گیا۔ پتہ چلا کہ ان کے سینے میں کئی راز چھپے ہیں۔ وہ اگر سستی شہرت کے طالب ہوتے تو شاید کئی سنسنی خیز دھماکے تحقیق کے نام پر کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ہندی کے ایک ادیب نے تحریری طور پر انھیں یہ ثبوت دیا تھا کہ اردو کی ایک عالمی شہرت یافتہ ہستی نے ایک کتاب میں جو ترجمہ ہندی میں شائع کیا ہے وہ بھی اپنے نام سے، وہ دراصل اس ہندی ادیب کا کام ہے۔ کتاب میں اس بات کا کہیں ذکر تک نہیں۔ اگر یہ راز افشاء ہو جاتا تو اس عالمی شہرت یافتہ ہستی کی عزت خاک میں مل جاتی لیکن گپتا صاحب نے ایسا ہونے نہیں دیا بلکہ اس ہندی ادیب کو سمجھا بجھا کر خاموش کر دیا۔ اس ایک واقعہ سے ان کی شرافت اور منکسر المزاجی ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرا ایک واقعہ یہ ہے کہ جب مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا ایوارڈ لینے گپتا صاحب ناگپور آئے تو ایک "بندۂ کمینہ" نے انھیں یہ کہہ کر بھڑکانے کی کوشش کی کہ اکیڈمی کے تمام ممبران انھیں ایوارڈ دینے کے خلاف تھے اور یہ ایوارڈ انھیں محض اس شخص کی وجہ سے ملا۔ حقیقت یہ تھی کہ گپتا صاحب کا نام میں نے بحیثیت اکیڈمی ممبر تجویز کیا تھا اور تمام ممبران نے اس کی حمایت کی تھی۔ جبکہ بڑے بڑے دعوے کرنے والا وہ شخص اپنی جہالت کی بنا پر گپتا صاحب کو "کالی چند" اور مجروح سلطان پوری کو "سلطان مجروح پوری" کہتا تھا۔ اکیڈمی کی ایک میٹنگ میں اس نے دعویٰ کیا کہ وہ ابھی ابھی عصمت چغتائی سے مل کر آیا ہے۔ جبکہ ان کی وفات کو پانچ سال گذر چکے تھے (بعد میں پتہ چلا کہ وہ عصمت جاوید صاحب سے ملا تھا)۔ گپتا صاحب صورتحال سے واقف تھے لیکن محض اردو کی محبت میں ایوارڈ لینے آگئے۔ اس شخص نے گپتا صاحب سے ہوائی جہاز کا کرایہ ملنے کی رسید بھی حاصل کر لی اور رقم اکیڈمی سے وصول کر کے اپنی جیب میں ڈال لی۔ مجھے تعجب ہوا کہ گپتا صاحب جیسا جہاندیدہ آدمی اس شخص کے جال میں کیسے پھنس گیا۔ ایئرپورٹ پر گپتا صاحب اور ساوتری بھابھی سے ملاقات ہوئی۔ میں بھی اسی فلائیٹ سے واپس بمبئی آرہا تھا۔ (ناگپور میں سرکاری دورہ پر گیا تھا۔ وہاں محکمہ سماجی بہبود نے اپنے موبائیل تھیٹر کا ۱۰۰واں شو ممبران اسمبلی کے لیے منعقد کیا تھا۔ ایوارڈ فنکشن کے دوران موبائیل تھیٹر کے چند آئیٹم بھی دکھائے گئے) جب میں نے رسید والی بات گپتا صاحب سے پوچھی تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے اور صرف اتنا کہا "اس نے وہ رقم بعد میں لوٹانے کے لیے کہا ہے"۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ اب اس رقم کے ملنے کی کوئی امید نہیں۔ ایک سال بعد گپتا صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا "وہ رقم واپس ملی"۔ جواب دیا "نہیں" اور خاموش رہ گئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ گپتا صاحب کوئی بھولے بھالے آدمی تھے کہ کوئی بھی آئے اور انھیں بمبئی کی زبان میں "ٹوپی" پہنا دے۔ جب ایسا کوئی معاملہ آجاتا تو وہ صاف کہہ دیتے "بھئی اچھے

سے ہم ساہوکار ہیں" لیکن انھوں نے اپنے پہلی کیشر کا نام "ساکار پہلی کیشر" رکھا جس کا مطلب ہے تخلیق کار۔ اس ادارے سے تیس درجن سے زائد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ کتابوں سے جو کمائی ہوتی وہ سود سمیت تحقیقی کاموں پر خرچ ہو جاتی۔ اس کے علاوہ سماجی کاموں پر بھی بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ متعدد غریب لڑکیوں کی شادیاں، بے روزگاروں کو برسر روزگار لگانا، تیرتھ یاترا کے علاوہ فریضہ حج ادا کرنے کے خواہش مندوں کے مصارف ادا کرنے جیسے نیک کام بھی انجام دیے۔ ایک مرحوم مسلمان ادیب کی بیوہ کو تاحیات وہ مدد دیتے رہے لیکن اس انداز میں کہ ایک ہاتھ دے تو دوسرے کو پتہ نہ چلے۔

گپتا صاحب نے لندن چیمبر آف کامرس سے اکاؤنٹس کا امتحان پاس کیا تھا۔ حساب میں وہ ماہر تھے۔ ایک بار انھوں نے میری ایک کتاب دیکھ کر مجھے پورا حساب بتادیا کہ اس کتاب سے پہلی شرنے ایک لاکھ روپئے کمائے ہوں گے۔ اپنی کتابیں مفت تقسیم کرنے کے وہ قائل نہیں تھے لیکن احباب کو اپنی قیمتی کتابیں تحفتاً ضرور دیتے تھے۔ دیوانِ غالب کا نسخہ انھوں نے مجھے عنایت فرمایا۔ اس نسخہ پر اپنے دست مبارک سے "محترم قاضی مشتاق کے لیے محباب کالی داس گپتا رضاؔ" لکھا۔ میں نے اپنا افسانوی مجموعہ "لکشمن ریکھا کے پار" پیش کیا تو مسکراتے ہوئے بولے "قاضی صاحب! افسانے میں آپ اور کتنی شہرت چاہتے ہیں؟" پھر آہستہ سے بولے "اب آپ تحقیقی ادب کی طرف توجہ دیں"۔ ان کے اس مشورہ نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ میری کتاب "خوشبو جیسے لوگ" چھپی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ کتاب سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس میں رضاؔ صاحب کا خاکہ بھی شامل تھا۔ کہنے لگے "اس کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے جواب دیا "ضرورت تھی اسی لیے تو آپ کا نام شامل کیا ہے۔ اب آپ اس کی رسم اجرائی بھی ادا کریں اور اس پر اپنے تاثرات بھی لکھیں"۔ وہ تیار ہو گئے۔ یہ کتاب اعظم ٹرسٹ نے شائع کی ہے۔ بعد میں سردار جعفری کی یاد میں ایک سیمینار بھی ہوا۔ ڈاکٹر عبد الستار دلوی، یوسف ناظم، رفیعہ شبنم عابدی، ڈاکٹر انوار الدین تشریف لائے تھے۔ ایک اجلاس میری صدارت میں تھا۔ جب صدارت کے لیے میرا نام پکارا گیا تو یوسف ناظم صاحب نے میرے لیے کرسی خالی کردی۔ اب میں ان دونوں کے بیچ بیٹھ گیا تو بولے "آپ بزرگوں کے درمیان آگئے"۔ میں نے کہا "اب میں بھی اس صف میں آرہا ہوں"۔ وہ مسکراکر خاموش رہ گئے۔ سیمینار میں مقالے پڑھے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی مقالہ نہیں لکھا تھا اس لیے تقریر کی۔ میری تقریر وہ بغور سنتے رہے۔ جب میں تقریر ختم کرکے ڈائس پر آیا تو بولے "مجھے امید نہیں تھی کہ اس موضوع پر آپ اتنی اچھی تقریر کرسکتے ہیں"۔ میں نے جواب دیا "آپ ایسا کیوں سمجھ رہے تھے؟" انھوں نے کہا "افسانہ نگاروں کے بارے میں عموماً یہی سمجھا جاتا ہے"

اب تک جن ادبی شخصیتوں سے میری بالمشافہ ملاقات ہوئی ہے ان میں عصمت چغتائی کے بعد گپتا صاحب ہی ایسے فنکار تھے جو دل کی بات منہ پر کہہ دیتے تھے۔ جب میں عصمت آپا سے اپنے افسانوں پر رائے لینے گیا تو انھوں نے کہا "مجھے ادب میں جراحی کا شوق نہیں" حالانکہ بعد میں انھوں نے جو تاثرات تحریری طور

پر دیے وہ میری ادبی زندگی کا سب سے بڑا انعام ہیں۔ اب جب بھی کہیں میرا ذکر ہوتا ہے ان تاثرات کا استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح گپتا صاحب نے مجھ سے کہا تھا "افسانے پر میری نظر نہیں ہے لیکن جب آپ کی کوئی اور موضوع پر کتاب شائع ہوگی میں ضرور لکھوں گا"۔ خوشنو جیسے لوگ پر انھوں نے جو تاثرات قلمبند کیے ہیں وہ میرے لیے کسی سند سے کم نہیں۔ یہ گپتا صاحب کی نصیحت کا نتیجہ ہے کہ اب میں افسانہ نگاری کے علاوہ تحقیقی ادب کی طرف بھی متوجہ ہوا ہوں۔ اس موضوع پر میری کئی کتابیں منظر عام پر آنے والی ہیں۔ لیکن افسوس گپتا صاحب نہ ہوں گے۔ ان کا آشیرواد ضرور میرے ساتھ ہوگا۔ مجھے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ گپتا صاحب مجھے تحقیقی ادب کی طرف متوجہ ہونے پر کیوں اصرار کر رہے تھے۔ ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ سمجھتے تھے کہ میں اپنی ادبی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سمجھ رہے ہوں کہ افسانہ نگاری میں میں اپنی اننگ کھیل چکا۔ پچھلے دنوں جب میں دورۂ یورپ پر گیا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہندوستان کے باہر بھی میرے قدرداں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ جب کسی فنکار کو اس کے ملک سے باہر بھی پہچانا جانے لگے تو اس کے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے؟ بدقسمتی سے ادبی دنیا میں آگے بڑھتے ہوئے کی ٹانگ کھینچنے کا رواج ہے لیکن گپتا صاحب آگے بڑھنے والے کو مزید آگے دیکھنا چاہتے تھے۔ جو بات انھیں پسند آتی اس کی تعریف بھی وہ کرتے۔ اسمبلی ہال میں وہ میرے لکھے ہوئے "یک بابی ڈرامہ" دیکھنے ساوتری بھابھی کے ساتھ آئے تھے۔ ڈرامہ انھوں نے بڑے غور سے دیکھا اور ڈرامہ پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ "میں قاضی مشتاق احمد کو بحیثیت افسانہ نگار پہچانتا ہوں لیکن آج ایک نئے روپ میں ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ ان کے ڈراموں کا اسکرپٹ مہیش بھٹ کی فلموں کے اسکرپٹ کی طرح بہت کسا ہوا ہے۔ مکالمے برجستہ ہیں اور واقعات کا تسلسل خوشگوار"۔ یہ دوسرا سرٹیفکیٹ تھا جو گپتا صاحب نے سب کے سامنے عنایت فرمایا۔ افسوس کہ ان سے قریب آنے کا موقع مجھے نہیں ملا۔ ایک تو سرکاری مصروفیات نے مجھے باندھ رکھا تھا۔ اور دوسرے پونہ میں ان کا قیام مختصر سا ہوتا تھا۔ ویسے بھی اس دنیائے فانی میں بھی وہ کم ہی عرصہ کے لیے آئے تھے۔ آئندہ پانچ سالوں کے لیے ان کا علمی و تحقیقی لائحہ عمل تیار تھا۔ وہ غالبؔ کی سوانح لکھنے کا عزم رکھتے تھے۔ اردو زباں کے لیے وہ غالبیات کا ذخیرہ، سیکڑوں نایاب کتابیں، رسائل، مخطوطات اور خطوط چھوڑ گئے ہیں۔ اب اردو والوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ کسی دوسرے کالی داس گپتا کے ظہور کا انتظار کیے بغیر اس انمول خزانہ کے حفظ کے لیے "کالی داس گپتا رضا اکیڈمی" یا "رضا میوزیم" بنائیں۔ کالی داس گپتا جیسے فنکار ہزاروں سال میں ایک پیدا ہوتے ہیں۔ اردو زباں کا یہ آخری مغل بھی چلا گیا اور ایسی امید کم ہی ہے کہ کوئی دوسرا کالی داس گپتا آئے گا

ملے بچھڑ گئے سمجھا کوئی کسی کو نہیں
یہی ہماری ملاقات کا خلاصہ ہے

☆☆☆

کالی داس گپتا رضا یادیں باتیں

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

کالی داس گپتا رضا کو میں اس وقت سے پڑھتا رہا ہوں جب وہ مشرقی افریقہ میں تھے۔ مشرقی افریقہ سے ہی انھوں نے میری گذارش پر بعض تخلیقات بھیجی تھیں جنھیں میں اپنی ادارت میں شائع ہونے والے تین چار رسائل میں شائع کرتا رہتا تھا۔ غالباً ۱۹۶۸ء کی بات ہے جب انھوں نے اپنا پہلا مجموعہ کلام 'شعلۂ خاموش' مجھے بھیجا تھا۔ نہایت خوبصورت کتاب تھی جس پر میں نے رضوان احمد کے رسالہ 'زیور' یا ہفت روزہ 'عظیم آباد ایکسپریس' میں تبصرہ کیا تھا۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام "شورش پنہاں" ۱۹۷۰ء میں ملا لیکن پتہ بمبئی کا تھا۔ میرے خط کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب وہ مستقل طور پر بمبئی آگئے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں ان کا تیسرا مجموعہ کلام 'شاخ گل' بھی آگیا۔ پھر ان کی بہت ساری کتابیں میرے پاس آئیں۔ چند پر میں نے تبصرے لکھے، بعض ابھی تک تبصرے کی منتظر ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی تبصرے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ البتہ بعد کی کتابوں پر For Review کی مہر ضرور ہوتی تھی۔ جن تبصروں کو پڑھ کر انھوں نے مجھے خطوط لکھے ان میں ایک کتاب ہندوستانی، مشرقی افریقہ میں (جلد اول)" تھی۔ میرا تبصرہ تھا

"کالی داس گپتا رضا ایک اچھے نثر نگار اور شاعر ہیں۔ انھوں نے تجارت کی غرض سے کافی عرصہ مشرقی افریقہ میں گذارا ہے۔ اور وہاں کے لوگوں کو اور وہاں کے حالات کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ یوپی اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ کتاب "ہندوستانی، مشرقی افریقہ میں (جلد اول)" تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں مشرقی افریقہ کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان ہندوستانی تاجروں کے حالات اور کارناموں کو بیان کیا گیا ہے جنھوں نے کینیا، یوگنڈا اور تنزانیہ کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ یہی تینوں ملک دراصل مشرقی افریقہ ہے۔ کینیا کا رقبہ دو لاکھ چوبیس ہزار نو سو ساٹھ مربع میل ہے۔ یہ ۱۸۹۵ء میں برٹش ایسٹ افریقہ پروٹیکٹوریٹ بنا۔ پھر ۱۹۲۰ء میں کینیا کالونی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ۱۹۶۳ء میں انگریزوں کے قبضے سے نکلا اور آزاد ہوا۔ اس کی راجدھانی نیروبی ہے۔ ممباسا، نکورو، کسمو، ایلڈوریٹ، تھیکا، نیری، میوکی، نیواشا وغیرہ مشہور شہر ہیں۔ یوگانڈا کا کل رقبہ اکانوے ہزار ایک سو چونتیس مربع میل ہے۔ یہ پہلے انگریزوں کی عملداری میں تھا۔ جب ۹ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو اسے آزادی ملی تو ایک خود مختار ملک بنا۔ اس کی راجدھانی کمپالا ہے۔ تنزانیہ دو ملکوں ٹانگانیکا اور زنجبار کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ ۹ر دسمبر ۱۹۶۱ء کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہوگیا۔ زنجبار پر صدیوں سے عرب سلطانوں کی حکومت تھی۔ اس وقت تنزانیہ کا کل رقبہ تین لاکھ باسٹھ ہزار چار سو پینتیس مربع میل ہے اور اس کی راجدھانی دار السلام ہے۔ اور یہی ملک کا سب سے بڑا بندرگاہ ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عربوں کے بعد سب سے پہلے ہندوستانی ہی مشرقی افریقہ پہنچے۔ پہلی صدی مسیح تک ہندوستان اور مشرقی افریقہ کے تعلقات بیحد استوار ہو چکے تھے۔ اور گیہوں، چاول، تیل، سوتی کپڑا، شہد اور شکر کی تجارت شروع ہو گئی تھی۔ تیرہویں صدی مسیح میں مارکوپولو بتاتا ہے کہ مالابار کے جہاز زنجبار آتے جاتے تھے اور ہندوستان سے زنجبار کا سفر تقریباً بیس دنوں میں طے ہوتا تھا۔ آٹھویں صدی اور پندرہویں صدی کے درمیانی عرصہ میں عربوں نے جگہ جگہ اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ روپے پیسے کا لین دین ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا کیونکہ عرب حساب کتاب کے معاملات سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ جب پرتگیزی مشرقی افریقہ گئے تو انھوں نے ہندوستانی جہازوں کو افریقی ساحلوں پر لنگر انداز دیکھا۔ انیسویں صدی کے آخر سے یوروپی بالادستی کا دور دورہ شروع ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستانی وہاں اور زیادہ تعداد میں پہنچتے رہے اور قدم قدم پر پسماندہ اور غلام افریقیوں کی آزادی کی جدوجہد میں ساتھ دیتے رہے۔ اور اذیتیں سہتے رہے۔

کالی داس گپتا رضا کی اس کتاب میں مشرقی افریقہ اور وہاں ہندوستانیوں کی آمد کا حال تفصیل سے ملتا ہے۔ اس کے بعد مشرقی افریقہ میں تجارت کی غرض سے جانے والے ۱۸۴۰ء کے بعد کے ان مشہور و معروف شخصیتوں کے بارے میں مفصل حالات ہیں۔ جنھوں نے مشرقی افریقہ میں بیحد نام اور روپیہ کمایا اور وہاں کے معاملات میں داخل و قابض بھی ہوئے"۔

ڈیمائی سائز کے ۱۲۸ صفحے اور دس روپے پچاس پیسے قیمت والی اس کتاب پر میرا تبصرہ "کوہسار جرنل" کے ۲ر مارچ ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

دوسرا وہ تبصرہ تھا جسے پڑھ کر کالی داس گپتا رضا نے شکریہ کا خط مجھے لکھا تھا، جو اگست ۱۹۹۹ء کے "کوہسار جرنل" میں شائع ہوا تھا۔ یہ ظفر ادیب مرحوم کی لکھی ہوئی کتاب تھی جسے ساحر شیوی نے مرتب کیا تھا۔ کتاب کا نام "کالی داس گپتا رضا بحیثیت ماہر غالب و غالبیات" ہے۔ ڈیمائی سائز کے ۱۶۴ صفحے اور سو روپے قیمت کی اس کتاب پر میرا تبصرہ درج ذیل ہے

"قدر شناسی کے آج کے دور میں عظیم شخصیتوں پر جو بھی کتابیں منظر عام پر آتی ہیں وہ مشعل راہ ثابت ہوتی ہیں۔ کالی داس گپتا رضا عالم تبحر ہونے کے علاوہ نازک خیال اور خوش فکر شاعر ہیں۔ ممتاز محقق ہیں اور عروض و بلاغت کے ماہر ہیں۔ ظفر ادیب کی کتاب "کالی داس گپتا رضا۔ تحقیق، تالیف اور شعر کی روشنی میں" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے دوسری کتاب "کالی داس گپتا رضا بحیثیت ماہر غالب و غالبیات" بھی لکھی تھی لیکن اس کی اشاعت سے قبل ۲۳ر جون ۱۹۸۴ء کو وہ انتقال کر گئے۔ اس مسودے پر ساحر شیوی کی نظر پڑی تو انھوں نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ کالی داس گپتا رضا ماہر غالبیات ہیں۔ غالب پر ان کی سترہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور الگ الگ گوشے پر انھوں نے تحقیق و تنقید کی ہے۔ ۱۹۸۳ء تک انھوں نے غالب پر جتنا کام کیا تھا اس کا محاکمہ ظفر ادیب نے کیا ہے۔ "متعلقاتِ غالب"، "دعائے صباح"، "سہو و سراغ"، "مہر نیم روز"

اور "غالبیات چند عنوانات" کے عنوان سے ظفر ادیب نے غالب پر کالی داس گپتا رضا کے کام کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب سے ظفر ادیب کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت سامنے آتی ہے اور غالب کے سلسلے میں کالی داس گپتا رضا نے جو گمشدہ گوشے اور نئے پہلو تلاش کیے ہیں ان پر روشنی پڑتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب غالب فہمی کی نئی دریافت ہے۔"

اپنے رسالہ "کوہسار جرنل" کے لیے ۱۹۹۸ء میں ایک گشتی مراسلہ میں نے جاری کیا تھا کہ ۱۹۹۸ء کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ اس نئے سال میں آپ کیا سوچ رہے ہیں؟

"نگیٹو رپوزیٹو ۹۸ء" کے عنوان سے مئی کے شمارہ میں کالی داس گپتا رضا کا جوابنامہ اس طرح شائع ہوا تھا

۱ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ سال مرکز میں ایک مضبوط سرکار لانے میں کامیاب ہوگا جو مجموعی طور پر اس وقت ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

۲ میں عمر کے ۷۳ ویں سال میں ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ مزید کوئی علمی ادبی کام نہ کروں بلکہ اس کام کو سمیٹوں جو مسودوں، یادداشتوں کی شکل میں پڑے ہیں اور نظر ثانی کے طلبگار ہیں (ایسا کام کم از کم میں کتابوں کی شکل میں شائع ہوگا جسے کئی سال درکار ہوں گے۔)

۳ میری پچاس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ اگر اردو کی یہی حالت رہی تو انھیں پڑھے گا کون؟ مگر ع دیار امید قائم است

کالی داس گپتا رضا سے میری پہلی ملاقات انگلینڈ کے شہر لیوٹن میں ساحر شیوی کے گھر پر ہوئی۔ یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی لندن کی طرف سے ۲۷ اور ۲۸ اگست ۲۰۰۰ء کو سیمینار اور مشاعرہ میں شرکت کے لیے میں گیا تھا۔ ہیتھرو ایئرپورٹ پر ساحر شیوی کار لے کر ریسیو کرنے آئے تھے۔ وہ مجھے لے کر سیدھے اپنے گھر پہنچے جہاں دو روز قبل سے کالی داس گپتا رضا اپنی بیگم ساوتری کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب میں پہنچا تو وہ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم دونوں بیحد گرم جوشی سے ملے۔ چھ فٹ لمبے کالی داس گپتا رضا میں جاگیر داری نظام کا رکھ رکھاؤ ابھی باقی تھا۔ اس میں خاندانی ٹھاٹ کا جادوئی اثر بھی شامل تھا۔ حلیم الطبع اور منکسر المزاج رضا صاحب سے مل کر مجھے یہ ضرور یاد آیا کہ وہ پانچ سال تک آر ایس ایس کی باقاعدہ تربیت لے چکے ہیں اور ان کے تعلقات گرو گولوالکر سے رہے ہیں۔ میں نے اندر ہی اندر فیصلہ کیا کہ گفتگو میں احتیاط برتوں گا۔ لیکن ایسا ہوا کہ چار روز تک صبح آٹھ بجے سے رات دس بجے تک ساتھ رہنے کی وجہ سے ہم بے تکلف ہو گئے اور دنیا جہاں کی باتیں ایک دوسرے سے کرتے رہے۔ کبھی کھانے کے ٹیبل پر، کبھی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر، کبھی ٹی وی دیکھتے ہوئے، کبھی کار میں لندن جاتے ہوئے اور کبھی ساحر شیوی کے مکان کے باہر ٹہلتے ہوئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنے نام کے ساتھ Riza کیوں لکھتے ہیں جبکہ عام طور پر Raza استعمال کرتے ہیں؟ جواب میں انھوں نے کہا کہ لوگ Rizvi ہی استعمال کرتے ہیں۔ Razvi نہیں سا

ہوگا۔ ان کے جواب سے میں مطمئن نہیں ہوا کیونکہ رَضا، رِضا اور رضوی کے معنی میں جانتا تھا۔ رضوی عربی لفظ ہے جسے امام موسیٰ علی رضا سے نسبت رکھنے والے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی اولاد سے بھی مراد ہے۔ بقیہ دونوں الفاظ بھی عربی ہیں جس میں رَضا کے معنی راضی ہونا یا خوش ہونا ہے اور رِضا کے معنی خوشنودی، خوشی، مرضی، اجازت، مہلت، رخصت ہیں۔ میں نے گپتا صاحب سے بحث نہیں کی کہ ممکن ہے عقیدے کی بات ہو کیونکہ کل وہ بچپن کی یادوں کو کریدتے ہوئے اور اپنے گاؤں مکند پور کا ذکر کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ تین سال کی عمر تک محرم کا اکھاڑہ اور سینہ کوبی دیکھتے رہے تھے۔ پھر جب بعد میں مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ صاحب کے چھوٹے نواسے امام حسین کی یاد میں محرم منایا جاتا ہے جب انھیں یزیدی فوج کے بے رحم سپاہیوں نے سفاکانہ انداز سے کربلا کے تپتے میدان میں ذبح کر ڈالا تھا۔ شہادت کا یہ واقعہ ان کے ذہن سے عمر کے کسی حصہ میں محو نہیں ہوا! اپنے بارے میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مشہور سٹے باز ہرشد مہتا کے ساتھ ان کا کروڑوں کا نقصان ہوا لیکن انھوں نے خود کو سنبھال لیا اور زیادہ اثر نہیں لیا۔ میرے پوچھنے پر یہ بھی بتایا کہ ممبئی میں کئی مکان ہیں جس سے کرایہ آتا ہے۔ ایک مکان بیٹے کے نام ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ جس مکان میں وہ خود رہتے ہیں وہ بیٹی کے نام ہے۔ بیٹی مطلقہ ہے اور جاب کرتی ہے۔ بیٹی کے جاب کرنے پر وہ ہنس کر بتانے لگے کہ ایک وہ دَور تھا جب ان کے والد کے زمانے میں ہی گھر کی عورتیں بلا ضرورت باہر نہیں نکلتی تھیں اور اگر کہیں آنے جانے کی ضرورت پڑتی تھی تو ٹولیاں بنا کر جاتی تھیں۔ میں نے کالی داس گپتا رضا سے ان کی لائبریری کے بارے میں پوچھا کہ ان کے بعد ان کی قیمتی لائبریری کا کیا ہوگا۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ لائبریری بیٹے کے حصے میں جائے گی۔ بیٹے سے انھیں شکایت تھی کہ وہ ادب کا آدمی نہیں ہے اور ان کے بعد لائبریری کو بیچ دے گا جس سے کئی لاکھ روپے مل جائیں گے۔ گفتگو کے دوران مدیر فتح پوری کا ذکر کئی بار آیا۔ وہ انھیں بہت مانتے تھے۔ میں نے لائبریری کے ذکر پر ان سے کہا کہ آپ کی لائبریری کے دو ہی جانشین ہو سکتے ہیں۔ ایک ساحر شیوی اور دوسرے مدیر فتح پوری۔ یہ بھی کہا کہ ساحر شیوی انگلینڈ میں ہیں اس لیے لائبریری مدیر فتح پوری کو دیدیں۔ لیکن میرے مشورہ پر وہ خاموش رہ گئے۔ پھر چند لمحے بعد مجھے دوسرے موضوعات کی طرف ذہنی طور پر لیتے چلے گئے۔ انھوں نے ایک شعر سنا کر پوچھا کہ یہ کس کا ہے

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو

رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

میں نے بتایا کہ میر تقی میرؔ کا ہے اور بہت مشہور شعر ہے۔ اس پر وہ مسکرائے اور کہنے لگے کہ یہ شعر لالہ مدھ سکھ قلندر کا ہے جو خاں آرزو کے معاصرین میں سے تھے۔ انھوں نے شعر پڑھا

تھمتے ہی تھمے گا اشک ناصح

رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

اور بتایا کہ کریم الدین کے تذکرہ "طبقات الشعراء ہند" میں اسی طرح سے ہے۔ میر تقی میر کے ہی ایک اور شعر کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ مرقع سخن دوم میں یہ درد رہاں پوری کے نام سے ملتا ہے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

دو مشہور ترین مصرعوں کو سنا کر انھوں نے بتایا کہ ان کے خالق لالہ مادھو رام جوہر ہیں۔

(۱) وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

(۲) تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

پھر انھوں نے مکمل اشعار سنائے

اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سر محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

انھوں نے ایک اور شعر پڑھا

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

پھر بتایا کہ یہ شعر رند لکھنوی کا ہے جو فارسی کے اس شعر سے ٹکرا گیا ہے۔

اے بلبل اگر نالی من باتو ہم آواز
تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے

اور یہ کہ شاید حافظ کا یہ شعر ان دونوں کا ماخذ ہو

بنال بلبل اگر بامنت سر یاری است
کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است

اتنے اشعار کی تفصیل بتانے کے بعد انھوں نے یہ سجھاؤ دیا کہ کوئی محقق اور باذوق طالبعلم مل جائے تو اس موضوع پر پی ایچ ڈی کرایا جاسکتا ہے۔ اپنی مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ان دنوں ہندوستان کے ٹھگوں پر کام کرنے کی تیاری میں ہیں۔ یہ پروجیکٹ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی سے انہیں ملا ہے۔ یہاں لندن میں وہ بعض کتابیں تلاش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بتایا کہ اٹھارہویں صدی کے آخری اور انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان میں ٹھگوں کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ سفر دشوار ہوگیا

تھا اور روزانہ سینکڑوں افراد ان ٹھگوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتے تھے۔ بلاشبہ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کارنامہ ہے کہ اس نے ملک کے طول و عرض میں ان ٹھگوں کے خلاف فوجی کارروائی کر کے ان کی تنظیم کا خاتمہ کیا۔ یہ ٹھگ بیحد منظم تھے۔ ان کی اپنی خفیہ زبان تھی۔ ان کے خفیہ اشارے تھے، ان کے اپنے افسران تھے اور ان کی تحریک پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھگوں میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے اور حیرت کی بات ہے کہ یہ سب "بھوانی دیوی" کے پجاری تھے۔ اور ان کا عقیدہ تھا کہ وہ انسان کا قتل کر کے "بھوانی ماتا" کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ ہندوستان کے یہ ٹھگ صرف ایک رومال کے ذریعے مسافروں کو دھوکے سے قتل کر دیا کرتے تھے اور پھر ان کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا کرتے تھے۔ ان کو بھیس بدلنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ میں نے گپتا صاحب سے کہا کہ کرنل میڈوز ٹیلر کی کتاب The Confession of a Thug ضرور پڑھیں۔ اس میں مشہور ٹھگ امیر علی کی داستانِ حیات ہے جسے انگریز فوجوں نے گرفتار کیا تھا۔ یہ داستان صرف امیر علی کی نہیں بلکہ پورے ٹھگ گروہ کی ہے۔

کالی داس گپتا رضا کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ کئی دن کی ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ ایک نیک اور ملنسار انسان ہیں۔ اپنائیت، بے تکلفی اور صاف دلی ان کی شخصیت کا حصہ ہیں۔ اور علمیت کا کیا کہنا۔ ہر موضوع پر بے تکان باتیں کرنا صحت مندانہ ادبی رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم نے برطانیہ کے مشہور کنجوسوں کی بھی بات کی۔ وال اسٹریٹ لندن میں ہٹی گرین رہتی تھی۔ اسے اپنے باپ کی وراثت سے دس لاکھ پونڈ ملے تھے لیکن اس نے اس رقم میں اتنا اضافہ کر دیا کہ دو کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی۔ مگر اس کے رہنے سہنے کے طریقے عجیب تھے۔ وہ اپنے سینے اور ریڑھ کی ہڈی پر پرانے اخبار باندھ کر اس کے کپڑے پہن لیا کرتی تھی تاکہ سردی سے بچ سکے۔ اس طرح اسے کوئلوں کی بچت ہو جایا کرتی تھی۔ وہ صابن بچانے کے خیال سے کئی کئی ہفتے نہیں نہایا کرتی تھی۔ برطانیہ میں ایک ریلوے لائن اس کی ملکیت تھی۔ مرنے سے پیشتر اس نے ایک پادری کو خط لکھا کہ مجھے فلاں مقام تک جانا ہے اور میرے پاس کرایہ نہیں ہے، بہتر یہ ہے کہ میرے لیے کرائے کا بندوبست کیا جائے چنانچہ پادری نے کرائے کا بندوبست کر دیا تھا۔

ارل آف کلیس ری کارڈ انگلستان کے مشہور کنجوسوں میں شامل ہے۔ وہ دوپہر کے کھانے کے وقت ہائیڈ پارک پہنچتا اور کسی خوانچہ فروش سے ارزاں سے ارزاں کھانا خرید کر سرِ گھاس پر بیٹھ کر کھاتا۔ اور پھر ہم یہی کہتا کہ کھانا مہنگا تھا۔ ایک مرتبہ اسے کسی ریسٹوران میں مدعو کیا گیا جہاں اس نے دوسروں کی نظر بچا کر بعض اشیاء اپنی جیب میں ڈال لیں تاکہ گھر جا کر کھا سکے۔ ۱۹۱۶ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے جانشین ارل آف ہیرڈر تھے جنھوں نے پرنسس رائل سے شادی کی تھی۔ اس جوڑے کو پچیس لاکھ پونڈ ورثے میں ملے تھے۔

کالی داس گپتا رضا ایک بار پہلے بھی لندن آچکے تھے اس لیے ان کی معلومات زیادہ تھیں۔ ساحر شیو لیوٹن سے Stanmore ریلوے اسٹیشن تک کار سے مجھے لے کر آتے تھے۔ پھر وہاں سے ٹیوب ٹرین کی حو

لائں سے بیکر اسٹریٹ تک جانا پڑتا تھا۔ لندن گھومنے کے دوران ایک دن کالی داس گپتا رضا بھی ہمارے ساتھ تھے۔ راستے میں Wembley پارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے میری معلومات میں اضافہ کیا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں عام طور پر ہندوستانی اسٹار پروگرام دیتے ہیں۔

گلشن کھنہ نے ہمیں رات کے کھانے پر ملایا تھا۔ ہیتھرو ایئرپورٹ سے قریب ہونسلو میں ان کا مکان ہے۔ یہاں میں نے اندازہ لگایا کہ کالی داس گپتا رضا شراب نہیں پیتے ہیں۔ ویسے بھی وجیٹیرین تھے۔ اس کی وجہ سے ساحر شیوی کے یہاں کھانے ناشتے میں مجھے بھی دو دن تک وتیج ملے۔ لیکن اگلے دن سے میں نے نان وتیج کا انتظام کرالیا تھا۔ گلشن کھنہ کے یہاں ایک گھنٹے کی شعری نشست بھی ہوئی تھی جس میں مہمان خصوصی میں تھا اور صدارت کالی داس گپتا رضا نے کی تھی۔ گلشن کھنہ، سعادت سعید، سوہن راہی، عبد الغفار عزم، یشپال گپتا، گلزار امرت، سیما حنا، ساحر شیوی، محسن لائل پوری، مناظر عاشق ہرگانوی، کالی داس گپتا رضا اور کئی دوسروں نے اپنا کلام سنایا تھا۔

انگلینڈ سے واپسی کی رات مجھے ساحر شیوی کے یہاں سونا تھا کہ صبح سوا چھ بجے میری ٹرین تھی جو مجھے گیٹوک ہوائی اڈہ تک لے جاتی۔ میرا کمرہ الگ تھا۔ میں ساحر صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ رات گیارہ بجے کالی داس گپتا رضا اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے لیکن دس بارہ منٹ بعد ہی وہ کمرے سے نکل آئے۔ مجھ سے انھوں نے ہاتھ ملایا، مجھے گلے لگایا اور معذرت بھرے انداز میں وہ بولے کہ صبح سویرے نہیں مل سکوں گا، اس لیے ابھی رخصت لیتا ہوں۔ مجھے بمبئی آنے کی انھوں نے دعوت دی اور یہ بھی کہا کہ سفر نامہ ضرور لکھوں۔ جگہ جگہ مجھے نوٹس لیتے دیکھ کر قبل ہی انھوں نے دریافت کیا تھا کہ کیا میں سفر نامہ لکھوں گا۔ اپنے کمرے میں جاتے جاتے انھوں نے یہ بھی ہدایت دی کہ ان کی جو کتابیں میرے پاس نہیں ہیں انھیں لکھ بھیجوں۔ ان کی کتابیں میرے پاس رہنی چاہئیں۔

کالی داس گپتا رضا سے کئی دن کی ملاقات کے بعد ان کی شخصیت کے مختلف پہلو سے میں متاثر ضرور ہوا تھا۔

سفر سے واپسی کے بعد میں نے سفر نامہ "لندن یاترا" لکھا۔ کتاب پریس میں تھی کہ میرے ایک شاگرد جو بمبئی میں رہتے ہیں، گھر آئے ہوئے تھے، واپس جانے لگے تو مجھ سے کالی داس گپتا رضا اور ندا فاضلی کے نام خط لے گئے۔ گپتا صاحب کو میں نے کوئی کتاب بھی بھیجی تھی۔ میرے شاگرد قمر امان کئی ماہ بعد گپتا صاحب سے ملے۔ میں نے خط میں انھیں یہ بھی لکھا تھا کہ سفر نامہ پریس میں ہے، آپ سے مالی تعاون چاہتا ہوں۔ جواب انھوں نے ۱۹ر فروری ۲۰۰۱ء کو دیا

محب مکرم تسلیم

کرم نامہ ملا۔ میری مالی حالت وہ نہیں ہے جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ میں نے بہت معمولی پونجی اپنے اور

اپنی اہلیہ کے اخراجات کے لیے بچا کر باقی سب اپنے جانشیوں میں بانٹ دی ہے۔ ۷۶ ر سال کی عمر میں بھی مناسب تھا۔ انگلینڈ کے لیے مجھے انھوں نے (صرف میرے لیے) آنے جانے کا ٹکٹ ضرور دیا تھا، باقی میں نے ان سے کوئی پیسہ نہیں لیا۔ سب اخراجات میرے اپنے تھے۔ اس لیے اب میں مالی مدد کرنے سے معذور ہوں۔ آپ کتاب چھپ جانے پر پانچ کتابیں مجھے بھیج دیں۔ ان کی قیمت میں ادا کردوں گا۔ بے فکر رہیں۔ میں آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر آپ سے بہتر کام کی توقع رکھتا ہوں۔ کام کا انتخاب آپ خود کریں۔

مخلص کالی داس گپتا رضا

کالی داس گپتا رضا سے ملاقات کو یادگار بنانے کے لیے میں نے آٹوگراف بک بڑھاتے ہوئے ان سے گذارش کی کہ کچھ لکھ کر دستخط کریں۔ انھوں نے ملا حظہ کے لکھا

"جناب مناظر عاشق ہرگانوی سے ملاقات بھی ہوئی تو انگلینڈ میں۔ بہرحال، میں نے انھیں دلچسپ اور شیدائے اردو پایا۔ ان کا یہ ذوق شعر و ادب اور شوقِ حفاظت زبان اردو ہمیشہ قائم رہے۔ یہی میری دعا ہے

کالی داس گپتا رضا۔ 28/8/2000، لیوش، انگلینڈ

کالی داس گپتا رضا آج ہمارے بیچ نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں باتیں ذہن میں تازہ ہیں۔

☆☆☆

Barapura, Bagalpur, Bihar

رضا صاحب کے ساتھ میرے بارہ برس

ابراہیم اشک

یوں تو کالی داس گپتا رضا سے میری ادبی ملاقات جنوری ۱۹۸۰ء میں شائع ہونے والے "تناظر" دہلی کے دوسرے شمارے ہی سے ہوگئی تھی جو کرشن موہن کی ادارت میں عصری اردو شاعری کی انتھالوجی کے روپ میں شائع ہوا تھا۔ رضا صاحب اس کی مجلس مشاورت میں شامل تھے۔ غزلوں کے حصے میں ان کی دو غزلیں بھی شامل تھیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

پربت سے ٹکرا، اے برقِ بے تاب — گلشن کی پونجی، پھولوں کی محراب
اے شوقِ شست اب دیر کیسی — ہمت بھی قائم، دریا بھی پایاب
جینے کی تلخی، پوچھو رضا سے — جذبات آتش ماحول زہراب

دوسری غزل کے اشعار کچھ یوں تھے۔

سایے سکنے کی باتیں اب ہونٹوں پر لایا کیا — رات گئی سو بات گئی، صبح ہوئی دہرانا کیا
تم تو بڑے ہو مالکے ہو، تم کیوں اس پر کان دھرو — ہم چھوٹے تو چھوٹے ہیں، چھوٹوں کا افسانہ کیا
دوست کہ دشمن سب کو رضا خوشبو کا نذرانہ دے — پھول کو مہکانے سے کام، اپنا کیا بیگانہ کیا

نظم کے حصے میں رضا صاحب کی دو نظمیں بھی شامل تھیں جن کے عنوانات "دکھی نہ ہو" اور "سپنا" تھے۔ اس انتھولوجی میں خاکسار کی بھی ایک غزل شامل تھی۔ میں اس وقت شعر کہنا سیکھ رہا تھا۔ اچھا شعر کہنے والے شعراء کا مطالعہ کرنا میری عادت تھی۔ اس لیے رضا صاحب کا نام میرے ذہن میں محفوظ ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد یہاں وہاں شاعری کے علاوہ رسائل میں ان کے مضامین بھی نظر سے گزرے۔ اندازہ یہ ہوا کہ وہ غالبیات پر کافی کام کر رہے ہیں۔ پھر ۱۹۸۵ء میں "تناظر" نے سات سو صفحات پر مشتمل کالی داس گپتا رضا نمبر شائع کیا۔ تو ان کی نثر اور نظم کے تمام تر گوشے اُجاگر ہوگئے۔ ادب میں ان کا ایک خاص مقام بن گیا اور اب کالی داس گپتا رضا کسی تعارف کے محتاج نہیں رہے۔ بلکہ ایک قد آور شاعر و ادیب کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ اب ان کی کتابیں تیز رفتار سے آنے لگی تھیں۔ اس وقت غالبیات کے تعلق سے ایک نام سر فہرست تھا وہ نام تھا مالک رام کا۔ لیکن جلد ہی رضا صاحب مالک رام سے اس دوڑ میں آگے نکل گئے اور اتنے آگے نکل گئے کہ مالک رام میلوں پیچھے چھوٹ گئے۔ اب تمام ہندو پاک میں غالبیات کے تعلق سے ایک ہی نام سر فہرست نظر آنے لگا اور وہ نام تھا کالی داس گپتا رضا کا۔ انھوں نے یہ کام بڑی سنجیدگی اور منصوبہ بندی کے ساتھ کیا۔ میں نے انھیں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہفتے میں ان کے تین چار دن اردو ادب کی خدمت کے لیے ہوتے تھے

اور باقی کے تیس دن بزنس اور سماجی کاموں کے لیے۔ اس درمیاں ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا اور وہ بمبئی آنے والے ہر شاعر ادیب کا خلوصِ دل سے خیر مقدم کرتے تھے۔ وہ بڑے ملنسار اور محبت والے انساں تھے۔ نہ تو کسی سے ناراض ہوتے تھے اور نہ ہی کسی کو ناراض کرتے تھے۔ اگر کسی کی بات بری بھی لگتی تو اسے درگذر کر دیا کرتے تھے۔

میری ملاقات رضا صاحب سے ۱۹۹۰ء میں ہوئی حالانکہ میں ۱۹۸۱ء ہی میں بمبئی آچکا تھا۔ اس سے پہلے دہلی کی ادبی محفلوں میں جن حضرات کو دیکھا، سنا اور جن کے ساتھ محفلوں میں شریک ہوا ان میں مالک رام، فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، آل احمد سرور، محمد حسن، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، حیات اللہ انصاری، بانی، کمار پاشی، خورشید الاسلام، حسن نعیم، شہابؔ جعفری کے نام خاص طور سے لیے جاسکتے ہیں۔ بمبئی آنے کے بعد علمی دنیا میں اپنے قدم جمانے کی غرض سے میرا ملنا جلنا زیادہ تر انھیں لوگوں سے رہا جن کے ساتھ میں کام کر رہا تھا۔ ادیبوں، شاعروں سے ملنے اور بحثوں میں اپنا وقت برباد کرنے کی ذرا بھی مہلت مجھے نہیں ملی۔ اور نہ ہی کسی سے ملاقات کرنے کو جی چاہا کہ یہاں ہر کوئی ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف دِکھائی دیتا ہے اور میرا مزاج نہ تو یہ سب دیکھنے کا عادی ہے نہ ہی میں ایسے ماحول میں زندگی کر سکتا ہوں۔ اس لیے سب سے دور اپنے ایک گوشے میں مگن تھا۔ اور وہ گوشہ تھا سیلو ولا گیسٹ ہاؤس کا ایک کمرہ جو ولے پارلے میں موجود تھا۔ انھیں دنوں شاعر کیلاش چندر نازؔ سے میری ملاقات ہو گئی۔ وہ بڑے ہی مخلص نظر آئے۔ دہلی میں ان سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ یہاں ملے تو میل جول کافی بڑھ گیا۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھنے لگے۔ اپنی بینک میں ہونے والے ایک مشاعرے میں بھی انھوں نے بلایا۔ پھر انھیں دنوں قمر جلال آبادی کے یہاں ہونے والی ایک نشست میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کی صدارت کالی داس گپتا رضاؔ صاحب ہی کر رہے تھے۔ میں نے پہلی بار انھیں وہیں دیکھا۔ معصوم بچے کی طرح کھلا کھلا چہرہ، مناسب قد کاٹھی، چوڑی پیشانی، چھوٹی چھوٹی مگر گہری آنکھیں، آنکھوں پر چشمہ، مدھم اور میٹھی آواز جو ہر دل کو چھو لینے کا ہنر جانتی تھی۔ خدا نے مال و دولت اور علم و فن سے بے پناہ نوازا تھا لیکن کسی بھی ادا سے کوئی غرور نہیں جھلکتا تھا۔ بہت ہی سادہ مگر پروقار شخصیت کے مالک تھے رضاؔ صاحب جنھیں "ں ار۔ و کا کالی داس کہا کرتا تھا۔ اس روز جب غزل پڑھنے کے لیے میرا نام پکارا گیا تو میں نے پہلی غزل پڑھی۔ صدر مشاعرہ رضا صاحب نے پوچھا "اور بھی کوئی غزل ہے؟" میں نے کہا "ہاں، ہے"۔ تو اجازت دی کہ وہ بھی پڑھو۔ میں نے دوسری غزل پڑھی۔ اس کے بعد تیسری غزل بھی انھوں نے پڑھنے کا حکم دیا اور میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ تین غزلیں پڑھنے کے بعد میں اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ مشاعرہ جاری رہا۔ اس درمیان میں کبھی کبھی صدر مشاعرہ سے میری نظریں مل جاتی تھیں اور وہ مسکرا دیتے تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو چائے کا دور چلا۔ رضاؔ صاحب نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا "جانتے ہو اشکؔ! میں نے تم سے تین غزلیں کیوں پڑھوائیں ؟" میں نے مسکرا کر جواب دیا "مجھے نہیں معلوم یہ تو آپ ہی جانیں۔" رضاؔ صاحب فرمانے لگے "دراصل تمہاری پہلی غزل

سن کر مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ غزل تم جیسے کم عمر شاعر کی ہو ہی نہیں سکتی۔ تم کسی استاد کی غزل اُڑا لائے ہو اور دھڑلے سے پڑھ رہے ہو۔ لیکن تمہاری تین غزلیں سننے کے بعد میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ تم اچھا شعر کہتے ہو خدا تمہیں نظر بد سے بچائے۔" یہ تھی رضا صاحب کے کردار کی بلندی کہ اپنے دل میں پیدا ہونے والے چور کو انھوں نے خود ہی بر سر محفل مسکراتے ہوئے اجاگر کر دیا اور پارکھی نظر ایسی کہ تمام محفل کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر ایک اجنبی نو عمر شاعر کو اپنی بھرپور داد سے نوازے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ فراخدلی رضاؔ صاحب ہی کا حصہ تھی۔ میں نے ایسے بھی بڑے نام والے شاعر اور ادیب دیکھے ہیں کہ جب کوئی نو عمر ان کے سامنے محفل میں کامیاب ہوتا ہے تو جل بھن کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ لیکن رضاؔ صاحب غالبؔ کے پرستار تھے، سچے فنکار تھے، اس لیے سچے اور اچھے فن کی قدر کرنا خوب جانتے تھے۔

رضاؔ صاحب سے میری دوسری ملاقات کیلاش چندر نازؔ کے دولت کدے پر منعقد ہونے والی ایک شعری نشست میں ہوئی۔ یہاں بھی مسند صدارت پر وہی جلوہ افروز تھے۔ یہ محفل کرشن موہن کے بمبئی آنے پر ان کے اعزاز میں رکھی گئی تھی۔ اس محفل کی خاص بات یہی تھی کہ مہمانِ خصوصی کرشن موہن نے بڑی دیر تک اپنی غزلیں سنائیں اور سب کو اپنی شاعری سے بیزار کرتے رہے۔ رضا صاحب کے صبر کا پیمانہ بار بار چھلک رہا تھا لیکن وہ ضبط کر کے رہ جاتے۔ شاید گھر آئے مہماں کی بے عزتی کرنا ان کی خاندانی روایت میں شامل نہیں تھا۔ محفل ختم ہوتے ہی وہ جلدی گھر چلے گئے۔

انھیں دنوں میں اپنے پہلے شعری مجموعہ "الہام" کو منظر عام پر لانا چاہتا تھا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ بمبئی کے کچھ شعراء حضرات نے میری فلمی کامیابیوں سے جلتے ہوئے میری ادبی خدمات پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابراہیم اشکؔ تو فلمی شاعر ہے۔ میں نے اس کا جواب اپنے فن کے ذریعہ ہی دینا مناسب سمجھا اور اپنے کلام کا انتخاب شعری مجموعہ کے لیے کیا۔ "الہام" کا مسودہ اپنی رائے لکھنے کے لیے میں نے کیلاش چندر نازؔ کو دیا۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کا دیباچہ رضاؔ صاحب سے لکھوالیں۔ اس طرح ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے۔ اگر آپ کے کلام میں کوئی فنی عیب کہیں رہ گیا ہوگا تو وہ درست بھی کر دیں گے۔ میں راضی ہو گیا اور کہا "پھر آپ ہی رضا صاحب کے یہاں مجھے لے چلیں۔" میں نازؔ صاحب کے ساتھ رضاؔ صاحب کے یہاں گیا۔ ان کے یہاں اردو زبان و ادب کی ہزاروں کتابیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ معمولی سفید سوتی کرتا اور سفید لنگی پہنے درویش صفت رضاؔ صاحب کسی ادبی کارنامے کو سر انجام دینے میں مصروف تھے۔ نازؔ صاحب نے کہا کہ ابراہیم اشکؔ میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہیں۔ یہ اپنا پہلا شعری مجموعہ شائع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ان کا مسودہ بغور و فکر اصلاح کی نگاہ سے دیکھ لیں اور کوئی فنی خامی ہو تو دور کر دیں۔ ویسے حضرت میر انیسؔ سے ان کی شاعری کا سلسلہ ملتا ہے اور ان کے استاد ماہر سلام اور مرثیہ اسدؔ بڑنگری ہیں جو انھیں فارغ الاصلاح قرار دے چکے ہیں۔ آپ کو دیباچہ بھی لکھنا ہے۔ عین نوازش ہوگی۔

رضا صاحب کہنے لگے "حضرت میر انیس تو مرثیہ اور سلام کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کے زبان و بیاں کی فصاحت اور بلاغت ان کے علاوہ کہیں اور ملتی ہے تو وہ استاد ذوق اور داغ کے اسکول ہی میں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ داغ ہمارے دادا استاد ہیں اور حضرت ذوق پر دادا۔ ہمارے استاد ہیں حضرت جوش ملسیانی۔ ان کے یہاں بھی زبان و بیاں کی وہی تہذیب ملے گی جسے میر انیس نے برتا ہے۔ میں نے بھی اسے اپنایا ہے۔ لیکن غزل میں اپنایا ہے۔ اشک نے میر انیس کی زباں و بیاں کی کتنی لاج رکھی ہے یہ تو مسودہ پڑھنے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔ اسے دس پندرہ دنوں کے لیے چھوڑ جاؤ۔ کچھ دوسرے ضروری کام ہاتھ میں ہیں ان سے فرصت پالوں تو پھر یہ کام بھی کردوں گا۔"

پندرہ دن کے بعد جب میں نے رضا صاحب کو فون کیا تو وہ "الہام" پر دیباچہ لکھ چکے تھے۔ عنوان بھرپور تھا وہ پرستار غالب تھے اور غالب ہی کے مصرع میں ذرا سی ترمیم کرکے انھوں نے خاکسار کو نواز دیا۔ انھوں نے لکھا "کہتے ہیں کہ ہے اشک کا انداز بیاں اور " دیباچے میں آگے چل کر اپنی پرخلوص رائے کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا ہے "غزل کو اشک عزیز ہے اور اشک کو غزل، ان کے یہاں روایت اور جدیدیت کا حسین امتزاج قدم قدم پر ملتا ہے۔ جب وہ روایت سے نکلتے ہیں تو صرف چونکاتے ہی نہیں دیتے بلکہ مذاقِ سلیم کے آتشداں میں ایک ایسا شعلہ بھی بھڑکا دیتے ہیں جو ایک اچھا شعر سننے یا پڑھنے کے بعد ہی پیدا ہوسکتا ہے میں طویل تنقیدی تبصرے لکھنے کا عادی اور اہل نہیں ہوں تاہم آنے والے کل کے اس اہم شاعر یعنی ابراہیم اشک نے سادہ عام اور غیر مصنوعی لب و لہجہ میں فنی اور تخلیقی پیشکش کی ہے یقیناً قابل اعتنا ہے ہمارے خیال میں کوئی شاعر اپنے کلام کو معنی آفریں بنانے کی ایماندارانہ کوشش بھی کرتا دکھائی دیتا ہے تو اسے کافی سمجھنا چاہیے۔ اشک کے یہاں یہ سعی قدم قدم پر ملتی ہے۔"

"الہام" کے جو اشعار انھیں پسند آئے تھے اور اپنے مضمون میں کوڈ کیے تھے وہ بھی ملاحظہ ہوں

بس کہ الہام آیتِ دل ہے — اور اپنا بیان کیا پیارے
اک محبت ہے کہ ہے جس سے زمانے کا نظام — یہ بھی چھن جائے تو ممکن ہے کہ دنیا نہ رہے
دھوپ ہی دھوپ مجھے دی ہے جھلسنے کے لیے — چھین کر لے گیا مجھ سے مرا سایا کوئی
ساری دنیا نے غزل کہہ کے پکارا اس کو — میں نے کاغذ پہ اتاری جو تری پرچھائیں
ہم تو بھیگے ہوئے بیٹھے ہیں بڑی دیر ہوئی — جا کہیں اور گھٹا ہم پہ برستی کیا ہے
ہر شعر پر ہے مہرِ محبت لگی ہوئی — میری غزل ہے اپنے لہو سے سجی ہوئی

"الہام" میں رضا صاحب نے کئی اشعار کی اصلاح بھی کردی تھی۔ میں وہ سب دیکھ کر پریشاں ہوگیا کیونکہ بعض مقامات ایسے بھی تھے جہاں ان کی اصلاح میری شاعری کے رنگ اور تیور کو متاثر کررہی تھی۔ میں نے اپنے دل کی بات نار صاحب سے کہی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ رضا صاحب بہت ہی پرخلوص انساں ہیں، انھوں نے جو بھی کیا ہے تمہاری بھلائی کے لیے کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان کی تمام اصلاح پر عمل کرو اور

اسے "الہام" میں رکھو، بلکہ جو قبول کرنا ہے اسے قبول کرلو باقی چھوڑ دو۔ رضا صاحب کوئی برا نہ مانیں گے۔ میں نے وہی کیا اور "الہام" شائع ہونے کے بعد ایک کاپی رضا صاحب کو دینے ان کے گھر ڈرتے ڈرتے پہنچا۔ انھوں نے میری موجودگی ہی میں ورق گردانی کی، خوش ہو کر مبارکباد دی لیکن یہ نہیں پوچھا کہ تم نے میری اصلاح پر کتنا عمل کیا اور کتنے اشعار میں وہ اصلاح موجود و ناموجود ہے۔ کوئی اور ان کی جگہ ہوتا تو ضرور پوچھتا لیکن رضا صاحب اعلیٰ درجے کے انسان تھے۔ وہ ہم ایسے چھوٹے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظرانداز کر دیتے تھے اور تعلقات بنائے رکھتے تھے۔ انھیں سب کو خوش رکھنے کا ہنر آتا تھا۔ رحیم نے اپنے ایک دوہے میں کہا ہے

چھما بڑین کو چاہئے چھوٹن کو اتپات　　　کا رحیم ہری کو گھٹیو جو بھرگو ماری لات

(یعنی اگر چھوٹے لوگ ہنگامہ کریں تو بڑے لوگوں کو چاہئے کہ وہ انھیں معاف کردیں۔ رحیم کہتے ہیں کہ بھرگو رشی نے اگر غصے میں آکر ہری کو لات ماردی تو ایشور کا مرتبہ چھوٹا نہیں ہو گیا اس سے تو بھرگو رشی ہی کا چھوٹا پن ظاہر ہو گیا۔)

رضا صاحب بھی بڑے انسان تھے، بڑے عالم تھے، بڑا دل رکھتے تھے۔ اس لیے چھوٹوں کو معاف کر دیتے تھے۔ "الہام" کے منظر عام پر آنے اور کامیاب ہونے پر سب سے زیادہ خوشی رضا صاحب کو ہوئی تھی۔ اس پر بے شمار تبصرے ہوئے۔ میں ہر ایک کی خبر انھیں دیتا۔ وہ ہر بار مجھے یہی کہتے "اشک تمہاری منزل "الہام" تک ہی نہیں ہے، ابھی تو تمھیں بہت آگے جانا ہے۔ اور میرا سارا نشہ ہرن ہو جاتا۔ میں پھر نئے سرے سے خوب سے خوب تر کی تلاش میں لگ جاتا اور اچھا شعر کہنے کی کوشش کرتا۔ کوئی اچھی غزل ہوتی تو رضا صاحب کو سناتا۔

"الہام" پر یوپی اردو اکیڈمی کا ایوارڈ ملا تو میں نے فون پر انھیں بتایا کہ مجھے یوپی اردو اکیڈمی کا ایوارڈ ملا ہے۔ کہنے لگے "اشک تمھیں تو یہاں مہاراشٹر اردو اکیڈمی سے بھی ایوارڈ ملنے والا تھا لیکن کچھ بڑے ادیبوں اور شاعروں نے روڑے اٹکا دیے۔" اس وقت وہ خود بھی اکیڈمی کے ممبر تھے۔ اور جو کچھ ایوارڈ کی بندر بانٹ میں ہوا تھا اس کے وہ چشم دید گواہ تھے۔ میں نے جب ان سے نام پوچھا تو انھوں نے کسی کا نام نہیں بتایا لیکن بعد میں مجھے پتہ چل ہی گیا کہ علی سردار جعفری اور حسن کمال نے میری مخالفت کی تھی لیکن جب رضا صاحب نے ان لوگوں سے یہ پوچھا کہ پھر اس سال "الہام" کے بجائے کس شعری مجموعے پر ایوارڈ دیا جائے گا اس سے بہتر کونسی شاعری ہے تو سب ممبران لاجواب ہو گئے اور پہلی بار مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی تاریخ میں ایک سہرا ماٹ یہ لکھا گیا کہ اس سال کسی شعری مجموعے کو ایوارڈ کا حقدار ہی نہیں سمجھا گیا۔ رضا صاحب نہ تو کبھی اردو اکیڈمیوں کی کارکردگی سے خوش تھے نہ ہی جوڑ توڑ کرنے والے اکیڈمیوں کے ممبروں سے، وہ کہا کرتے تھے "اردو والے ہی اردو کی قبر کھود رہے ہیں، حکومت کا کوئی قصور نہیں ہے"۔

میری غزلیں ٹی وی یا ریڈیو پر غزل سنگروں کی آواز میں سنتے تو بہت خوش ہوتے تھے۔ جب بھی ملتا

کہتے فلاں غزل سنگر نے تمہاری فلاں غزل بہت اچھی گائی ہے۔ موسیقی کی انھیں اچھی سمجھ تھی۔ یہ فن بھی انھوں نے باقاعدہ سیکھا تھا۔ خود ستار بجاتے تھے۔ الہام کے انتخاب میں میری ان مشہور غزلوں کو جب نہیں دیکھا جو جگجیت، آشا بھوسلے، پرویز مہدی، استاد غلام مصطفیٰ خان، بھوپیندر متالی، پینار مسانی، طلعت عزیز، چندن داس اور طلعت محمود وغیرہ نے گائی تھیں تو پوچھا کہ وہ غزلیں تم نے شامل کیوں نہیں کیں۔ میں نے مختصر سا جواب دیا "گائی جانے والی غزلوں اور کتاب میں شامل ہونے والی غزلوں میں ایک خاص فرق میں محسوس کرتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ اپنے شعری مجموعے میں میں نے وہ غزلیں نہیں شامل کی ہیں جو گائی گئی ہیں"۔ رضا صاحب کہنے لگے "تم نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے کہ فلم پر علم کا اور علم پر فلم کا سایا نہیں پڑنے دیا ورنہ مجروح، ساحر اور شکیل کو دیکھو ایک بار فلم کی راہ پر نکلے تو ادب بھول گئے۔ لیکن مجھے تم سے ایسی امید نہیں ہے۔ تم دونوں ہی میدانوں کی Demand کو بخوبی سمجھتے اور برتتے بھی ہو"۔

"آگہی" کے لیے فخر الدین علی احمد اکیڈمی سے چھ ہزار روپے منظور ہوئے تھے لیکن میں اپنی کوتاہی کی وجہ سے وہ رقم نہ اٹھا سکا۔ بعد میں اس کی غزلیں ایک کاتب نے کتابت کر دی تھیں۔ کئی دن تک وہ یوں ہی پڑی رہیں۔ ایک دن باتوں باتوں میں رضا صاحب کو میں نے بتایا کہ دوسرے شعری مجموعہ کے لیے میں نے غزلیں کتابت کرا کے رکھ چھوڑی ہیں۔ کہنے لگے تم وہ مجھے لا کے فوراً دیدو۔ میں نے پوچھا "آپ اس کا کیا کریں گے؟" تھوڑا مسکرائے اور پھر بولے "تمہاری غزلیں اپنے نام سے چھپوالوں گا"۔ میں نے کہا "کیوں مجھے شرمندہ کررہے ہیں"۔ تھوڑا سا ڈانٹتے ہوئے بولے "شرمندہ تو تم نے مجھے کیا ہے اشک۔ ارے تمہاری دوسری کتاب تیار ہے اور تم اسے چھاپ نہیں رہے ہو اور مجھے بھی نہیں بتا رہے ہو کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے ہو اگر سمجھتے ہوتے تو مجھ سے اس کی اشاعت کے لیے روپے مانگ لیتے۔ اب تمہاری سزا یہی ہے کہ تین چار دن میں جب بھی تمھیں فرصت ملے وہ تمام کتابت شدہ غزلیں مجھے دے جاؤ میں وہ سب "اسباق" میں نذیر سے کہہ کر شائع کروادوں گا۔ وہ میری بات ٹالے گا نہیں۔" میں نے "آگہی" کی وہ تمام ستر (۷۰) غزلیں رضا صاحب کو لے جا کر دیدی اور انھوں نے شائع بھی کر دیں۔ میں رضا صاحب کا احسان مند ہوں کہ انھوں نے میرا اتنا بڑا کام پلک جھپکتے کر دیا ورنہ رسالوں میں ایک دو غزلیں شائع کرانے کے لیے بھی کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں یہ ہر شاعر بخوبی جانتا ہے۔ پھر میری بیباکی سے تو زیادہ تر مدیر ناراض ہی رہتے ہیں۔

ایک زمانے سے رضا صاحب اپنے کلام کی دیوناگری میں اشاعت کرانا چاہتے تھے لیکن انھیں ہندی کا یا اردو کا کوئی ایسا معتبر آدمی نہیں ملا جو ان کا یہ کام کر سکتا۔ میرے بارے میں جب انھیں معلوم ہوا کہ میں دونوں زبانیں جانتا ہوں ہندی کے اداروں میں بھی میں نے صحافت کے فرائض انجام دیے ہیں تو انھوں نے اپنی ہندی کتاب کا ذمہ مجھے سونپا۔ میں نے ایک گذارش کی کہ کلام کا انتخاب میں خود کروں گا اور آپ کوئی دخل نہیں دیں گے۔ انھوں نے مجھ پر بھروسہ کیا اور میں نے ان کے کلام کا انتخاب دیوناگری کتاب کے لیے "اکیلا آسماں"

کے عنوان سے کیا۔ پہلے اس کا دیباچہ بھی میں نے ہی لکھا تھا لیکن بعد میں رضا صاحب نے کچھ اپنے بارے میں خود ہی لکھا اور میرا ذکر اس میں کردیا۔ یہ کام میں نے اس وقت کیا تھا جب میرے پاس فلم کا کام نہیں تھا اور ہاتھ تنگ تھا۔ میں نے جو بھی معاوضہ مانگا رضا صاحب نے خوشی خوشی مجھے دے دیا۔ آڑے وقت میں اپنے دوستوں کی مدد کرنا وہ خوب جانتے تھے۔ ایسے وقت میں وہ اس بات کا بھی خاص خیال رکھتے تھے کہ دوست کی خودداری کو ذرا سی بھی ٹھیس نہ پہنچے۔ اس کی انا اس کا وقار بھی برقرار رہے۔ سخاوت کا یہ انداز بھی اعلیٰ قدروں کی پاسداری کا ثبوت ہے۔ جب ان سے قربت ہوگئی تو تنگ دستی کے عالم میں دو بار میں نے ان سے پانچ پانچ ہزار روپئے بطور قرض لیے اور وقت سے پہلے ہی واپس کردیے۔ رضا صاحب نے اُدھار کی واپسی پر مجھے کہا "اشک تمہارا ویوہار کھرا ہے۔ عام طور پر شاعر تم جیسے نہیں ہوتے۔ تم شاعر ضرور ہو لیکن ہیئے بھی ہو تم جیسے ذمہ دار اور بات کے دھنی ہمارے علم و ادب کی دنیا میں کمیاب ہیں"۔ اور اس کے جواب میں بس اتنا ہی میں کہہ پایا کہ یہ سب آپ ہی کی صحبتوں کا اثر ہے ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔

میں جب مرثیہ کہنے لگا اور جب ان کو جاکر سنایا تو پوچھنے لگے یہ سب اس دور میں تم کیوں کر رہے ہو۔ اب مسدس کون کہتا ہے؟ ہاں لیکن اس سے ایک فائدہ تمہیں ضرور ہوگا کہ تمہاری غزل میں معنویت، وسعت اور فکر و خیال کی بلندی آجائے گی۔ حافظ اور بیدلؔ کا مطالعہ کرنے لگا تو کہنے لگے "اب تم گئے کام سے"۔ غالبؔ کی شرح لکھنے لگا تو کہنے لگے اب غالبؔ میرے گھر سے تمہارے گھر منتقل ہو رہے ہیں۔ میری تمام کتابیں حوالے کے لیے تمہارے پاس موجود ہیں۔ ضرورت پڑنے پر دیکھ لیا کرو۔ جب بھی کوئی تازہ غزل کہتے فون پر سناتے۔ ادھر کئی اچھی غزلیں انھوں نے کہی ہیں جن کی اشاعت لازمی ہے۔

فلم "کہو نا پیار ہے" میں میرے لکھے نغموں کی کامیابی سے وہ بہت خوش تھے۔ ملت نگر میں فلیٹ لینے کی بات جب میں نے انھیں بتائی تو ان کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ ہمیشہ وہ یہی کہتے اللہ تمہیں اور ترقی دے خوب پھولو پھلو۔ میرا بڑا لڑکا ندیم دو سال پہلے جب ابودھابی کمپیوٹر پروگرامر کی حیثیت سے گیا تھا تو ان کی دعائیں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ اکثر اس کے بارے میں بھی پوچھتے رہتے تھے۔ دہلی جانے سے کچھ دن پہلے ہی میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ میں موبائل سے بات کر رہا تھا۔ کہنے لگے تمہاری آواز بھاری کیوں ہے؟ کیا طبیعت تو خراب نہیں ہے؟ میں نے کہا گھر کا ٹیلی فون بند ہے اس لیے موبائل سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے پدم شری ایوارڈ کے لیے مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کو تو پدم وبھوشن ملنا چاہیے۔ پدم شری آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ کہنے لگے اب ان سب سے دل بھر گیا ہے اشک دیکھو! مجروحؔ اور سردارؔ چلے گئے۔ اب ہماری باری ہے۔ میں نے کہا ایسا کیوں کہتے ہیں رضا صاحب۔ ابھی تو آپ کو سو سال جینا ہے۔ کہنے لگے اور سو سال تو بہت زیادہ ہیں۔ موت کی آہٹ شاید انھوں نے سن لی تھی۔ وہ دلّی گئے تو واپس آئے ہی نہیں۔ غالبؔ نے اپنے پر ستار کو روک لیا۔

☆☆☆

کالی داس گپتا رضاؔ سے ٹیلی فونی گفتگو

ڈاکٹر غلام رسول ساجد

کالی داس گپتا رضاؔ صاحب سے میری کوئی شناسائی نہیں تھی۔ انھیں میں "دیوانِ غالب" کے مرتب کی حیثیت سے جانتا تھا۔ مگر اس تاریخی ترتیب کے تحقیق شدہ کارنامے کے مطالعے سے بھی بے بہرہ تھا۔ اس طرح ان کی محققانہ لیاقت، ادیبانہ صلاحیت، ناقدانہ قابلیت اور شاعرانہ خوبیوں کا علم بھی نہیں رکھتا تھا۔ البتہ ان کے تعلق سے اتنا ضرور سن چکا تھا کہ رضاؔ صاحب اردو ادب پر خامہ فرسائی کرنے والے ادباء اور شعراء کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور دامے، درمے، سخنے، قدمے ضروریات کی بھرپائی بھی کرتے ہیں۔

میرا تحقیقی مقالہ "اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ" طبع ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ اور مجھے اس کتاب پر مہاراشٹر اردو اکیڈمی سے ۱۹۹۷ء میں تحقیقی اور تنقیدی کارکردگی پر اوّل انعام سے نوازا گیا تھا۔ ان دنوں ایک صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ گپتا رضا صاحب سے ملیے اور اپنی کتاب دیجئے۔ انھوں نے ازراہ ہمدردی مجھے فون نمبر بھی دیا۔ میں نے گپتا صاحب کو دو دن بعد فون لگایا، فون پر مجھے آواز آئی۔ ہیلو میں نے کہا، گپتا صاحب ہیں۔ جی ہاں! میں گپتا ہی بول رہا ہوں۔ میں نے اپنا تعارف اپنی کتاب کے حوالے سے بیان کیا۔ نہایت خوش دلی سے آواز آئی، آداب۔ میں نے جواباً کہا میں استھما (دمے) کا مریض ہوں۔ آپ کی خدمت میں خود حاضر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اپنے بیٹے افکار بخش کے ساتھ اپنی کتاب کا ایک نسخہ نذر کر رہا ہوں۔ میری مجبوری کو مدنظر رکھ کر یہ تحفہ قبول فرمائیے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ، اس کتاب کو مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے تحقیق اور تنقید کے موضوع پر اوّل انعام سے سرفراز کیا ہے۔ یہ سن کر گپتا جی نے جو جواب دیا سن کر میں ششدر رہ گیا۔ موصوف نے فرمایا یہ کتاب اکیڈمی کی جانب سے میرے پاس ریمارک کے لیے آئی تھی بہت اچھی کتاب ہے۔ اول انعام کی سفارش میں نے ہی کی تھی۔ اس سلسلے میں چند لوگ میری اس رائے سے متفق نہیں تھے لیکن میں نے انھیں راضی کر لیا۔ یہ بات سن کر میری نظر میں ان کی قدر اور بڑھ گئی کیونکہ میرے اس مقالے کو کتابی شکل دینے کے لیے اردو اکیڈمی سے تعاون کی درخواست پر دو بار ایسے واقعات پیش آئے جن کا اظہار اب ضروری ہو گیا ہے۔ میں نے اپنے مقالے کو کتابی شکل دینے کے لیے ۹۰-۱۹۸۹ء اکیڈمی میں مالی تعاون کے لیے درخواست دی۔ ان دنوں اکیڈمی کی تحقیقی اور تنقیدی کمیٹی کے مشیر اعلیٰ قبلہ استادی ڈاکٹر شیخ فرید مرحوم تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا، مبارک ہو آپ کی کتاب پر انیس ہزار زر تعاون دینا منظور ہو چکا ہے۔ اس کے چند ماہ بعد موصوف پر فالج کا حملہ ہوا اور انجمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے انھیں حبیب ہاسپٹل منتقل کر دیا گیا۔ کچھ دن علاج کے بعد ان کی حالت کے پیش نظر انھیں برہان پور لے جایا گیا۔ اس واقعے

کو تقریباً چھ ماہ گزر گئے۔ میں اکیڈمی کے انڈر سکریٹری جی ایم خاں سے ملا۔ ان دنوں ممبر سکریٹری یوسف ناظم تھے لیکن وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو چکے تھے۔ جی ایم خان نے کلرک کو آواز دے کر جمع شدہ مسودوں کی فہرست لانے کو کہا۔ انھوں نے فائل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا آپ کا مسودہ زیر غور ہے اور اس کے آٹھ ماہ بعد اردو اکیڈمی کے انڈر سکریٹری جی ایم خاں کی جانب سے جو لیٹر ملا، اس کا آخری جملہ یہ تھا "اکیڈمی بورڈ کے فیصلے کے مطابق آپ کا مسودہ "اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ" ناقابل امداد قرار دیا گیا ہے"۔ آپ اندازہ کیجئے یہ پڑھ کر میری دلی کیفیت کیا ہوگی۔ منظور شدہ امدادی رقم کیوں رد کی گئی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دوبارہ اپنے کچھ اساتذہ اور عزیز دوستوں کے کہنے پر اسی مقالے کو میں نے جولائی ۹۷ء میں اردو اکیڈمی میں مالی تعاون کے لیے پیش کیا۔ ان دنوں اکیڈمی کے ممبر سکریٹری فیاض احمد فیضی تھے اور اس وقت باوثوق ذرائع کے مطابق اس مسودے پر پچیس ہزار روپئے امدادی رقم منظوری کی گئی تھی اور مجھے مبارکباد کے جملے سے بھی نوازا گیا۔ لیکن چار ماہ بعد ۱۹/ نومبر ۱۹۹۷ء کو اکیڈمی کے سکریٹری فیاض احمد فیضی کی جانب سے جو لیٹر ملا اس کے جملے ملاحظہ فرمائیں

"ہمیں افسوس ہے کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر ہم اسے امداد دینے سے قاصر ہیں"۔ اب آپ بتائیے جس مقالے کو دوبارہ مالی امداد کیلئے رد کر دیا گیا تھا اس مقالے کو تحقیق اور تنقیدی میدان میں اوّل انعام کا حقدار قرار دینا اربابِ اکیڈمی کیلئے شرمندگی کا باعث تھا اس لیے مخالفت واجبی تھی لیکن گپتا صاحب کی یہ منصفانہ رائے اور صاف گوئی کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس ضمن میں ان کی جو بھی دلیلیں رہی ہوں مجھے اس کا پورا علم نہیں لیکن میری کتاب پر اوّل انعام دینے کی رضامندی کا سہرا گپتا صاحب کے سر جاتا ہے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایسا روپ تھا جس سے "حق بحق دار رسید" کا جذبہ اور انصاف پسندی کی صفت کھل کر سامنے آتی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ جب میں نے کتاب گپتا صاحب کو انعام سے نوازی، انھوں نے فون پر شکریہ کے ساتھ کہا میں نے اپنا مرتب کردہ "دیوانِ غالب" آپ کی نذر کر دیا ہے، مطالعہ کریں۔ انعام کی آمد پر میں نے مذکورہ دیوان اس کے ہاتھوں سے لیا۔ جلد سے مسلک سر ورق دیدہ زیب تھا۔ "دیوانِ غالب" نسخۂ گپتا رضا تاریخی ترتیب سے مرتبہ کالی داس گپتا رضا۔ نام کے بعد ہر تفصیل یکے بعد دیگرے تھی۔ یہ ان کا تیسرا ایڈیشن تھا کسی بھی کتاب کی اہمیت اور مرتب، مولف یا مصنف کی حیثیت کا اندازہ اس کی بار اشاعت کے شمار سے لگایا جاتا ہے لیکن یہ غالب کا دیوان تھا جس کی شہرت یا اہمیت تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔ گپتا صاحب کے اس نسخے کے مقدمے کے ذیلی عنوانات کلام غالب کی تاریخی ترتیب کیوں، تعارف، عمدۂ منتخبہ میں ذکر غالب، حرف نامعتبر" ہیں۔ ان عنوانات کے تحت انھوں نے غالب کے دیگر نسخے اور مرتبین کی کاوشوں کو سراہا اور ان سے استفادہ کے تذکرے کے ساتھ کچھ حقائق کا انکشاف کیا اور غالب کے اشعار سے منسوب تاریخی روایات کو اس عہد کے واقعات اور حالات کی روشنی میں اپنی تاریخی اور تحقیقی دلیلوں سے رد کیا۔ اکثر اشعار کی تاریخی ترتیب

کا تعین اور ان کے پس منظر میں ایسے بحث مباحثے کیے جس کی روشنی میں حقیقت تک پہنچادیا ہے اور اپنی ہر دلیل کے لیے تاریخی واقعات سے ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس ضمن میں جو آخری جملے ثبت کیے ہیں ان سے "دیوان غالب" کو مرتب کرنے کا عندیہ واضح ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ کریں

> "جب تک غالب کے تمام کلام کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ نہ کیا جائے ہم نتائج اخذ کرنے میں اکثر ٹھوکریں کھاتے رہیں گے۔ میں نے اسی مقصد کو رہنما سا کر اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ تاریخی ترتیب ہی سے غالب کے سوانحی اور فکری ارتقاء کا صحیح تجزیہ ہو سکے گا"۔[1]

"حرف نامعتبر" کے عنوان میں بیشتر سعید عرشی کی روایات سے اتفاق کرتے ہوئے اور کچھ اپنے بیانات کی روشنی میں غالب کے کئی اشعار کو غیر معتبر، ناپختہ کہہ کر صرف رد نہیں کیا بلکہ اس کے ثبوت میں اکثر دانشورانِ ادب کی آراء سے بھی استفادہ کیا ہے۔

میں نے جب تمام عنوانات کی بحثیں، دلیلیں، اور بیانات پڑھے تو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ "غالب کے دیوان" میں زیادہ تر اشعار کو سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ شاید اسی لیے گپتا صاحب نے مجھے تاکید کی ہے کہ "ڈاکٹر غلام ساجد استفادہ فرمائیں"۔

میں نے ۲۲ر ستمبر ۹۹ء صبح دس بجے موصوف کے نمبر ڈائل کیے۔ گھنٹی بجتے ہی فون پر ایک نسوانی آواز آئی۔ ہیلو میں نے کہا گپتا صاحب ہیں؟ جی آپ کون، میں ڈاکٹر غلام رسول ساجد ہوں۔ دوسرے لمحے میں گپتا صاحب کی آواز سنائی دی، ہیلو۔ میں نے کہا آداب! پہچانا آپ نے؟ کہا ہاں ڈاکٹر غلام رسول ساجد صاحب، فرمائیے میں نے بہت عاجزی سے کہا میری خواہش ہے کہ آپ میرے شعری مجموعے کے مسودے پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اپنے بچے کے ساتھ مسودہ بھیج رہا ہوں، ضرور بھیجئے لیکن لکھنے میں کچھ تاخیر ہوگی۔ میں نے کہا آپ جیسی شخصیت کے دو لفظوں کے لیے بھی میں ایک مدت انتظار کر سکتا ہوں ہلکے سے قہقہے کے ساتھ شکریہ کہہ کر فون رکھ دیا لیکن ۲۹ر ستمبر ۹۹ء کو فون پر کہا آپ کے مسودے پر "حرفے چند" لکھ دیا ہے لیکن اس میں کہیں کہیں عروضی سہو ہے۔ آپ نظر ثانی کرلیں میں نے کہا صاحب! عروض پر مجھے اتنی مہارت نہیں ہے۔ آپ سے بڑھ کر کوئی ہستی میری نظر میں اس کام کے لیے معتبر نہیں۔ جواب ملا ان دنوں بہت مصروف ہوں۔ فرصت کے اوقات میں دیکھوں گا۔ ان کی اس صاف گوئی اور سادہ لوحی پر میں حیران رہ گیا۔

دوسرے دن میں نے اعجاز کو ان کی قیام گاہ جل درشن روانہ کیا۔ وہ جب واپس آیا تو میرے مجموعے پر "حرفے چند" کے ساتھ انھوں نے "رسالہ استادِ شاعری" لالہ جگن ناتھ کمال کرتارپوری اور اپنا شعری مجموعہ "غزل گلاب" بھیج دیے۔ میں نے "رسالہ استادِ شاعری" کا پیش لفظ پڑھا تو میری نظر میں ان کی قدر و منزلت دوگنی ہوگئی کیونکہ پیش لفظ کے آخری جملے اس طرح تھے

"اگرچہ یہ رسالہ عربی کالی داس گپتا رضا کی تربیت کے لیے لکھا ہے تاہم اس سے ہر مبتدی بحولی استفادہ کر سکتا ہے۔ (رسالہ استاد شاعری ص ۵)

یہ رسالہ بھیج کر گویا انھوں نے مجھے سب کچھ کہہ دیا جو کہنا چاہتے تھے اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ بھی اس دور سے گزر چکے ہیں۔

سید معراج جامی صاحب مدیر اعلیٰ سہ ماہی رسالہ سفیر اردو لیوٹن کراچی پاکستان سے اکتوبر ۹۹ء میں ممبئی آئے ہوئے تھے۔ انھیں ساحر شیوی کا ماہیوں پر مشتمل مجموعہ "وادیٔ کوکن" اور ہاشم عبد الرزاق دھاسکر ایم فل کے مقالے کی کتابی شکل بعنوان ساحر شیوی (فن اور شخصیت) کی تقریب رسم اجراء میں شمولیت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ وہ میرے یہاں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے کہا گپتا صاحب کو فون پر اپنی آمد کی اطلاع دی ہے۔ رابطہ قائم کیا گیا تو گپتا صاحب نے انھیں گھر آنے کی دعوت دی۔ اس وقت جامی صاحب کی رہنمائی ہمارے بیٹے اعجاز نے کی جب یہ لوگ وہاں سے لوٹے تو جامی صاحب کے ہاتھ میں کچھ کتابیں اور اعجاز کو بھی میرے لیے تین کتابیں عنایت کیں۔ ان کتابوں کا نام پڑھ کر میں جامی صاحب سے مخاطب ہوا "آپ کونسی کتابیں لائے؟" انھوں نے کتابیں میری طرف بڑھائیں اور کہنے لگے، وہ اعجاز کی اور آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ میں نے کہا حضرت یہ تو ان کی ساعد نواری ہے ورنہ بندہ اس قابل کہاں۔

جس دن صابو صدیق المالطیفی ہال میں "وادیٔ کوکن" اور "ساحر شیوی" صاحب پر لکھے مقالے کی رسم اجراء ہونے جا رہی تھی میں اپنی بیماری کے سبب وہاں جانے سے ٹال مٹول کر رہا تھا لیکن جامی صاحب کے اصرار پر ہمت کی اور ہم کرلا سے بذریعہ ٹیکسی المالطیفی ہال پہنچے۔ وہاں کا منظر کچھ اور ہی تھا، افتخار امام صاحب، مدیر فتح پوری صاحب، انور خاں، انجم عباسی، ڈاکٹر یونس اگاسکر، نوکا نو علی، علی ایم شمسی، ظفر اقبال فتح پوری وغیرہ موجود تھے۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکی اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت ان کے ساتھ تقریباً چھ فٹ کے ررگ، چھریرا بدن رنگ گورا، سرخی مائل، سر میں گنتی کے بال لیکن سفید، بھوئیں سفید، سلیٹی رنگ کے سوٹ میں ملبوس کرسیوں کی قطاروں کے بیچ راہداری سے اگلی نشستوں کی طرف چلے آ رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر کئی ادبی ہستیاں احتراماً استقبال کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ اعجاز نے بھی ان سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ میں نے اعجاز سے پوچھا یہ کون ہیں؟ اعجاز نے کہا یہ کالی داس گپتا رضا صاحب ہیں۔ ایک لمحہ میں بھونچکاں رہ گیا۔ اتنا بڑا محقق اور ادیب کس سادگی اور بے تکلفی سے کسی سے بغل گیر ہو رہا تھا اور کسی سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ میں نے بھی اپنا نام بتا کر دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھائے۔ موصوف نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے فرمایا آپ ہیں ڈاکٹر غلام رسول ساحرؔ؟ گپتا صاحب سے روبرو یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی کیونکہ اپنی بیماری کے سبب میں اپنے بچے کو ہی ہر کام کے لیے ان تک روانہ کرتا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے نوکا علی صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے یہ ہمارے میں سال کے ساتھی ہیں۔ اور اس بے تکلفی سے گھل مل کر باتیں کرنے لگے جیسے ہم دونوں

ایک دوسرے کے لیے برسوں کے شناسا ہوں۔ مجھے اجنبیت کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوا، ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی انسان نوازی کا پیامبر تھا۔ ہم محو گفتگو تھے۔ اسی دوران عبد الاحد ساز صاحب نے انھیں آداب کر کے ہاتھ ملایا۔ پھر اپنی نشست کی طرف چلے گئے۔ اسی اثناء میں ایک شاعر انھیں ادیب ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے، دانستہ ان کا نام نہیں لینا چاہتا آکر ان کی قدم بوسی کرنے لگے۔ گپتا صاحب نے اپنے پاؤں سمیٹتے ہوئے ترش لہجے میں کہا یہ بہت چاپلوس آدمی ہے۔ ان صاحب کا چہرہ اُتر گیا۔ یک لخت جھینپ گئے اور میری کیفیت ایک ست جیسی ہوگئی۔ ان صاحب نے کہا چاچا کیا میں چاپلوس ہوں۔ گپتا صاحب نے کہا ہاں! وہ بڑے مایوسی کے عالم میں چلے گئے۔ وقت ہو چکا تھا۔ جلسے کے صدر گپتا صاحب تھے۔ کارروائی شروع ہوئی۔ گپتا صاحب کرسی صدارت پر رونق افروز تھے۔ ان کے داہنی جانب افتخار امام صاحب ماہنامہ شاعر کے مدیر اعلیٰ اور بائیں جانب نوکانو علی، علی ایم شمسی صاحب تھے۔ افتخار امام صاحب کو ماہنامہ شاعر کے توسط سے اردو کی خدمات پر یورپ کو کس رائٹرس گلڈ کی جانب سے انعام بھی دیا جانا تھا۔

پروگرام بحسن وخوبی اپنے اختتام کو پہنچا۔ گپتا صاحب کی صدارتی تقریر نے پروگرام کے آخری مرحلے کو بے حد دلچسپ بنادیا اور ان کی باتیں ادباء اور شعراء کے لیے مشعل راہ تھیں۔ پروگرام ختم ہونے پر اور دوران پروگرام بھی تصویر کشی کا سلسلہ جاری تھا۔

اس واقعے کے تین دن بعد اچانک میں نے گپتا صاحب کو فون کیا اور رسمی آداب کے بعد انھیں رسم اجراء میں پیش آئے واقعے کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے کہا صاحب آپ نے قدم بوسی کرنے والے حضرت کو بہت سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی۔ موصوف نے کہا' ساجد صاحب! انھوں نے مجھ سے بعد میں کہا چاچا آپ نے مجھے کیا کیا کہہ دیا۔ میں نے جواب دیا تم نے وقوف ہو! جب کہ تمہارا مذہب قدم بوسی کی سختی سے ممانعت کرتا ہے اور تم اس بات کو نظر انداز کر کے میرے پاؤں چھو رہے تھے۔ یہ چاپلوسی نہیں تو کیا ہے۔ غور کیجئے یہ جواب سن کر اس شخص کا احترام لازمی ہے یا نہیں جو ایک غیر مسلم ہو کر ایک مسلمان کو اپنے مذہب کی قدر دانی کا درس دے۔ یہ صاف گوئی اور ایسی جسارت جس میں مروّت، بزدلی یا شخصیت سے مرعوب ہونے کا شائبہ بھی نہیں۔ گپتا صاحب کا یہ عمل ان کے کس جذبے کی نمائندگی کرتا ہے سمجھنے کی بات ہے۔

اس کے بعد کئی ہفتے بیت گئے۔ ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہوا۔ یقیناً دو ماہ بعد ایک دن میں نے دوپہر تین بجے انھیں فون لگایا۔ ان کی اہلیہ نے بتایا وہ آرام کر رہے ہیں۔ پھر میں نے پانچ بجے دوبارہ فون کیا۔ اتفاق سے گپتا صاحب ہی موجود تھے۔ میری آواز پہچانتے ہی انھوں نے کہا، آداب۔ ان کے آداب کہنے کا انداز اتنا سریلا اور دلکش ہوتا تھا کہ طبیعت چاہتی تھی وہ آداب ہی کہتے رہیں۔ میں نے پوچھا صاحب کیا حال ہیں۔ آپ کی کچھ کتابوں کی فہرست بھیج رہا ہوں۔ کتابیں دینے کی زحمت کریں فوراً کہا بچے کو ابھی نہ بھیجیں۔ ابھی گھر کی ریپیرنگ کا کام چل رہا ہے پھر فرمایا دو دن بعد میں لندن جارہا ہوں۔ خوش صاحب پر پروگرام ہے۔ آنے کے بعد

دیکھیں گے اتنا کہہ کر فون رکھ دیا۔ اکثر جب مصروفیت زیادہ ہوتی تو دو ٹوک بات کر کے فوراً فون رکھ دیتے تھے لیکن کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ فون کرنا ان پر گراں گزرا ہے۔

موصوف جب لندن سے لوٹے تو از خود فون پر کہا بچے کو فہرست کے ساتھ بھیجئے۔ میں نے خیریت کے بعد مختصراً لندن کے حالات پوچھے موصوف نے جواب دیا۔ ساجد صاحب سب پیسے کا کھیل ہے جس سے جو چاہو کہلوالو جس سے جو چاہوں لکھوالو، ایسے بھی عقلمند ہیں جو علامہ اقبال کو "غارتِ گر ملت" لکھتے ہیں اور ہمارے ادبی رسالے ان پر نمبر مرتب کرتے ہیں۔ اب آپ خود سمجھ لیجئے۔ ہمیشہ انھوں نے سچ بات ہی کہی۔ کسی کی مروت سے خاموشی اختیار نہیں کی نہ کسی سے مرعوب ہو کر ہاں میں ہاں ملائی۔ یہ ان کی ذاتی خوبی تھی۔

میں نے فہرست بھیج دی۔ انھوں نے کئی اور کتابیں بھی اعجاز کے حوالے کر دیں۔ ان کتابوں کا مطالعہ ایک مدت کا متقاضی تھا۔ ان کتابوں میں سے مضامین کا یا مجموعہ "حرفِ مدعا" پر میری نظر پڑی اس کے فہرست مضامین میں سے "اردو زبان کی کہانی" کو پڑھا اس میں گپتا صاحب نے بتایا "ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی اصل وجہ اردو زبان تھی (حرفِ مدعا ارکالی داس گپتا رضا ص ۸۔ بار اول ۹۹ء) اور اسی طرح پاکستان کے وجود پر اردو کا احسان بتایا۔ اس طرح انھوں نے اقبال اور جناح کو اس الزام سے بری کر دیا۔ ان کا یہ بیان فکری گرہیں کھول کر اس سچائی کا انکشاف کرتا ہے۔ ان میں عصبیت کے ذرا سے بھی جذبات ہوتے تو وہ ہرگز ایسا نظریہ پیش نہ کرتے یا سیاست کی بازیگری کا شکار ہوتے، ایک مختصر سے مضمون میں اتنی بڑی بات کہنے کی ہمت نہ کرتے گویا اردو زبان کے مکالموں کے پس پشت ان کی سوجھ بوجھ نے یہ انکشاف کیا تھا جو قابل غور ہے۔

اس کتاب میں بعنوان "ہندو اور اردو ادب" (حرفِ مدعا ارکالی داس گپتا رضا، ص ۱۲۲) جو ۱۹۷۴ء کا لکھا ہوا ایک اردو ناٹک میں ہندو ادباء شعراء کی اردو خدمات کا جائزہ لیا ہے جو ناقابل فراموش ہے۔ یہ مضمون شاید اس دوران لکھا گیا تھا جب اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے کے قصیدے پڑھے جا رہے تھے۔ اس مضمون کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گپتا صاحب کو اس بات سے بہت دکھ ہوتا تھا جب لوگ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان بولتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ کہا تھا ساجد صاحب ہم کب کہتے ہیں کہ اردو ہماری زبان ہے؟ لیکن مسلمان اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں؟ اردو کے کئی بڑے بڑے ادیب اور شعراء کے بچے انگریزی تعلیم حاصل کر کے اردو سے بے بہرہ ہیں۔ اردو کی روٹیاں کھانے والے اردو سے یہ وفاداری کر رہے ہیں؟

گپتا صاحب جب متحدہ عرب امارات انڈو پاکستان سوسائٹی سے اردو خدمات پر اپنا اعزازی انعام لے کر واپس ممبئی آئے چار دن بعد میں نے فون پر ان سے پوچھا سفر کیسا رہا، انھوں نے جواب دیئے بغیر سوال کیا آج کل آپ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا اپنے تدریسی فرائض کے علاوہ ہندوستانی پاکستانی رسائل کا مطالعہ، گاہے گاہے آپ کی کتابیں بھی پڑھ لیتا ہوں۔ یہ روداد سن کر انھوں نے کہا میں نے آپ کے لیے ایک کام

یر کیا ہے۔ کچھ کام سے چھٹکارہ ہو جائے تو آپ کو بتاؤں گا۔

ایک بار کراچی پاکستان سے نکلنے والا رسالہ "سحور" میں کسی صاحب کا مضمون فراق گورکھپوری پر ہے میں آیا۔ان صاحب نے فراق کی غزلیات اور جملہ شاعری کا مختصراً جو خاکہ پیش کیا تھا بعض بیانات اور آراء ے میں متفق نہیں تھا۔ خیال آیا کہ گپتا صاحب نے بھی "انتخاب غزلیات فراق" تاریخ وار مرتب کیا ہے کیوں نہ ں کا مطالعہ کیا جائے۔ میں نے بغیر فون کیے انجار کو ان کے پاس بھیجا اور فراق پر ان کا منتخب شدہ مجموعہ کی مائش کی۔ انھوں نے بغیر کسی عذر کے وہ مجموعہ بھیج دیا۔ میں اس مجموعے کو سلسلے وار پڑھتا رہا"غزل فراق کا ر" کے عنوان میں انھوں نے فراق کے کلام پر اتنی سلیس رواں گہری بات اور فکری باتیں کا تذکرہ کیا جو اق کے کلام پر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ملاحظہ کیجئے کیونکہ ایک دانشور طبقہ ان کی پہلی شاعری کو بھی بہت اہم ما ہے۔ "وہ زبان و بیان کی باریکیوں سے واقف تھے اور انھیں عروض بھی بقدر ضرورت آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ں کے یہاں ۱۹۳۱ء تک ایسے روایتی شعروں کی بھرمار ہے جو زبان و بیان اور فن شعر کی خوبیوں سے لبریز ہیں س ان میں پاپن حال حال ہی دکھائی دیتا ہے۔' (انتخاب غزلیات فراق ارکالی داس گپتا رضا، ص ۳۰، ۱۹۹۸ء)

گپتا صاحب کی یہ رائے اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کسی بھی ادبی شخصیت کی امیج یا قد آوری کی میاد پر نکھیں موند کر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے مطالعے اور فکری نہج سے برآمد شدہ نتائج پر اپنی ائے ظاہر کرتے تھے۔

میں نے گپتا صاحب کو مبارکباد دینے کے لیے ۱۰راگست ۲۰۰۰ء کو فون کیا۔ ہیلو کہتے ہی جواباً موصوف ے آداب آداب کہہ دیا۔ میں نے کہا صاحب مبارک ہو جھے گوڑ بولے نے آپ کی کتاب کا مراٹھی ترجمہ کیا، ۴ر ست ۲۰۰۰ء کو اس کی رسم اجراء کی کامیابی مبارک ہو۔ شکریہ شکریہ کہہ کر پوچھا آپ کو اس کی روداد کا کتابچہ ملا یا نہیں، میں نے جواب دیا جی ہاں، مل چکا ہے۔ اس دوران سردار جعفری کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے، ساجد ساحب! ایک جلسے میں اکثر حضرات کی رائے تھی کہ جعفری صاحب کے لیے دعائے مغفرت کی جائے۔ میں ے کہا، آپ اس شخص کے لیے دعائے مغفرت کرنے کی سفارش کر رہے ہیں جس نے زندگی بھر خدا کا وجود تسلیم کرنا تو کجا خدا کے خلاف اپنے نظریات کا پرچار کیا۔ ان کے یہ جملے سن کر جیسے مجھ پر اک سکتہ طاری ہو گیا۔ وبارہ فون پر ہیلو سے مخاطب کیا، ساجد صاحب کیا بات ہے خاموش کیوں ہو گئے۔ میں نے کہا جی، لیکن وہ فون رکھ چکے تھے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ وہی گپتا رضا صاحب ہیں جو "علی سردار جعفری اپنی نظموں کی نظر میں" جیسی تصنیف پیش کر چکے ہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال اور پختہ ہو گیا کہ یہ دانشور ہمیشہ سچائی کا مظاہرہ کرتا آیا ہے اور حقیقت پسندی اس کی فطرت میں شامل ہے۔ پھر وہ کیسے کسی شخصیت کی شہرت یا اس کی قد آوری سے خائف ہو کر مصلحتاً خاموشی اختیار کر لیتا اور سردار جعفری کے متقدمین کیا ہر مسلمان کے لیے ان کے یہ جملے اپنے کھولے ہوئے سبق کی یاد دہانی ہے۔ گویا جو کام مسلمان کو کرنا تھا وہ بات گپتا صاحب نے بہت ہی صاف گوئی

سے ظاہر کردی۔

دہلی جانے سے دس روز قبل مجھے فون پر گفتگو کے دوران کہا، میں دہلی سے اپنے ایوارڈ کے پروگرام کے بعد پنجاب بھی جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہاں سے آنے کے بعد آپ کیلئے جو کام تجویز کیا تھا۔ اس کا مسودہ جا کر مرتب کر کے اس کی نوعیت اور اہمیت بتاؤں گا۔ تقریباً دس بارہ دن میں آجاؤں گا۔ لیکن افسوس! ۲۳ر مارچ ۲۰۰۱ء کو یہ المناک خبر ملی کہ کالی داس گپتا رضا اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس سے دو ماہ پہلے بھی ہلکا سا اٹیک کا اثر ان پر شاید آچکا تھا لیکن یہ اٹیک جان لیوا ثابت ہوا۔ اس کی موت کی خبر ملتے ہی مجھے مومن کا یہ شعر یاد آیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے   آج وہ کل ہماری باری ہے

ہر متنفس کے لیے موت سے بڑھ کر اٹل حقیقت کوئی نہیں لیکن بعد از مرگ انسان کے کارنامے اور یادیں موجودہ اور آنے والی نسلوں کو متاثر کر کے ان کے لیے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اپنے وجود کی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا کے مذکورہ واقعات اور باتوں پر غور کریں تو ان کی ایک اہم صفت سامنے آتی ہے کہ موصوف سچائی اور حقیقت پسندی، اور دیانت داری سے ہر فیصلہ کرتے اور ہر بات کہتے تھے۔ سادہ لوح تھے، جو زباں پر ہوتا وہی کیفیت دل میں رہتی تھی۔ مکاری اور عیاری، کذب و اختراع، کسی کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ یہ خوبیاں ان کی تحقیق، تنقید اور انشاء پردازی میں بھی نمایاں ہیں۔ ان کی ہر بات موقع محل پر ادا کیے ہوئے جملے یا تبصرے سے شخصیت پرست یا عقیدت مندی کا گماں بھی نہیں پیدا ہوتا کبھی کسی کی دل شکنی نہیں۔ متضاد نظریات کے ادباء شعراء کے ساتھ رہ کر ان پر تبصرے اور کتابیں لکھنے کے باوجود ان کی بات ہر بیاں صفائی کے ساتھ دوٹوک ہوتا۔ وہ تحریکات کے زیر اثر اردو ادب کے اُتار چڑھاؤ، نشیب و فراز سے واقف تھے۔ ہر خیال اور تحریک سے وابستہ شاعر و ادیب کی حوصلہ افزائی کرتے، کبھی کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے لیکن یہ تمام باتیں حقیقت پسندی کے دائرے میں کرتے۔ جہاں ان کی انانیت کا غلبہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود شعوری طور پر رومانوی اسلوب نگارش کے دلدادہ تھے۔ گو لفظی بندش، جدت ادا اور تراکیب میں عمدہ پیرایہ کا استعمال لفاظی سے گریز کر کے عیاں کرتے تھے۔ ان کی تحقیق، تنقید، انشا پردازی، شاعرانہ اصناف میں اجاگر طرز نگارش رومانیت کی نمائندگی کرے یا نہ کرے لیکن اس راہ کے مسافر ضرور تھے۔ زندگی نے ان سے یاری نہیں کی ورنہ انھوں نے ایک بار کہا تھا کہ ساجد صاحب ۷۶ رسال کا بوڑھا ہو چکا ہوں۔ غالب پر ایک مسودہ تیار ہے اور فراق پر کچھ کام باقی ہے۔ یہ دونوں کام ہو جائیں یہی میری خواہش ہے۔ لیکن ان کی یہ خواہش ادھوری رہ گئی۔ آج وہ ہمارے بیچ نہیں لیکن ان کا تحقیقی، تنقیدی، شاعری کا کل اثاثہ ہمارے ادب کا سرمایہ بن چکا ہے جس سے استفادہ کر کے ہم مزید تحقیقی راستوں کا تعین کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

Dr G R Sajid, 7 / 10, "C" Block, Vinoba Bhave Nagar,
Pipe Road, Kurla (W), Mumbai - 400 070

آہ! علامہ کالی داس گپتا رضا

کوثر صدیقی، بھوپال

علم و ادب کے چراغ کا دوسرا نام شاید کالی داس ہے۔ ایک شکنتلا کا مصنف ہو کر آفاقی شہرت کا مالک ہے تو دوسرا عہد حاضر میں ماہر غالبیات ہو کر اُفق اردو سے غروب ہونے کے بعد بھی مہر نیم روز کی طرح روشن ہے۔ کالی داس گپتا رضا فردِ واحد کا نام ہے لیکن وہ فرد واحد ایک ایسا چراغ ہے جو اردو ادب کی عالی انجمن میں پچاس سال سے زائد مدت تک روشنی کرنے کے بعد علم و ادب کے ایسے گوشے روشن کر گیا جو تاریکی میں واقع ہونے کی وجہ سے آج تک دانشوروں کی نظر سے اوجھل تھے۔ برصغیر ہند و پاک میں اور عالمی سطح پر بھی ماہرین غالبیات کی ایک طویل فہرست ہے لیکن غالبیات کے بارہ اماموں میں اگر علامہ کالی داس گپتا رضا کو بھی ایک امام تسلیم کر لیا جائے تو قاضی عبد الودود اور امتیاز علی خاں عرشی وغیرہ کے ماننے والوں کو بھی اعتراض نہ ہوگا۔

اخبارات اور رسائل کے ذریعہ عرصۂ دراز سے ان کی نگارشات پڑھ کر غائبانہ طور پر ان کی علمیت کا مداح اور معترف تھا۔ بمبئی کا سفر ہوتا رہتا تھا اور ارادہ کرنے کے باوجود ان سے ملاقات کی ہمت نہیں ہو پاتی تھی۔ ۱۹۹۷ء میں جب میرے شعری مجموعے "فصیل شب" کی اشاعت ہوئی تو بذاتِ خود پیش کرنے کے بجائے میں نے ڈاک سے ارسال کر دیا۔ میں علم و ادب کا طفل مکتب اور علامہ کالی داس گپتا رضا ساٹھ سے زائد کتابوں کے مصنف۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ اپنا قیمتی وقت صرف کر کے میرے اس شعری مجموعے کی طرف توجہ دیں گے لیکن جلد ہی انھوں نے "فصیل شب" کے پہنچنے کی مجھے صرف اطلاع ہی نہیں دی بلکہ اپنے تاثرات اور حوصلہ افزا خیالات سے بھی آگاہ کیا۔ اس طرح میرا ان سے قلمی رابطہ جاری ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی دوسری شعری تصانیف "بالۂ جرس" اور "سازِ جرس" بھی پیش کیں جسے انھوں نے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ کر میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد جب میں ایک بار ۱۹۹۹ء میں بمبئی گیا تو ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر کے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے بخوشی وقت کا تعین کر کے آنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح ملاقات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اُسی سال محترم نذیر فتح پوری ایڈیٹر "اسباق" پونہ نے جب مجھ پر خصوصی نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا اور مضامین جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو میرے دماغ میں علامہ کالی داس گپتا رضا کا نام اُبھرنا ضروری تھا۔ نذیر فتح پوری اور علامہ کے درمیان ادبی رشتوں کے علاوہ گہرے ذاتی مراسم بھی تھے جس کا مجھے علم تھا۔ میں نے مدیر صاحب سے علامہ گپتا رضا سے بھی مضمون لکھوانے کے لیے جب درخواست کی تو مدیر صاحب نے براہِ راست انھیں سے درخواست کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے نذیر صاحب سے ان کے دولت کدے پر ساتھ چلنے کے لیے کہا تاکہ میں ان کی موجودگی ہی میں علامہ سے درخواست کروں۔ ہم دونوں وقت

مقررہ پر اُن کے دولت کدے پر پہنچے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ علامہ نے مجھے اپنا تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے ایک غزل پیش کی جو انھوں نے بہت غور سے سنی۔ پھر اور سنانے کے لیے کہا میں نے تعمیل حکم میں تین چار غزلیں سنائیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بوقت سماع جیسے وہ میری غزلوں کو ادبی میزان پر تول رہے ہوں۔ غزلیں سنانے کے بعد بھی مجھے عرضِ مدعا کی ہمت نہ ہوئی۔ مبادا وہ معذوری ظاہر کردیں۔ پس و پیش کی حالت میں دیکھ کر آخر مدیر صاحب نے اظہارِ مدعا کرنے کے لیے مجھ سے کہا۔ اس پر علامہ نے کہا خیر تو ہے کیا بات ہے؟ میں نے جھجکتے ہوئے "اسباق" کے کوثر صدیقی نمبر کا ذکر کرتے ہوئے میری شاعری پر کچھ تحریر فرمانے کی درخواست کی۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب بلا پس و پیش انھوں نے فوراً قبول کرلی۔ اس کے بعد ہم دونوں نے جانے کے لیے اجازت لینا چاہی مگر دوپہر کے کھانے کا وقت ہوچکا تھا۔ انھوں نے شفقت آمیز تحکمانہ لہجے میں کہا کہ بغیر کھانا کھائے ہم لوگ نہیں جاسکتے۔ میں نے تکلف کرنا چاہا مگر مدیر صاحب نے بتایا کہ "بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست" کھانے کے وقت آپ کا دسترخوان ہر آنے جانے والے کے لیے بچھا رہتا ہے۔ کھانے کے وقت آپ ہر شخص کو بلا تکلف جو پکتا ہے، دعوت شیراز کے انداز میں اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانے میں بہت خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اسی دوران جہاں ہم بیٹھے تھے وہیں کھانا آگیا۔ مکّا کی گرم گرم مکھن میں تربتر روٹی، سرسوں کا ساگ، اچار، چٹنیاں، مٹھائی وغیرہ۔ آپ کے اس کھانے میں جو لطف آیا اور زباں نے جو لطف محسوس کیا وہ اس کی یاد کے ساتھ تازہ ہوتا رہتا ہے۔

اس کے بعد جب میں نے بھوپال سے "کاروانِ ادب" کی اشاعت کا پروگرام بنایا تو دسمبر ۲۰۰۰ء میں ان سے سرپرستی کیلئے درخواست کی جسے انھوں نے خوشی سے قبول کرلیا اور وعدہ کیا کہ کاروانِ ادب کیلئے ایسے اچھوتے موضوعات پر دو چار تحریریں دوں گا کہ آپ کے پرچے کی شہرت بہت جلد دور دور تک پہنچ جائے گی۔ کارواں ادب کا پہلا شمارہ پریس میں تھا اور اُس کے سرپرستوں میں سرفہرست انھیں کا نام تھا کہ انھیں حکومت ہند کی جانب سے پدم شری کے اعزاز سے نوازے جانے کی خبر آئی۔ میرے منہ سے فی البدیہہ یہ شعر نکلے

کارواں علم و فن کا معتبر ایک راہبر یعنی کالی داس گپتا، صاحبِ فکر و نظر
اس طرح پھیلا رہا ہے علم و فن کی روشنی جیسے جلتا ہو خموشی سے چراغ رہگذر
غالب و چکبست کے وہ گوشے اُس نے وا کیے جن پہ اہل علم کی پہنچی نہ تھی اب تک نظر

پرچہ چھپ چکا لیکن پدم شری کے اعزاز کی خبر شائع کرنا ضروری تھی اس لیے میں نے "علامہ کالی داس گپتا رضا کو پدم شری کا اعزاز" عنوان سے دو صفحاتی اضافی خبرنامہ (Supplement) چھپوا کر الگ سے شامل کرنا چاہا۔ یہ اضافی خبرنامہ چھپ کر آیا بھی نہ تھا کہ کھلے آسماں سے بجلی گر پڑنے کے انداز میں اچانک ان کے انتقال کی خبر ملی۔ ہوش و حواس سمیٹ کر اعزاز کی خبر والا Supplement خارج کرکے ان کے انتقال کی خبر "آہ! علامہ کالی داس گپتا رضا" کے عنوان سے دوسرا سپلیمنٹ چھپوا کر شامل کیا۔ ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال است

اگرچہ کاروانِ ادب کی سربراہی کے لیے اب وہ زندہ نہیں ہیں لیکن ان کی دعاؤں اور نیک خواہشات

کے طفیل میں کاروانِ ادب کا سفر کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

۲۶ر جنوری ۲۰۰۱ء کو جب انھیں پدم شری کے اعزار کی تفویض کا اعلان ہوا تب میں ممبئی میں تھا۔ اسی روز گجرات زلزلوں کے عذاب کی زد میں آگیا اور اعزاز کی خبر دب گئی۔ دو روز بعد جب مجھے معلوم ہوا تو فوراً میں نے فون پر مبارکباد دی اور حاضر خدمت ہونے کے لیے وقت مانگا۔ دوسرے دن، میں اور اہلیہ ریت النسا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بالمشافہ تحفۂ تبریک پیش کیا۔ کافی دیر تک ادبی، نیم ادبی اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ دورانِ گفتگو انھوں نے مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال کی طرف سے "ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری" پر مذاکرات کے لیے موصول دعوت نامے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں ان مذاکرات اور خطبات کے سلسلے میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔ میں نے جب وجہ دریافت کی تو بہت اصرار کے بعد انھوں نے صرف اتنا بتایا کہ بجنوری کی شناخت ان کے نسخۂ حمیدیہ کے اس پیش لفظ سے ہے جس میں انھوں نے دیوانِ غالب اور مقدس وید، ہندوستان کی دو کتابوں کو الہامی کتاب کہنے کی بات کہی ہے جبکہ یہ بات عبد الرحمٰن بجنوری کا اصل خیال (Original Thought) نہیں ہو کر کسی دوسرے کا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہی بات آپ اپنے مقالے میں مع ثبوت کے پیش کر دیجئے۔ پوری دنیا میں آپ کا نام ہو جائے گا لیکن انھوں نے میری بات یہ کہہ کر رد کر دی کہ ایسا کرنے سے بجنوری کی جو Image بنی ہوئی ہے اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا جو منظور نہیں ہے۔ میرے زیادہ استفسار کرنے پر انھوں نے صرف اتنا اشارہ کیا کہ عبد الرحمٰن بجنوری والی بات غالب کی زندگی میں ہی لکھے گئے کسی کے مضمون میں موجود ہے۔

علامہ رضا کی شخصیت ہمہ قسمی تنازعات سے پاک تھی۔ وہ عبد الرحمٰن بجنوری کے قول کی تردید کر سکتے تھے مگر تنازعات سے دور رہنا ہی پسند کرتے تھے۔ غالب نے جو "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" والی بات کہی ہے وہ ان پر حرف بہ حرف صادق آتی تھی۔ لکھنا، پڑھنا، تحقیق و تجسس، نایاب کتابیں، قلمی نسخے اور نوادرات اپنی جیب سے زرِ کثیر خرچ کر کے حاصل کرنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ انھوں نے لاکھوں روپئے خرچ کر کے منہ مانگے پیسے دے کر قریب پچیس ہزار نایاب اور بیش بہا کتابیں، مخطوطات، قلمی نسخے اور ادبی نوادرات اپنی ذاتی لائبریری میں جمع کر رکھی تھیں جن میں کئی قدیم شعراء کے قلمی دیوان، مع غالب کی اصل نگارشات کے، جو انھیں کے خط میں ہے، شامل ہیں۔ ان کی یہ لائبریری اگرچہ ذاتی نوعیت کی ہے لیکن ہر حال میں قومی اثاثہ اور اہم آثار قدیمہ ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا تحفظ ان کے گھر والوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے نام سے کوئی ٹرسٹ قائم کر کے اس اثاثے کی نگہداشت کی ذمہ داری کوئی ذمہ دار ادارہ سنبھالے۔ یا کسی یونیورسٹی میں ان کے نام کی "چیئر" (Chair) قائم کر کے یہ قیمتی اثاثہ محفوظ عوامی ہاتھوں کو سپرد کر دیا جائے تاکہ اس کی حفاظت بھی ہو سکے اور تشنگانِ علم و ادب کتابوں کے اس بحر ناپید کنار سے سیرئ فکر و ذہن بھی کر سکیں۔

☆☆☆

79 - A, Ginnori Main Road, Bhopal - 1 M P

کالی داس گپتا رضاؔ کی حق نوائیاں

قمر گونڈوی

۱۹۸۲ء کی بات ہے جب میں پہلی بار ملک سے باہر ارباب پورٹ ویلفیر سوسائٹی کے مشاعرے میں کراچی گیا تھا۔ انھیں دنوں یاد رہے اس سے پہلے میری ملاقات سردار پنچھی سے ہو چکی تھی۔ وہ زور و شور سے بمبئی میں "اک چادر میلی سی" فلم کے گانے لکھنے میں مصروف تھا۔ میری واپسی پاکستان سے ہو چکی تھی۔ کامیابیوں کے جھنڈے مشاعرے میں گاڑ کے آیا تھا۔ پنچھی نے داؤں پیچ چلا کر قمر صاحب جلال آبادی کے جشن کا مشاعرہ جو پاٹکر ہال بمبئی میں ہوا تھا، ملوا لیا۔

مشاعرے کی ڈائز پر قمر جلال آبادی، کالی داس گپتا رضا (صدر مشاعرہ) غالباً کوئی مسلماں منسٹر اور سردار پنچھی سر پر پگڑی باندھے کالی شیروانی، تنگ مہری کا پائجامہ پہنے بڑی آن بان سے رضاؔ صاحب کے بالکل بغل سے بار بار مونچھوں اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے، مونچھوں کو مزید نوکدار بناتے نظر آرہے تھے۔ سامعین مشاعرہ پر رعب ڈالنے کی خاطر صدر مشاعرہ کالی داس گپتا رضا صاحب سے کھسر پسر کرنے سے باز نہیں آرہے تھے۔ قمر جلال آبادی نے دو ایک بار ان کی اس حرکت پر گھورا بھی مگر کالی داس صاحب تو اللہ میاں کی گائے تھے جو چاہے جیسے چاہے انھیں استعمال کرے۔ بیحد شریف النفس تھے۔ اسی کا فائدہ پنچھی اٹھا رہے تھے۔

میں نے ۱۹۸۲ء میں پہلی بار انھیں بمبئی میں دیکھا، سنا اور موصوف کی شخصیت سے بیحد متاثر ہوا۔ میں نے بعد مشاعرہ پنچھی سے کہا یار مجھے بھی رضاؔ صاحب سے ملوا دے تو اس نے اک اچھا سا تعارف کروا کر مجھے کالی داس گپتا رضا سے ملوا دیا۔ رضا صاحب بات کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے۔ سنبھل سنبھل اور سوچ کر بولتے تھے۔ شاید انھیں ہر گھڑی اس کا احساس رہتا تھا کہ میرے مخاطب کو میری کسی بات سے تکلیف نہ پہنچ جائے۔ موصوف میں مرتے دم تک یہی عادت رہی۔ وہ بزرگ قلم یا بہت پڑھے لکھے یا بہت بڑے آدمی والا رعب نہیں جتاتے تھے حالانکہ وہ واقعی بہت بڑے ماہر قلم تھے۔ دریائے علم و عرفاں تھے۔ بمبئی کے بیحد رئیسوں میں شمار تھا۔ معیاری شاعر تھے۔ فارسی، انگریزی، ہندی، اردو، جرمن، عربی بخوبی جانتے اور سمجھتے تھے۔ میرؔ کی شاعری پر بولنے لگتے تو علم و ادب کے دریا بہا دیتے۔ حافظ شیرازی کی باتیں کرتے تو لگتا فارسی زباں ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ مجروح مرحوم سے جب بھی باتیں کرتے تو عرفیؔ یا حافظؔ کا کوئی شعر پڑھتے اور اس شعر کی اردو میں غلط شرح کرتے۔ مجروح اکڑوں اور بھولے بھالے سمجھ ہی نہ پاتے رضاؔ نے انھیں چھیڑنے اور دیر تک بولتے رہنے کی خاطر یہ شرارت کی ہے۔ بس مجروح بھائی شروع ہو جاتے اور صبح سے شام ہو جاتی،

دے چائے پہ چائے، اور بحث و مباحثہ۔ کھانا ملازم نے لگا دیا تو کھا لیا ورنہ اس بحث میں نہ تن کا ہوش نہ گھر کا خیال نہ دوسرے مہماں کی پروا۔ "آرڈر تھا کہنا ہیں نہیں"۔ میں مجروح بھائی کے گھر تھا اور یہ بحث سنتے سنتے تھک گیا کہ اتنے میں فون آیا تو مجروح بھائی نے جواب دیا "اجی وہ ہفتوں پہلے آئے وعدہ کر کے گئے جلد ملوں گا لیکن پھر لوٹ کر نہیں آئے، اتنا کہہ کر فون دھر دیا تو رضا صاحب نے پوچھا کون تھا۔ اماں وہی تمہاری والی تھی۔ رضا صاحب نے ہنس کر پوچھا میری والی کون ہے صاحب؟ مجروح بھائی نے جواب دیا آپ کی اہلیہ محترمہ ستی ساوتری آپ کے انتظار میں کھانا لیے بیٹھی ہیں۔ ہائے وہ دن وہ وقت یاد کر کے کلیجہ منہ کو آجاتا ہے اور جب ۹ ر ستمبر ۱۹۶۰ء کو جگر مرادآبادی نے گونڈہ میں بعد بیماریٔ مختصر رحلت فرمائی تو میری آنکھوں میں دنیا اندھیری ہو گئی۔ مجروح بھائی فرماتے تھے ۱۹۳۰ء میں جگر مرادآبادی اپنا گھر بار اپنے پرائے چھوڑ کر گونڈہ چلے آئے اور اصغر گونڈوی کے ساتھ رہنے لگے۔ اصغر نے اپنی چھوٹی سالی نسیم صاحبہ سے ان کا عقد کرا دیا مگر جگر صاحب گھریلو ذمہ داریاں سنبھال نہ سکے لہٰذا اصغر صاحب ہی کے کہنے پر نسیم کو طلاق دیدی۔ طلاق پڑنے کو تو پڑ گئی مگر جگر اس صدمہ کو برداشت نہ کر پائے۔ ان کی غزلوں میں ہجر و وصال، رنج و الم نے وہ کرب بھر دیا کہ ان کی غزلیں شہروں شہروں بے ہاتھ پاؤں کے دوڑنے لگیں۔ پورے ملک کیا برصغیر میں مشہور ہو گئیں۔ جگر کو نسیم کی جدائی کے غم نے عالمگیر شاعر بنا دیا یا یوں کہیے جہانگیر بنا دیا۔

جگر صاحب کے منہ بولے بیٹے یعنی معنوی فرزند کرشن چندر حیرت گونڈوی کا دم گونڈہ میں جگر صاحب کے بعد غنیمت تھا مگر وہ بھی جلدی داغ مفارقت دے گئے تو مجھے پھر سوکھے پھول کی بیماری لگی۔ کچھ دنوں سینہ کوبی کرتا رہا۔ کہتے ہیں وقت غموں کا پھاہا ہے تو جھوٹ نہیں کہتے۔ واقعی کچھ دنوں بعد جدائیوں کے زخم بھرنے لگے۔ پھر ایک فکر دامن گیر ہوئی جگر اور حیرت جیسے کسی شاعر کو پھانس کر اس مرثیے سے اداس دلوائی جائے تو نظر انتخاب بمبئی میں مجروح سلطانپوری پر جا ٹکی۔ وہ اس لیے کہ مجروح، جگر صاحب کے ساتھ ایک عرصہ گونڈہ میں رہ چکے ہیں۔ لہٰذا تھوڑا بہت مجھے جانتے بھی ہیں۔ میں ان کے بھولی مزاج سے واقف تھا لہٰذا تیر سیدھے نشانے پر لگا۔ وہ کیسے تو دیکھیے۔ "اسباق" پونا اکتوبر تا مارچ ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۱ء یا پھر علی گڑھ کا "قوس قزح" مئی ۲۰۰۱ء یا گلابی کرن دسمبر ۲۰۰۰ء یا "ارتقا" کراچی، دسمبر ۱۹۹۸ء۔

بہرحال میں مجروح کے اتنے قریب ہو گیا کہ ان کے گھر کا ایک فرد بن گیا اور انھیں کے حوالے سے عزت مآب کالی داس گپتا رضا صاحب کی قربت حاصل ہو گئی۔ مجروح بھائی کی خصلت تھی فون کر کے مجھے بمبئی کے بڑوں سے ملواتے تھے۔ میری تعریف بھی کرتے تھے۔ ایک دن کھانے سے فارغ ہو کر اپنا پانداں کھولا۔ پان لگایا پھر پاندان میری طرف سرکاتے ہوئے رضا صاحب سے بولے (اس گھڑی نوشاد بھی موجود تھے) قمر بہت ذہین ہے۔ صاحب اس نے اپنے محلہ کا نام بدل کر کوچہ جگر کر دیا یعنی جگر کے ساتھ ہمیشہ قمر لگا رہے گا۔ کالی داس گپتا مجھے للچائی للچائی پیار کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ چائے کے بعد محفل برخاست ہوئی۔ میں بھی چلا

آیا۔ میں ان دنوں ابو صالح انصاری (بالو میاں) پروپرائٹر منشی ٹرانسپورٹ کمپنی کے یہاں ٹھہرا تھا۔ میرے ساتھ پروفیسر وارث کرمانی بھی تھے جنھوں نے خدا جانے کیوں نوشاد کی محفل میں مجھے بٹھا دیا جبکہ نوشاد کا مذاق اور ہے اور میرا مذاق اور۔ (بحوالہ ممدوح سلطانپوری نمبر جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء، نوائے ادب، بمبئی)

مجھے نوشاد کی ایک حرکت پر روحانی اذیت پہونچی۔ اگر میں ان کا خط چھپوا دوں تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ یہ واقعہ دسمبر ۱۹۹۶ء بوقت جشن "حافظ" بمبئی ممدوح صاحب کے گھر ایک دعوت خاص کا ہے اور بڑا تاریخی واقعہ ہے۔ اس دعوت میں ممدوح بھائی نے کالی داس گپتا رضا کو بھی فون کیا۔ پتہ چلا موصوف فارم میں ہیں تو ممدوح بھائی نے جھلا کے کہا "یہ گپتا چلے بہت جاتے ہیں"۔ اس فقرہ پر ہم سب ایک ساتھ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ پروفیسر ولی الحق انصاری، پروفیسر وارث اور ہم حاشیہ تدیل ممدوح بھائی نے مجھے لکھا ہاتھ میں رعشہ سے قلم پکڑا نہیں جاتا۔ دروازے پر کام لینے والوں کی قطار لگی رہتی ہے مگر تمھیں میری پریشانی سے کیا لینا دینا۔ کچھ ایسا ہی خط میں نے اس کا ذکر جان بوجھ کر رضا صاحب سے کیا۔ پہلے تو انھوں نے اپنی موٹی تہہ دار قریب گردن گھما کر دیکھا پھر موٹے دل والی عینک سے مجھے جھانکا پھر بولے بمبئی برلس کا بین الاقوامی سنٹر ہے۔ جو قدم اٹھانا سمجھ بوجھ کر اٹھانا۔ یہ کہہ کر نہیں سے کچھ گاڑی چلتی رہی۔ کئی چوراہے پر چوراہا آتا رہا۔ سکوت ٹوٹا۔ موٹی اور بھرائی آواز سے بولے تم فلاں شاعر (میں نام لینا نہیں چاہتا) سے بہت ملا کرتے ہو۔ وہ آدمی ٹھیک ہے کہ نہیں میں نہیں جانتا لیکن ممدوح صاحب اسے پسند نہیں کرتے اور گاڑی جل درشن پر آکر تھم گئی۔ بولے کھانا کھاؤ گے۔ میں نے عرض کیا بعد نماز ظہر کھانا ہے۔ بولے اچھا جاؤ اور میں ان کی نصیحتوں پر غور کرنے لگا۔ بالکل ٹھیک کہا رضا صاحب نے۔ اللہ نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔ میں ان کا احسان مند ہوں ورنہ آج جو ہوں وہ بھی نہ رہتا۔ ویسے تو میں حضرت کالی داس گپتا رضا صاحب کو بہت دنوں پہلے سے جانتا تھا جب عبدالحمید خاں نوہیرے رسالہ "صبح اُمید" بمبئی سے نکالتے تھے۔ اسی "صبح اُمید" میں رضا صاحب کی غزلیں شائع ہوتی تھیں اور میری بھی تو اس طرح بذریعہ "صبح اُمید" میں ان کے نام سے اور کلام سے بخوبی واقف تھا۔ دو بدو کی ملاقات نہ تھی۔ مجھے رضا صاحب اس لیے اچھے لگتے تھے کہ ان کے کلام میں روحانیت، معرفت، تصوف بہت تھا۔ ہم گونڈہ باسیوں کو ایسا کلام بہت پسند ہے۔ ایک روز کی بات ہے کہ ایک تصوف آمیز غزل چھپ کر آئی۔ میں نے غزل پڑھی۔ شام پانچ بجے جب جگر صاحب کو سلام کرنے گیا (جگر صاحب کا مکان میرے گھر سے دو سو قدم پر ہے اور مزار جگر سو قدم پر) تو ہاتھ میں "صبح اُمید" بھی لے گیا۔ خدا جانے کس جذبہ کے تحت رسالہ کھول کر جگر صاحب کے روبرو کالی داس گپتا رضا صاحب کی غزل کر دی۔ جگر صاحب اپنے کمرے میں آرام کرسی پر پیر پسارے تن تنہا کسی خیال میں گم سم بیٹھے تھے۔ رضا صاحب کی غزل پڑھنے لگے اور دیر تک خاموش رہنے کے بعد فرمایا رضا بہت اچھا کہتے ہیں۔ میں لاہور میں ان سے مل چکا ہوں اور چپ ہو گئے۔ جب بغرض علاج ممدوح صاحب کے یہاں بمبئی گئے تو خدا جانے انھیں کالی داس گپتا رضا کیسے یاد آ گئے۔ ممدوح بھائی سے

پوچھا تم واقف ہو تو مجروح بھائی نے جواب دیا کبھی کبھار مشاعروں میں عہدۂ صدارت پر نظر آتے ہیں۔ جگر نے فرمایا "کنوا (جگر صاحب میرا یہی نام لیکر مجھے پکارتے تھے) رضا صاحب کی چھپی غزل لایا۔ میں نے پڑھی۔ طبیعت خوش ہوگئی۔"

میرا خیال ہے جگر صاحب کے اس کہنے کے بعد مجروح بھائی پر اس کا گہرا اثر ہوا اور دونوں آپس میں گہرے اور تہہ دار دوست بن گئے کیونکہ مجروح کے یہاں بھی تصوف بھرا پڑا ہے۔ علاوہ اس کے دونوں فارسی کے عالم تھے۔ حضرت کالی داس گپتا رضا کی نظر انتخاب اقبال صاحب پر کیوں ٹھہری لیکن رضا کو صوفی ازم سے لگاؤ ہے اور اس کی چاشنی انہیں کشاں کشاں سر ڈاکٹر محمد اقبال کے قریب لے گئی کیونکہ اسلامیات کی شاعری میں تصوف اور صوفی ازم کا صحیح رجحان اگر کہیں ملتا ہے تو وہ اقبال ہیں۔ محمد اللہ رضا صاحب نے اقبال پر کام کر کے اقبال کو نہیں اپنی مرزل پالی جس کے لیے اللہ نے انہیں پیدا فرمایا تھا۔ کالی داس گپتا صاحب نام کے کالی داس گپتا تھے لیکن نہ وہ ہندو تھے نہ مسلمان، نہ سکھ نہ عیسائی۔ وہ قلندر تھے، صوفی تھے، مست تھے اور ایک محنت کرنے والے سچے خوش فکر زمانہ سے بے نیاز انسان تھے۔ ان کے ایک مضمون کا اقتباس میرے دعوے کی ضمانت ہے، فرماتے ہیں

"ایک سکھ نعت رسولؐ سے اپنے مجموعہ کلام کا آغاز کرے۔ ایک ہندو (کالی داس گپتا رضا) اس پر پیش لفظ لکھے۔ ایک مسلمان کتابت سے لیکر جلد بندی کے مراحل تک آسانی سے گزرے۔ پہلی نظر میں ایسا لگتا ہے یہ تینوں اپنے اپنے دھرم سے پھر گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں نے اپنا اپنا دھرم نبایا ہے اور اس طرح اردو زبان کو تقویت پہونچائی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

مجھے ان کی نیک نفسی اور شرافت کا بخوبی پتہ ہے اور اعتبار۔ اس لیے ان سے کہا یا خط لکھا مجروح بھائی اپنے ہاتھ سے اپنی تاریخ پیدائش مجھے لکھ کے دے گئے اور آپ سنہ پیدائش بدلنے کے درپے ہیں۔ کیا آپ میری تحقیقی کتاب کی ایسی تیسی کرنے پر تلے ہیں۔ لکھنے کو تو میں نے جھنکے میں لکھ دیا لیکن رضا بھائی نے اتنے پیار بھرے لہجہ میں جواب دیا کہ میرا سارا غصہ ہرن ہوگیا اور میں خود پر بیحد شرمندہ ہوا۔ انھوں نے فرمایا اگر تمہیں مجروح سلطانپوری کی تاریخ پیدائش جس پر تم چراغ پا ہو یقین نہیں آتا تو اس پر ایک مضمون مجھے لکھ کر بھیج دو میں پونا سے چھپوادوں گا حالانکہ میں نے مجروح کی بہن سے مشورہ کر کے مجروح کی تاریخ پیدائش مقرر کی ہے۔

اللہ اردو کے صدقہ میں (جس میں ہمارا دین منتقل ہوچکا ہے) ان پر مہرباں رہے اس کی روح کو سکون عطا فرمائے۔ رضا صاحب نے "اسباق" کے ایڈیٹر سے کہہ کر وہ مضمون مجروح بھائی کی برسی کے موقعہ پر شائع کرادیا۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ اب وہی صحیح کہا جائے گا مجروح اپنی زندگی میں جو اپنے قلم سے لکھ گئے ہیں ورنہ اور کوئی دوسرا بڑا قلم کار ہوتا تو وہ اپنی بات منوانے کی خاطر روس اور امریکہ کا بم لاکر مجھ پر داغ دیتا۔ رہی بات

اپنے ہی قلم کے خلاف مضمون شائع کرانے کی تو یہ کام بڑے دل گردے کا ہے لیکن سچے لوگ سچ ماں لینے میں دریغ نہیں کرتے حتکہ انڈو پاک کے ایک عظیم ناقد علم و فن حضوں نے بغیر میری اجازت، بغیر میری کتاب کے حوالے، ہندو پاک کے رسائل میں مسلسل میری کتاب کے اقتباسات شائع کرا کرا کر بڑے سے چھوٹے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ زیادہ بولوں تو مار کھاؤں مگر ایک شعر کہہ کر چھاتی پر پتھر رکھ کے صبر کرلیا

وقت کردیتا ہے سب کے قصے پاک   اس کے آگے سر نگوں چنگیز ہے

لیکن اللہ نے چاہا تو وہ دن دور نہیں جب شرم سے ان کی گردن جھک جائے۔ معاملہ طول پکڑ رہا ہے کراچی کے ایک مشاعرے میں بھائی جمیل الدین عالی صاحب نے اسی طرح کی گفتگو میں فرمایا "اچھا یہ مال آپ کا ہے وہ آپ سے اجازت کیوں نہیں لیتے ؟" میں نے عرض کیا "کسی آسماں کو ایک زمیں کے ذرے سے اجازت طلب کرتے دیکھا ہے" تو قہقہہ مار کر ہنس کے مجھے سینے سے لگا کر بولے میں فون کروں گا۔

مضمون کے آخر میں میں رضا صاحب کے ایک خط کا اقتباس جو بڑا کرب ناک ہے، پیش کر کے اجازت چاہوں گا

"ممبئی 28 / 9 / 2000

محب و مکرم تسلیم

میں England سے واپس آیا تو آپ کا کرم نامہ ملا۔ آپ اگر اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اردو رسائل اور اخبارات میں میرا بڑا اثر و رسوخ ہے تو یہ قطعی غلط ہے۔ اردو اخبار (ممبئی) نہ میرے تعلق سے کوئی خبر چھاپتے ہیں نہ میری تحریریں۔

پونا کا ایک رسالہ "اسباق" البتہ میری سرپرستی میں چھپتا ہے۔ اگر آپ کو منظور ہو تو آپ کا مقالہ (ممدوح صاحب سے متعلق معہ تصویر) اس میں (چھپا) سکتا ہوں۔ زیادہ طویل ہوگا تو یا مختصر کرنا پڑے گا یا اسے دو قسطوں میں چھاپا جاسکے گا مگر ایسی حالت میں اس کا تاثر وہ نہیں رہتا۔ ممدوح صاحب اور جعفری صاحب سے میری گہری دوستی تھی مگر چونکہ وہ علمی و ادبی تھی اس لیے ان کی نمائش حال خال ہی ہوتی تھی۔ آج کل ہر کوئی یہاں اپنے آپ کو ان ہر دو مشاہیر کا قریبی ثابت کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اور کوشش کی جارہی ہے کہ میرے حضرت ممدوح کے تعلقات کو جھوٹ کہہ کر منسوخ کیا جائے۔ آپ تو خوب جانتے ہیں، گپتا تحقیق کا آدمی ہے۔ اسے حق دل و جاں سے پیارا ہے۔ اس لیے چھوٹے افکار مجھ سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

آپ کے دونوں شعر بہت پر لطف ہیں۔ "لاریب" میں آپ کی ایک تحریر پڑھی تھی خوب بلکہ بہت خوب ہے۔ تاہم مزید تحقیق کرلی جائے تو اچھا ہو۔   مخلص رضا۔

☆☆☆

کوچہ جگر، گونڈہ، یو پی

فارم ۱۷

نام "اسباق"	نوعیت اشاعت تیں ماہ
پرنٹر نذیر فتح پوری	قومیت ہندوستانی
پتہ سائرہ منزل، 230/B/102، وِمان درشن، لوہ گاؤں روڈ، پونہ	نام پبلیشر نذیر فتح پوری مالک نذیر فتح پوری
مدیر نذیر فتح پوری	قومیت ہندوستانی

پتہ سائرہ منزل، 230/B/102، وِمان درشن، لوہ گاؤں روڈ، پونہ

میں نذیر فتح پوری تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

उनका जो फर्ज है अरबावे सियामत जाने

मेरा पैगाम मुहब्बत है जहा तक पहुचे

शायरी की दुनिया

पूना से शाय होने वाला एक अदबी रिसाला

चीफ एडिटर - सुरेश चंद्र सुरतवाला

एक्झीक्यूटिव्ह एडिटर - सय्यद आशिफ

फी शुमारा : १५ रू

शोअरा से गुजारिश है कि अपनी ताजा गजले रवाना फरमाए

राब्ता

Suresh Chandra Suratwala

112/B, Patil Plaza,

493, Parvati, Pune - 411 009

Ph. : 4441264

روبرو

کالی داس گپتا رضا سے ایک ملاقات

کالی داس گپتا سے ایک ملاقات

افتخار امام صدیقی

افتخار آپ کی شخصیت، شاعری، تحقیقی کام اور ادب و موسیقی پر آپ سے تفصیلی گفتگو کرنے کی خواہش مدت تھی۔ اب شاعر میں آپ پر گوشے کی اشاعت نے یہ موقع فراہم کر دیا۔ میں چاہوں گا کہ سب سے پہلے آپ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں وہ باتیں بتائیں جو آپ کی آپ بیتی میں نہیں آسکی ہیں یا پھر جو قارئین اور ادب کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے ضروری ہیں۔

رضا ہمارا خاندانی پیشہ ساہوکاری ہے یعنی روپے کا لین دین۔ کسی زمانے میں بڑے پیمانے پر گڑ اور شکر کی تجارت بھی ہوتی تھی مگر یہ چار پشت پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد میرے بزرگوں نے صرف ساہوکاری پیشے کو اختیار کر لیا اور تب سے آج تک ہم یہی ایک کام کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں کبھی کبھی جنس کا بھی کاروبار ہوتا رہا لیکن اب جنس کی جگہ مکانوں نے لے لی ہے لیکن ہمارا روپے پیسے کے لین دین کا کام اب تک چل رہا ہے۔ میں نے اسی ماحول میں پرورش پائی۔ ہماری کھیتی بھی تھی اور بہت اچھی بھی تھی۔ اس میں بھی ہمیں خوب پیسے کا موقع ملا ہے۔ ہم یہ کام تو نہیں کرتے تھے، بہر حال ہمارے پاس یہ کام تھا یعنی ہمارے پاس بہت سی زمیں تھی۔ میرے دادا اردو سے تقریباً ناواقف تھے۔ اور ان کے کوئی بھائی یعنی میرے دادا کے چھوٹے بڑے بھائی بھی اردو زبان سے ناواقف تھے۔ معمولی شدھ بدھ انھیں ہوگی لیکن میرے والد اردو و فارسی کے عالم تھے۔ وہ پڑھے لکھے بھی خوب تھے۔ گورنمنٹ کرسچین کالج لاہور کے گریجویٹ تھے۔ لمبی عمر پائی انھوں نے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اردو فارسی کی لگن مجھے وہیں سے ملی ہے۔ میں نے انھیں شعر کہتے کبھی نہیں سنا لیکن انھیں بہت زیادہ شعر یاد تھے۔ فارسی کے کیا، اردو کے کیا۔ کبھی کبھی ہمیں کوئی چیز لغت میں نہیں ملتی تو ان سے پوچھتے اور وہ بتا دیتے تھے۔

افتخار کچھ اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیے۔

رضا ہمارے یہاں ایک پرائمری اسکول تھا جو بہت پرانا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ ۱۸۶۰ء کے قریب۔ پھر مکند پور میں ایک مڈل اسکول قائم ہو گیا۔ پھر جب ہم پڑھ چکے تو ہائی اسکول میں داخل کیے گئے۔ میں نے اپنی پہلی نظم اسی ہائی اسکول کے جلسے میں پڑھی تھی۔ اسی اسکول میں بڑے اچھے اچھے منشی اردو، فارسی کے تھے۔ اس زمانے میں بڑا رواج تھا پنجاب میں اردو، فارسی کا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا تو باہر سے ہمارے یہاں انسپکٹرس آف اسکول آیا کرتے تھے جن کو بابو جی کہا کرتے تھے۔ ہم یہ کہتے تھے کہ آج بابو جی آنے والے ہیں۔ انھوں نے ایک بار املا کے طور پر ایک عبارت لکھوائی۔ ہمارے یہاں اس کی بڑی مشق کروائی جاتی

تھی یعنی ایک صاحب بول رہے ہیں اور ہم لکھ رہے ہیں۔ تو جب املا لکھا جاچکا اور سب کی تختیاں دیکھی گئیں تو ایک تختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ لڑکا کون ہے، کھڑا ہو جائے۔ میں اٹھا، چھوٹا سا تھا لہٰذا مجھ سے کہا گیا کہ میز پر کھڑے ہو جاؤ۔ تب انھوں نے پوری کلاس کو اور ٹیچروں کو بتایا کہ یہ لڑکا اتنا ہوشیار ہے، قابل ہے کہ یہ "بچے" کے ہجے بھی جانتا ہے اور اس نے صحیح لکھا ہے گویا پہلی جماعت میں "بچے" کی صحیح ہجے لکھنا کتنا اہم تھا مجھے آج تک یاد ہے۔ پہلی جماعت کی اردو کی کتاب میں ایک سبق تھا کہ "بچہ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ حقہ پی رہا ہے اور اس کا بچا مسہ میں ہے"۔ "بچا" ہائے ہوز کے ساتھ میں نے صحیح لکھا تھا جبکہ کسی اور بچے نے درست نہیں لکھا تھا اور اس کی بڑی تعریف ہوئی۔ میں جب پہلی جماعت میں تھا تو اسی دوران ہمارے رشتے دار جب گھر آیا کرتے تھے تو حیرت و استعجاب کے عالم میں میرے سامنے اخبار رکھ دیا کرتے تھے۔ ملاپ، پرتاپ وغیرہ اور کہتے تھے کہ اس کی خبریں پڑھ کر سناؤ۔ میں اس وقت اخبار بڑی روانی سے پڑھ سکتا تھا۔ جماعت اول سے مجھے اس طرح کا ماحول ملا اور اردو زباں میرے ذہن میں رچ بس گئی۔ ہمارے یہاں تعزیہ بڑی شان سے نکلا کرتا تھا۔ خاندان ہمارا آریہ سماجی تھا۔ اس کے باوجود سو سال سے ہمارے یہاں ایک روایت چلی آرہی تھی کہ ہم تعزیئے کے لیے سبیلیں لگایا کرتے تھے۔ کنوئیں پر جہاں ہم اور ہمارے والد صاحب بھی کھڑے رہتے تھے۔ پانی پلانے کے لیے۔ وہاں ذرا زیادہ کشادہ جگہ تھی لہٰذا وہاں آکر تعزیہ ٹھہرا کرتا تھا، قیام کرتا تھا، نوحے پڑھے جاتے تھے۔ نوحے میں نے بہت سے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ شعر کہنے کی عادت بھی مجھے انہیں سے ملی۔

افتخار یہ رضا تخلص آپ نے کیوں کر اختیار کیا؟ کیسے اس تخلص کا انتخاب کیا آپ نے؟

رضا کسی نے انتخاب نہیں کیا۔ میں نے خود ہی اختیار کیا ہے۔ بس خیال آیا اور میں نے رکھ لیا۔ اور میں بہت چھوٹا تھا۔ اس وقت غالباً تیرہ یا چودہ برس کا رہا ہوں گا۔ رضا کے بارے میں ایک بات اور بتادوں کہ میں رضا، 'ر' کی زیر سے لکھتا ہوں نہ کہ ر کی زبر سے۔ اگرچہ بہت سوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ 'ر' کی زبر ہی سے درست ہے لیکن عربی کے لحاظ سے رضا ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ 'رَضا' جو ہے وہ فعل ہے اور فعل تو تخلص نہیں ہو سکتا لیکن عام طور پر 'ر' کی زبر ہی سے لوگ رضا بولتے ہیں۔

افتخار شعر گوئی کی ابتدا گویا اسکول کے زمانے ہی سے شروع ہو گئی تھی؟

رضا جی ہاں ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء میں جارج پنجم کا انتقال ہوا تھا۔ اور میں نے اس پر ایک مرثیہ لکھا تھا، اس وقت میں گیارہ سال کا تھا غالباً۔

افتخار اسکول سے کالج تک کے تعلیمی سفر کے بارے میں بتایئے۔

رضا مجھ سے کہا جارہا تھا کہ میں افریقہ چلا جاؤں۔ افریقہ جانے کے لیے ویزا اور پاسپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں خاصی تاخیر و تگ و دو کی وجہ سے میں افریقہ جانے سے رہ گیا۔ غالباً فرسٹ

ایر میں گیا تھا۔ چند ایک مہینے اور پھر چھوڑ دیا۔ اسی اثناء میں میں نے منشی فاضل اور منشی ادیب کا امتحان دیدیا۔ آرر اں اردو، آرر اں پر شین۔ اس سے ایک بڑا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ پرانی فارسی سے واقفیت ہو گئی۔ اردو لٹریچر سے واقفیت ہو گئی۔ پرانی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ میرے والد صاحب کی چھوٹی سی لائبریری تھی۔ وہ کتابوں کے بڑے شوقین تھے۔ میں چپکے کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ وہ بھی خوش رہتے تھے اس بات سے۔ کبھی برا نہیں مانا۔ وہ کہتے تھے کہ رزق چھوڑ کر یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔

افتخار اس دور میں کس طرح کی کتابیں آپ کے مطالعہ میں آئیں؟

رضا اس وقت والد صاحب کی لائبریری میں بعض کتابیں بہت پرانی تھیں۔ کچھ مذہبی بحث و مباحثے کی کتابیں بھی تھیں۔ جس کا بڑا رواج تھا۔ پنجاب میں۔ اس میں "سوامی دیانند کا جیون چتر" جو اردو میں لکھی ہوئی تھی اور کافی ضخیم کتاب ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ فارسی کی مشہور کتابیں 'انوار سہیلی، گلستاں، بوستاں، مجھے میرے والد صاحب نے پڑھ کر سنائیں اور سمجھائیں۔ انوار سہیلی ایک مشکل کتاب ہے۔ اس سے مجھے جو فائدہ پہنچا میں اسکول میں نہ اٹھا سکتا تھا۔

افتخار آپ کی ذہنی نشو و نما میں ان کتابوں نے خاصہ اہم کردار ادا کیا۔

رضا نہ صرف ذہن بنا بلکہ فارسی زبان کا مزاج، اردو کی گنگا جمنی تہذیب ذہن میں آئی۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ آریہ سماجی بن جایئے، وہابی بن جایئے، اردو کا اپنا کلچر ہے جو بالکل الگ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کے لیے بالخصوص شمالی ہندوستان کے رہنے والوں کے لیے اردو کا سیکھنا بہت ہی ضروری ہے۔ میں ہمیشہ اپنے رشتے داروں سے یہی کہا کرتا ہوں کہ کسی اور وجہ نہ سہی کم از کم شمالی ہندوستان کے مزاج کو سمجھنے کے لیے اردو ضرور سیکھیے۔ اس سے زبان بنتی ہے، مزاج بنتا ہے، ایک تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ جس سے ہم نابلد ہوتے جارہے ہیں۔ جس طرح کی زبان اس وقت بولی جارہی ہے وہ تو کچھ بھی نہیں لگتی۔

افتخار جوش صاحب سے آپ کے تعلق یعنی استادی و شاگردی کے سلسلے میں بعد میں گفتگو کریں گے لیکن یہ بتایئے کہ اس وقت پنجاب میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں آپ شرکت کرتے تھے تو کون کونسے شعراء نمایاں تھے؟

رضا مجھے مشاعروں سے دلچسپی کم رہی اور میں بہت ہی کم ان میں شرکت کرتا تھا۔ ہاں مطالعے کا بیحد شوق تھا لہٰذا پڑھنے کی طرف زیادہ مائل رہا۔ ہاں ایک بات یہاں ضرور بتاتا چلوں کہ پھر کہیں ذہن سے نہ نکل جائے۔ یہ اس لیے نہیں بتا رہا ہوں کہ آپ کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ محض اس لیے کہ وہ بھی ایک دور تھا۔ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکا تھا اس کا نام تھا سادھو رام۔ یہ شخص حلوائی تھا۔ ہاں یاد آیا کہ سادھو رام کی پھوپھی جوش صاحب کو بیاہی ہوئی تھیں۔ عرش ملسیانی صاحب کا ننھیال ہمارے گاؤں میں ہی تھا۔ سادھو رام کے یہاں 'شاعر' آیا کرتا تھا۔ میں نے دیکھا تو مجھے شاعر اچھا لگا۔ میں نے سادھو رام سے پوچھا کہ کیا شاعر

باقاعدہ منگاتے ہو؟ بولے ہاں۔ میں نے کہا کہ رسالہ آیا کرے تو مجھے دیدیا کرنا۔ میں گاہے گاہے رسالہ پڑھتا رہا۔ اس وقت شاعر میں سیماب صاحب کی اصلاحیں آیا کرتی تھیں کلام پر۔ یہ بہت زمانہ پہلے کی بات ہے جو میرے ذہن میں محفوظ رہ گئیں، کیونکہ میری یادداشت اچھی ہے۔ اس میں ایک مصرع تھا "ماہ و مہر لگتے ہو" سیماب صاحب نے وہاں اصلاح دی تھی کہ چونکہ مہر کا مقام ماہ سے اونچا ہے اس لیے اس کو پہلے ہونا چاہیے یعنی "مہر و ماہ ہونا چاہیے۔ اس سے ایک جہت میرے دماغ میں آئی کہ شاعری میں اس طرح کا خیال رکھنا چاہیے اور آج تک میرے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے۔ شاعری پر اصلاحوں کے ذریعے سے آپ کے دادا سے غائبانہ تعارف ہوا۔

افتخار   شعری شخصیت کی تشکیل میں اور کون کون لوگ اور کتابیں معاون ہوئیں؟

رضا   اس سلسلے کی سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھی وہ تھی "شعر الہند"۔ عبد السلام ندوی کی جو دو جلدوں میں ہے اس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوا کہ داغ کے خاندان کے یہ لوگ اس وقت پورے شعری ماحول پر غالب ہیں۔ میں نے ان سب کو پڑھا، دیکھا۔ کم از کم میرے ذہن کی نمائندگی تو ہوئی کہ یہ لوگ ہیں۔ ان کو پڑھنا چاہیے۔ پھر مختلف رسائل اور کتابوں میں ان لوگوں کو پڑھا۔ اس طرح زبان و بیان کی تشکیل میں مجھے کافی مدد ملی۔

افتخار   آپ افریقہ گئے تھے اور طویل عرصے تک وہاں رہے بھی۔ اس طرح آپ کی سوچ اور طرزِ فکر بھی متاثر ہوئی ہوگی۔ وہاں کے ماحول اور حالات کے سبب

رضا   مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے کہاں سے اندازہ لگایا۔ آپ بتائیں کہ یہ تبدیلی کہاں سے شروع ہوئی؟

افتخار   "شعلۂ خاموش" اور "آتشِ پنہاں" کے بعد کی شاعری میں یہ تبدیلی محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہاں تبدیلی سے دو باتیں اُبھرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر کے یہاں بڑھتی ہوئی عمر اور مشق سخن سے شاعری میں نکھار اور استحکام آتا ہی ہے۔ مشاہدوں اور تجزیوں سے فکری سطح پر زبان، لہجہ، میلان وغیرہ بہت کچھ تبدیل ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہر شاعر کی اپنی شاعری اس کے مزاج اور ماحول کی عکاس بھی ہوتی ہے اور آپ کے یہاں بھی ابتدائی دو شعری مجموعوں کی اشاعت کے بعد کی شاعری سے یہ تبدیلی نمایاں ہے۔

رضا   دیکھیے میں نے زبان کو تو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میں نے چند متروکات یا وہ تمام متروکات جو قبلہ جوش ملسیانی صاحب نے متروک کردیے تھے، ان کی زندگی تک قائم رکھے۔ ان کے انتقال کے بعد پھر میں نے اپنے طور پر کچھ متروکات چھوڑ دیے۔ یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ بعض الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں لیکن اگر استعمال کرنے کا ہنر آتا ہے تو ضرور انھیں برتنا چاہیے۔

افتخار   اگر آپ اس بات کو مثال دے کر سمجھائیں تو مزید وضاحت ہوجائے گی۔

رضا مثال کے طور پر وہ صوفیانہ الفاظ جیسے "چھاتی" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اگر موضوعات ہی ایسے ہیں کہ ان الفاظ کے بغیر چارہ نہیں تو پھر انہیں استعمال کرنا چاہیے لیکن ایسے متروکات جیسے تلک، سدا، انکھڑیاں، نکھرا، دکھ سکھ وغیرہ کا استعمال ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے اس کا یہ طریقہ نکالا تھا جوش صاحب کی زندگی میں ان کے آخری دنوں میں کہ زبان کو ہلکا پھلکا بنانے کے ساتھ ساتھ فکر بھی بہت (سطحی) رکھی میں نے لیکن زبان کو انہی حدود میں رکھا جو مجھے سکھایا گیا تھا۔ اب جیسے

جانے کس الجھن میں پڑا ہوں

ڈوبا سا ساحل پہ کھڑا ہوں

زبان تو بالکل صاف رکھی میں نے لیکن ذرا سی آزادی یہ دے لی کہ میں نے جوش صاحب قبلہ "جانے" کو بہ معنی "خدا جانے"، "نہ جانے" استعمال نہیں کرنے دیتے تھے۔ لیکن تخلیقی سطح پر سب لوگ استعمال کرنے لگے تو میں نے بھی برتنا شروع کر دیا ورنہ مجھے بھی "نہ جانے"، "خدا جانے" استعمال کرنا پڑتا۔ میں نے لفظ کو تخلیقی روپ دیا ہے تو بھلا لگتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ بعد میں میری غزلیں اسی نہج پر تخلیق ہونے لگیں۔ میں جب ہندوستان آیا تو دیکھا کہ میں ہندوپاک کے ادب سے بالکل کٹ گیا ہوں اور اگر اپنی یہ نظمیں اور غزلیں لے کر نکلوں گا تو کوئی گھاس نہیں ڈالے گا چنانچہ میں نے سوچا کہ کچھ عرصہ تک خاموش رہا جائے۔ عصری شاعری کے رجحانات کو دیکھا جائے اور یہ کہ اسے کہاں تک اپنے آپ میں سمو سکوں گا۔

افتخار آپ کی یہ عرصۂ خاموشی بھی آپ کے کام ہی آئی اور شاعری سے تحقیق تک سفر طے ہوا۔

رضا جی ہاں! میں تحقیق کی طرف راغب ہوا لیکن ایسا ہونا بھی عین میرے مزاج کے مطابق تھا۔ اس لیے کہ تحقیق کی عادت میری بچپن سے ہے لہٰذا اس طرف آنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ مطالعہ بے حد کیا لہٰذا وسیع ہے۔ ہر چیز کا غائر مطالعہ کرتا ہوں۔ اردو فارسی اور انگریزی ادب کے وسیع مطالعے سے مجھے بے اندازہ فائدہ ہوا۔ تاریخ ہمیشہ ہی سے میرا زبردست موضوع رہا ہے۔ یادداشت میری بہت اچھی ہے۔ جو کچھ پڑھتا ہوں وہ یاد رہ جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑی مدد ملی۔ مجھے تحقیقی کاموں میں اس قدر کامیابی ملی کہ میری شاعری اس سے دب گئی۔

افتخار تحقیق کے موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ یہاں گفتگو چل رہی ہے تبدیلی سے متعلق، کہ آپ نے زبان و بیان کی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا جبکہ میں فکری سطح پر تبدیلیوں کی بات کر رہا تھا۔

رضا میرے خیالات میں بہت زیادہ تبدیلی تو آئی مطالعے و مشاہدے سے۔ لوگوں کے میل جول سے۔ چونکہ میں پنجاب سے نکلا تھا۔ اور نکل کر ایسے لوگوں میں چلا گیا جہاں مختلف دھارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ افریقہ میں مطالعے کا موقع بھی بہت ملا لہٰذا پڑھا بھی بہت۔ اچھے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں سخت و شدید آریا سماجی نہ رہا۔ مجھے یہ سوچنے اور سمجھنے کا گر ہاتھ آگیا کہ کوئی

ھی چیز حرف آخر نہیں ہے۔ مذہب کے معاملے میں بھی۔ اس میں ہمیں کچھ ڈھیل ضرور دینی چاہیے۔ مثلاً مارے کسی شاعر نے یہ لکھا کہ "یوں کرنا چاہیے" تو کرنا چاہیے سے فائدہ اٹھانا چاہیے یعنی ضروری نہیں ہے کہ م کرو۔ جتنا کرنا چاہیے اس سے کم بھی آپ کر سکتے ہیں لیکن ایک ایڈجسٹمنٹ کی طبیعت پیدا ہوگئی جس سے سعت بہت زیادہ آگئی اور یہ وسعت شعلہ خاموش سے بعد میں بڑھتی ہی چلی گئی۔ آج تک، پوری انسانیت کا ملسلہ، روشنی، اندھیرا، وسعت، پت جھڑ، خزاں وغیرہ وغیرہ علامتیں اور استعارے۔ میں نے مذہبی کتابیں بھی ہت پڑھی ہیں۔ میں نے اسلامی لٹریچر کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔

افتخار اس کا اندازہ اسلامی موضوعات پر آپ کی شاعری سے ہوتا ہے۔

رضا یہ تو خیر بہت مختصر سی ہے۔ پھر بھی مطالعہ بہت کیا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ اب مجھے غیر ریہ سماجی، غیر ہندو سے ملنے میں کوئی عار نہیں ہوتی۔ یہ احساس بھی مجھ میں باقی نہیں رہا کہ یہ مجھ سے کمتر ہیں مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ سب لوگ یکساں ہیں اور بہت سی باتوں میں ہم میں یکسانیت پائی باتی ہے جسے سمجھ کر آپس میں ملنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ باوجود یہ کہ میں بہت کم ی سے ملتا ہوں لیکن جب کوئی مجھے ملتا ہے تو یہی محسوس کرتا ہے کہ اسے کم تر یا برتر مانا گیا اسے ہندو نہیں مانا لیا نہ سکھ مانا گیا، نہ مسلمان مانا گیا، اور نہ ہی مجھے کھانے پینے میں کوئی پرہیز ہوتا ہے، حالانکہ میں خود کھانے پینے میں زیادہ پرہیز کرتا ہوں۔ میں شراب نہیں پیتا اور نہ ہی میں نے اپنی زندگی میں کبھی شراب پی۔ میں اپنے ھر پر بھی کسی کو شراب نہیں پلاتا۔ نہ میں رشوت لیتا ہوں اور نہ ہی دیتا ہوں۔ ان تمام باتوں نے مجموعی طور پر یری شاعری اور میرے ادب کو متاثر کیا۔

افتخار ایک بہت ہی غیر اہم اور ضمنی سا سوال آپ سے کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آپ نہایت ہی متمول خص ہیں تو اس سے آپ کی شاعری اور آپ کے تحقیق ادب پر کیا اثر پڑا کیونکہ عموماً ہمارے یہاں اس طرح کی نواہیں گونجتی رہتی ہیں کہ فلاں شخص اپنی دولت کے بل پر ادب میں اپنی جگہ بنا رہا ہے اور اس کی مثالیں موجود ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟

رضا بات یہ ہے افتخار کہ میں نے اپنے آپ کو پیسے سے کبھی نہیں منوایا اور جب کوئی میرے کام کو یرے ادب کو روپے پیسے سے تولتا ہے تو مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ لوگ یہ ات ہضم نہیں کر سکتے ہیں کہ کوئی پیسے والا اتنا اچھا اور سلجھا ہوا ادیب کیسے ہو سکتا ہے۔

افتخار اپنی شاعری کی ابتدا سے عہد جوانی تک کوئی ایسا خاص واقعہ جو آپ کی شاعری پر اثر انداز ہوا ہو؟

رضا نہیں میں نے عشق نہیں کیا۔

افتخار میری مراد عشق محض سے ہرگز نہیں ہے بلکہ

رضا میرے یہاں ایک خاندانی روایتی سنجیدگی تھی جسٹس جانس سنگھ نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "نوجوان رضا کے کاندھوں پر ایک بوڑھے بزرگ کا سر رکھ دیا گیا ہے"۔ اس لیے میری سوچ سمجھ اپنی عمر سے زیادہ اونچی ہی رہی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ دس سال کے بعد میں بچہ رہا ہی نہیں۔ میرے بچپن اور جوانی کی عمر کا عہد بہت کم ہے۔ میرے یہاں فکر بہت آنے لگی تھی۔ غالب مجھے پسند تو آتے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتے تھے، کم آتے تھے لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ کہتا ضرور ہے جو دوسروں سے الگ ہے اور یہ بعد میں معلوم ہوا۔ میرے پاس کوئی ایسا محرک نہیں جس نے میری شاعری کو تازیانہ دیا ہو۔ میرا اپنا مطالعہ و مشاہدہ اور میری سوجھ بوجھ ہی میری شاعری ہے۔

افتخار کہتے ہیں کہ غزل میں عشق کا رچاؤ ضروری ہے یا یہ کہ اردو شاعری میں عشق کو غالب حیثیت حاصل رہی ہے لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کے بچپن اور جوانی میں کوئی خاص فاصلہ نہیں رہا، اسی طرح شعور بھی جلد بالغ ہو چکا تھا یعنی جوانی ہی میں آپ کی فکر کسی بڑی عمر کے شخص کی طرح ہو گئی تھی تو اس میں چاہنے اور چاہے جانے کا کوئی لمحہ آیا ہی نہیں۔

رضا دیکھئے، اس میں یہ فرق ہے کہ بیوی کی طرح چاہنا۔ اس غرض سے چاہنا کہ اس کے ساتھ کوئی جنسی فعل کیا جائے۔ یہ تو بہت ہی گھٹیا قسم کا عشق ہے۔ عشق کی نہایت ہی پست صورت ہے۔ اردو شاعری میں ہمارے غزل گویوں نے یہی منوا دیا کہ عشق یہی ہے۔ مجھے کتابوں سے والہانہ عشق ہے۔ یہ عشق کسی عورت ذات سے تو نہیں۔ مجھے ہر خوبصورت چیز بہت پسند ہے۔ لڑکی ہو، لڑکا ہو، کوئی ہو میں اسے دیکھتا ضرور ہوں لیکن اس کے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا۔ مجھے ایک لڑکی پسند آتی ہے لیکن وہ اگر اچھا نہیں بولتی تو مجھے ناپسند ہو جاتی ہے۔ مجھے اچھی آواز پسند ہے کیونکہ میں گانے کا شوقین ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عشق کس سے؟ عشق تو بہت سی چیزوں سے ہو سکتا ہے۔

افتخار عشق کی تو جتنی بھی تعریفیں بیان کی گئی ہیں وہ اس لامحدود جذبے کا احاطہ نہیں کر سکیں نہ کر سکتیں۔ عشق لامحدود ہے۔

رضا مجھے اردو سے عشق ہے۔

افتخار اردو سے ہے، کتابوں سے ہے، مطالعے سے ہے، عشق اپنے کام سے ہے۔

رضا اصولوں سے عشق ہے۔

افتخار موسیقی سے بھی آپ کا لگاؤ رہا ہے اور افریقہ میں موسیقی کی خوب خوب محفلیں سجائیں۔ موسیقی کے متعلق آپ نے لکھا بھی ہے۔ غالباً آپ نے ستار کی تعلیم حاصل کی تھی۔

رضا پہلے تو میں گاتا تھا۔ بعد میں جب ستار سیکھنے کی منزل میں آیا تو پہلے یہ بتا دوں کہ چاہے گانے والا ہو یا کوئی ساز بجانے والا ہو، دونوں ہی کے لیے موسیقی کا علم ضروری ہے یعنی بنیادی اصول تو سب

کے لیے یکساں ہی ہے۔ تال یعنی ردم کے لیے طبلہ سیکھنا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص یہ نہیں سیکھتا تو محفلوں میں اکثر ناکامیاب رہتا ہے۔ اور اس کا حوصلہ کہیں نہیں بنتا۔ اس لیے علم بیجد ضروری ہے۔ چونکہ میں فن عروض میں بہت اچھا تھا اور اب بھی ہوں۔ فن عروض میں بھی ماترائیں اپنا کام کر رہی ہیں۔ اسی طرح طبلہ میں بھی ماترائیں ہی ہیں۔ اس طرح بہت آسان ہو جاتا ہے۔ دونوں کا تال میل خاص طور پر یہ متقارب اور متدارک بحریں جو کہروے اور تین تال پر بڑی آسانی سے آتی ہیں۔ چار چار ماتراؤں میں یہ تقسیم ہوتی ہیں، اسی طرح فعلن، فعلن، فعلن، فعلن ہر ایک میں چار چار ماترائیں ہیں۔ ف، ع، ل، ن۔ اور سب کے حساب سے فع لن، فع لن۔ دو، دو، دو، دو۔ دہن میرا چونکہ بیوپاری خاندان کا تربیت یافتہ تھا ہی اس لیے حساب بھی میرا بہت اچھا رہا اور اب بھی ہے۔ مجھے بچپن ہی سے دونوں چیزیں پسند ہیں' شاعری اور موسیقی۔ موسیقی کا ریاض میں نے برسوں کیا ہے۔ میں پہلے گایا کرتا تھا۔ یہ جو انسٹرومینٹل میوزک (Instrumental Music) ہے ستار وغیرہ، اس کی محویت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ آپ گا نہیں سکتے۔ اس میں کچھ ایسی غنائیت ہوتی ہے کہ آدمی بہہ جاتا ہے، چنانچہ وہ گانے سے پرہیز کرتا ہے۔ اس طرح سے میرا گانا سد ہو گیا لیکن ایسا نہیں ہوا کہ ستار سیکھنے اور ریاض کرنے کے دوران گانا مجھ سے نکل گیا۔

افتخار ستار کی تعلیم آپ نے کس سے حاصل کی؟

رضا وہی جن سے میں نے گانا سیکھا تھا یعنی جگن ناتھ پروہت۔ وہ ستار بھی بہت اچھا بجاتے تھے، جگن ناتھ پروہت جو تھے وہ وشنو دگمبر کے شاگرد تھے۔ ماہنامہ آج کل (دہلی) نے جو موسیقی نمبر شائع کیا تھا اس میں استاد اللہ دیا خاں پر غالباً تاجدار احتشام صدیقی کا مضمون ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ انھوں نے اس طرح کا مضمون کیسے لکھا۔

افتخار شاعری اور تحقیق میں آپ کی شخصیت کا نمایاں پہلو ایک محقق کا ہے نہ کہ شاعر کا۔ آپ کی شہرت تحقیق کے حوالے سے زیادہ اُبھری۔

رضا جی ہاں! ہندوستان میں آنے کے بعد چونکہ میں نے زیادہ تیزی سے تحقیقی کام کیا اور متعدد اہم اور بھرپور کتابیں دیں لہٰذا میرا ذکر اسی حوالے سے ہوا لیکن اب پھر شاعر کی حیثیت سے اُبھر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تحقیق بہت زیادہ وقت پسندی کا نام ہے۔ تو کبھی کبھی جی بھی اوب جاتا ہے۔ اب چونکہ بڑھاپا نزدیک آرہا ہے اور میں تحقیقی کاموں کی طرف بھی متوجہ رہتا ہوں لیکن اب اتنا کام نہیں ہو پاتا اور میری تسلی ہوتی نہیں جب تک اسے ڈھنگ سے نہ کر پاؤں۔ ایسی صورت میں شاعری کی طرف رجحان زیادہ ہونا فطری بات ہے۔ ادھر میں گذشتہ دو تین سال سے جو شاعری کر رہا ہوں وہ پہلے سے بہت بہتر ہے اور اس کا مقام بھی دوسرا ہو گیا ہے۔ میں جدید شاعر تو نہیں ہوں۔ ویسے کوئی بھی جدید شاعر نہیں ہے۔ سب فضول باتیں ہیں۔ شاعری تو شاعری ہوتی ہے۔ جدید و قدیم کیا ہوتا ہے اس میں؟

افتخار آپ نے یہ تو بتایا کہ مشرقی افریقہ سے واپسی کے بعد ہند و پاک کی شاعری سے خود کو ہم آہنگ کرنے کے لیے نہایت ہی خاموشی سے مطالعہ کیا اور تحقیق کی طرف مائل ہوئے کہ بچپن سے آپ کے مزاج میں تلاش و تحقیق کا عنصر بھی شامل تھا پھر بھی یہ ایک سوال بنتا ہے کہ آپ تحقیق ہی کی طرف کیوں آئے۔ تنقید، افسانہ، انشائیہ وغیرہ کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوئے جبکہ اردو والوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ شاعری، افسانہ اور تنقید میں زیادہ طبع آزمائی کرتے ہیں کہ کسی طرح ادباء میں شمار ہونے لگے۔ کسی بھی صنف کے ذیل میں نام تو آہی جائے گا "سہو و سراغ" کے آخر میں جو مضامین ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ افسانہ اور انشائیہ بھی لکھ سکتے تھے۔

رضا یہ سوال بالکل میرے مزاج کے حساب سے ہے۔ وہ یوں کہ میں طبعاً بہت زیادہ حیبوں طبیعت رکھتا ہوں جیسے صحیح بات کرنا جو کام ہو سکتا ہے وہی کہنا۔ جسے جو وقت دے سکتا ہوں وہی دینا وغیرہ وغیرہ۔ مجھے مفروضے پسند نہیں۔ ہماری اردو تنقید محض مفروضہ بن کے رہ گئی ہے۔ اس میں چار تنقید کرنے والے ایک ہی شخص پر یکساں بات نہیں کہہ پاتے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی شاعر کی کوئی دو ہزار، تین ہزار، چار ہزار، پانچ ہزار جہتیں ہوں گی۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ کیا وجہ ہے کہ دس نقاد مل کر بھی کسی شاعر کی ایک جہت قائم نہیں کر سکتے۔ ایسا کیوں ہے؟ وہ اسی کو بہت زیادہ اچھا کہتا ہے، اسی کو بہت زیادہ برا بھی کہتا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ جتنے بھی آپ تنقیدی مضامین کے مجموعے دیکھیں گے سب میں تضادات جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن تحقیق میں یہ ممکن نہیں ہے۔ تحقیق میں آپ کو حق کی تلاش ہے اور آپ کو حق ہی پر پہنچنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ حق سے ذرا کم رہ گئے ہوں۔ حرف آخر کہنا ذرا مشکل ہوتا ہے لیکن ایک جہت تو ہے، ایک منزل تو ہے ہمارے سامنے۔ محقق کو کبھی مفروضوں پر انحصار نہیں کرنا چاہیے، جو اس کے علم میں آتا ہے اور اسے یقین ہو گیا ہے وہی اسے کرنا چاہیے۔

افتخار گویا تحقیق نامعلوم سے معلوم تک کا سفر ہے۔

رضا سفر ہے۔ باقاعدہ سفر ہے۔ معلومات ہی تک پہنچنا ہے اور اسکے بعد حق پالینا ہے اس میں سے۔

افتخار تو وہ عرصہ جو خاموشی کی نذر ہوا شاعری کے لیے، اور تحقیقی کام آپ نے کیا تو شاعری بالکل نہیں کی۔

رضا جی نہیں ایسا نہیں ہے۔ اس دوران میں رباعیاں لکھیں، سیکڑوں رباعیاں۔ ان میں بیشتر شعاعِ جاوید میں شامل ہیں۔ اس سے مجھے رباعی گو مان لیا گیا۔ مجھے خود حیرت ہوتی ہے۔ مجھے یقین تو تھا ہی کہ میں نے اچھی رباعیاں کہی ہیں لیکن لوگوں نے بھی مانا۔ رباعی ایک مشکل فن ہے۔

افتخار آپ کا ابتدائی تحقیقی کام کس نوعیت کا تھا اور کہاں سے یہ اندازہ ہوا کہ آپ ایک اچھے اور معتبر محقق بھی بن سکتے ہیں؟

رضا آپ نے ڈاکٹر صفدر آہ کا نام سنا ہوگا؟ مرحوم بے حد ذہین آدمی تھے لیکن قلم کی وجہ سے وہ موجودہ تحقیق کی معیاری سطح سے بہت پیچھے رہ گئے لیکن ان کو عزّہ یہ تھا کہ وہ اب بھی زبردست محقق ہیں اور ان کی تحقیق پر کوئی حرف گیری نہیں کر سکتا۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی "میؔر اور میریات" اس کا مسودہ علوی بک ڈپو کے مالک جوہر کے یہاں پڑا تھا۔ ایک دن میں وہاں پہنچا۔ ڈاکٹر صفدر آہ بھی آگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے دوسرے شعری مجموعے "شورش پنہاں" کا دیباچہ لکھا تھا اور ہم ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ جب کتابت شدہ صفحات انھوں نے میری طرف بڑھائے، میں نے سرسری طور پر جلد جلد دیکھتے ہوئے بھی بہت سے اغلاط انہیں بتادیے۔ ڈاکٹر صفدر آہ تو بھونچکے رہ گئے کہ یہ کیا ہوا۔ کہنے لگے آپ کو قطعی معلوم ہے کہ یہ یوں نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے اپنی یادداشت پر بھروسہ ہے اور یہی کچھ صحیح ہے اور وہ صحیح نکلے۔ پھر انھوں نے یہ کہا کہ آپ تمام مسودہ دیکھ ڈالیے۔ میں "میر اور میریات" کے کتابت شدہ صفحات گھر لے آیا۔ اسے پورا دیکھ ڈالا اور جہاں جو رہ گیا تھا بتادیا۔ اس کے آخر میں ایک فارسی ترجمہ تھا۔ صفدر صاحب نے میؔر کے بہت سے فارسی کلام کا ترجمہ کر ڈالا تھا لیکن مترجم کی حیثیت سے وہ اپنا نام نہیں دینا چاہتے تھے کیونکہ انھیں اپنے فارسی ترجمے پر یقین نہیں تھا۔ مسودے پر ترجمے میں کہیں کہیں فرق تھا۔ میرے خیال سے وہ میں نے درست کردیا۔ جب ڈاکٹر آہ میرے پاس آئے تو میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہ ترجمہ بالکل ٹھیک ہے اب اور بھی اچھا ہوگیا ہے۔ میرے خیال سے اسے آپ اپنے ہی نام سے شائع کروائیے۔ کاہے کو ناشر کا نام دیں۔ کہنے لگے "بہت اچھی بات ہے۔ ترجمہ تو میں نے ہی کیا ہے"۔ وہ تو اس طرح سے شائع ہوگیا۔ یہ ہوتے ہی انھوں نے کہا کہ تم تو تحقیق کے آدمی بھی ہو۔ کیوں نہیں تم تحقیقی کام کرتے۔ ایک موضوع زمانے سے میرے ذہن میں چلا آرہا ہے "دلگیر" کا۔ یہ "دلگیر" پر کیوں نہیں لکھتے؟ انھوں نے مجھے کچھ اشارے دیے وہ یہ کہ وہ ہندو تھے اور ہندوؤں میں اس سے بڑا مرثیہ گو ہوا ہی نہیں اور یہ کہ اس نے تبدیلی مذہب کیا تھا، حالانکہ اس نے ایسا قطعی نہیں کیا تھا۔ اس مضمون سے مجھے تحقیق کا چسکا پڑا۔ اسی مضمون کے سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیبؔ سے جھگڑا چل گیا۔ چھ سات مضامین انھوں نے لکھے، میں نے لکھے، اکبر حیدری نے لکھے۔ اس طرح پورے طور پر ہم میدان میں کود پڑے۔

افتخار بحث اور الجھاوے کس بات پر تھے؟

رضا یہی کہ "دلگیر" نے تبدیلی مذہب کیا تھا کہ نہیں۔

افتخار محض اسی بات پر؟

رضا جی ہاں! لیکن کس کو اندازہ تھا کہ میں اس زمانے کی سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالوں گا۔ لائبریری دیکھنے کا مجھے شوق افریقہ ہی سے تھا۔ وہاں انگریزی کتابیں زیادہ تھیں۔ "دلگیر" کے موضوع پر میں نے جہاں جہاں سے بھی ممکن ہوسکا کتابیں منگوالیں۔ لہٰذا کہیں بھی ہم نرم ثابت نہیں ہوئے۔ اس طرح سے تحقیق تک

پہنچے۔ قاضی عبدالودود وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مجھے داد دی۔ ان کا کارڈ میرے پاس آیا کہ یہ تمھیں تحقیق کا چسکا کیسے پڑا اور کیوں پڑا؟

افتخار کیا قاضی صاحب پہلے سے واقف تھے آپ سے؟

رضا نہیں انھوں نے میرے مضامین پڑھے تھے۔

افتخار "چکبست" پر اتنا اہم اور مستند تحقیقی کام کرنے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟

رضا "چکبست" کو جب میں نے پڑھنا چاہا تو کوئی کتاب میرے پاس نہیں تھی۔ میں نے ڈھونڈی تو مجھے ملی نہیں۔ میں نے ڈاکٹر صفدر آہ سے ذکر کیا کہ آپ کے پاس چکبست کی کوئی کتاب ہے؟ مجھ سے کہنے لگے چکبست پر کام کرنا چاہیے۔ اپنے بچپن میں میں دیکھتا تھا کہ میرے والد بہت سے اشعار گنگنایا کرتے تھے اس میں چکبست کے شعر بھی شامل رہا کرتے تھے۔ یا رامائن کے اشعار۔ میری عادت ہے کہ جب میں کسی کام کی ابتدا کرتا ہوں تو اسے درمیان میں ادھورا نہیں چھوڑتا چنانچہ چکبست پر اتنا ضخیم کام کرڈالا اور اس کا صلہ بھی مجھے خوب ملا۔ وہ یہ کہ مہاراشٹر اردو اکاڈمی نے جب "چکبست" پر سیمینار کیا تو مجھے مدعو نہیں کیا لیکن اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میں کسی مشاعرے، کانفرنس یا میٹنگ وغیرہ میں آج تک گیا نہیں۔ وہاں جاتا تو مجھے بولنا تو آتا نہیں۔ پھنس کر رہ جاتا اور اپنے آپ میں جو بھرم ہے وہ بھی کھو بیٹھتا۔

افتخار تحقیق سے متعلق مزید سوالات کرنے سے پہلے شاعری پر ایک اور سوال میں آپ سے کررہا ہوں جو بہت دیر سے میرے ذہن میں گونج رہا ہے وہ یہ کہ غزل کی موجودگی میں شاعری کی دیگر اصناف کی طرف آپ کیوں کر متوجہ ہوئے یعنی تخلیقی سطح پر اظہار کی صورت غزل کے علاوہ نظم بھی کیوں ہی جبکہ آپ ایک کامیاب غزل گو بھی ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ زود گو بھی واقع ہوئے ہیں؟

رضا غزل آسان صنف سخن ہے۔ اسے سمجھنا بھی آسان ہے اور کہنا بھی آسان ہے۔ لیکن اس کے لیے مشق سخن بے حد ضروری ہے۔ ابتدائی دس بیس سال کارنامہ ورنہ اس کے آہنگ کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے یعنی تھوڑے سے لفظوں میں بہت کچھ کہہ جانا۔ میں مختصر بات کہنا پسند کرتا ہوں جبکہ نظم میں طوالت سے کام لینا پڑتا ہے۔ نظمیں میں نے کہی ہیں اور بہت کہی ہیں۔ کچھ لوگ مجھے نظم کا شاعر کہتے ہیں اور مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ غزل کی طرف میرا میلان صرف اتنا ہی ہے کہ جب میرے پاس تحقیقی کاموں سے کچھ وقت بچتا ہے اور میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تو غزل میں ہی ایک شعر کہنے کے بعد میں دوسری طرف مائل ہو سکتا ہوں لیکن نظم کے لیے زیادہ وقت چاہیے۔ یہاں یہ ہے کہ صرف ایک شعر کہہ کر مطمئن ہوگئے کہ کل پھر کہہ لیں گے۔ میں زود گو ہوں ہی۔ بہت جلد شعر کہہ لیتا ہوں۔

افتخار آپ کے شعری مجموعے اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

رضا لیکن میں اپنی زود گوئی کا غلط استعمال نہیں کرتا۔ میں زیادہ شعر کہتا نہیں۔

افتخار خیال کی اگر ترسیل ہو رہی ہے، جو آپ کہنا چاہتے ہیں وہ بھرپور انداز میں غزل کے اسلوب میں بیاں کیا جا رہا ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہو پا رہا ہے چاہے آپ کتنے ہی زود گو کیوں نہ ہوں۔ آپ کے اندر کی گھٹن کم نہیں ہو رہی ہے۔ شدت کم نہیں ہو رہی ہے تو پھر اس کا وسیلۂ اظہار اسالیب نظم ہی میں ممکن ہو سکے گا۔ آپ نے کبھی ایسی کیفیت کو محسوس کیا؟

رضا بالکل ٹھیک ہے۔ دیکھئے آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں اور میں پہلے بھی نہ کہہ پایا اور اب بھی نہ کہہ پاتا لیکن چونکہ آپ نے بات میرے منہ میں ڈالی ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک خیال آ جاتا ہے تو اس کے اوپر کافی کچھ Built کرنا پڑتا ہے۔ اس کے تعبیر وضاحت نہیں ہو پاتی۔ وہ ایک شعر میں نہیں سماتا۔ ایسی صورت میں نظم کہنا بہت ضروری ہو جاتا ہے لیکن میں بہت زیادہ طویل نظمیں کہنا پسند نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کہنے والا بھی اور قاری دونوں ہی اوب جاتے ہیں۔

افتخار آپ کے یہاں شاعری میں جو ہیئتی تجربے ملتے ہیں وہ آپ کی عروض پر دسترس کے سبب ہیں یا پھر یہ کہ آپ مزاجاً تجربہ پسند ہیں؟

رضا میرے مزاج میں تو داغؔ کی شاعری تھی جو جوش صاحب قبلہ کی وجہ سے مجھ میں آئی۔ زمانے کا رجحان بھی ۳۶-۱۹۳۵ء تک یہی تھا۔ پھر میں مشرقی افریقہ چلا گیا اس لیے کچھ زیادہ تجربات میں نے اس سے پہلے نہیں کیے، لیکن افریقہ میں رہ کر تجربات کیے۔ ان تجربوں میں ایک چیز میری پسندیدہ یہ ہے کہ میں ارکان سے باہر ہو کر کچھ کہنا نہیں چاہتا یعنی نثر مجھے پسند نہیں۔ بطور شاعری کے میں نے ارکان کی کمی بیشی تو کی ہے مثلاً ایک مصرعہ میں پانچ رکن ہیں تو دوسرے میں دو یا تین رکن کر دیے لیکن میں اسے غزل میں جائز نہیں سمجھتا ہوں۔ اور یہ پسندیدہ بھی نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ رہنے والی بھی نہیں ہے۔

افتخار آپ کا اشارہ آزاد غزل کی طرف ہے۔

رضا جی ہاں! لیکن میرے لیے آزاد غزل کہنا اور عام غزل کا جو اسلوب ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مجھے کوئی دِقت نہیں ہو سکتی لیکن میں نے آزاد غزل صرف اسی لیے نہیں کہی کہ میرے نزدیک نہ تو اس سے کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی کوئی پائیداری ہے، اس کی عمر بھی کم ہی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگوں کے رجحانات کتنی جلد جلد بدل رہے ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں چونکہ شاعر کوئی بڑا کام نہیں کر پاتے اس لیے بہت جلد محقق بھی، شاعر بھی، نقاد بھی، کوئی ذرا سی بات کہتے ہیں تو اس کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تحقیق میں بھی یہی دیکھ رہا ہوں۔ ”یہ میری دریافت ہے“، ”یہ سب سے پہلے میں نے کہا ہے“ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے پاس مطالعہ نہیں رہا، اس لیے ہم جانتے نہیں۔ میں غالبؔ کے مشہور شاگرد اسماعیل میرٹھی کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ غیر مقفیٰ نظمیں ان کے یہاں بڑی تعداد میں ہیں اور غالبؔ کے زمانے میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لوگوں نے بہت پہلے ہی کئی

طریقے سے سوچا ہوا ہے۔ اس لیے بہت جلد دعویٰ نہیں کر دینا چاہیے کہ یہ میں نے کیا ہے۔ یہ میں نے کیا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ میں نے جو تحقیقی کام کیے ہیں انھیں کوئی چھو نہیں سکا پھر بھی میں نے دعویٰ نہیں کیا کہ کوئی نہیں کر سکتا۔ میں نے جہاں جو کچھ لکھا ہے وہ اس طرح لکھا ہے کہ یہ چیز شاید اردو میں پہلے نہیں تھی۔ میں نے لفظ "شاید" ضرور کہا ہے۔

افتخار ایک عام خیال یہ ہے کہ تحقیق نہایت ہی خشک موضوع ہے اور صرف پڑھے لکھے لوگوں ہی کے لیے ہے۔ یہ عام قاری کے بس کا روگ نہیں۔

رضا یہ قطعی خشک چیز نہیں ہے۔ ویسے خشک ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کی تحقیق نے دراصل یہ ہوا دی ہے۔ قاضی صاحب چند ہی لفظوں میں بہت کچھ کہہ دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے علامتیں وغیرہ بنالیں۔ اس طریقے سے اسے خشک تصور کیا جانے لگا لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ میری تحقیق میں یہ خشکی نہیں ہے۔ ہے بھی تو بہت کم ہے۔ اگرچہ مفروضے اور انشا پردازی تحقیق کے لیے قاتل ہے۔ پھر بھی میری کوشش رہتی ہے کہ اسے اچھے اسلوب میں بیان کر دیا جائے۔ اسے گورکھ دھندا نہ بنایا جائے۔ معمہ نہ بنایا جائے۔

افتخار غالب پر سب سے بڑا ذخیرہ آپ کے پاس ہے گویا آپ کو اس کا اندازہ ہے کہ پوری دنیا میں غالب پر کہاں اور کس نوعیت کا اچھا یا برا کام ہوا ہے یا ہو رہا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ اس سب کی روشنی میں اب غالب پر کس طرح کے تحقیقی و تنقیدی کام کی ضرورت ہے جس پر ہند و پاک میں غور کیا جانا چاہیے۔

رضا مجھے تو افتخار، اس بات کی داد دینا پڑتی ہے کہ تم اس سوال پر آئے یعنی جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ تمہارا سوال میرا سوچا سمجھا ہوا موضوع ہے جس پر میں اپنی باقی تمام عمر صرف کرنا چاہتا ہوں۔ ایک پروجیکٹ جس کا میں خاکہ بنا چکا ہوں جو میرے سامنے ہے اور جسے میں میں جلدوں میں شائع کروں گا اور اس کا تعلق غالب سے ہے۔ اب لوگ کہیں گے کہ نہ جانے یہ کیا کر دے گا لیکن گپتا رضا نے تو بہت کچھ کر دکھایا ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ یہ پروجیکٹ بھی مکمل کر گذروں گا تو لوگ پھر بھی شرمندہ ہو جائیں گے کہ یہ میں نے کیا کر ڈالا۔

افتخار میں جلدوں میں آپ جو کچھ دینا چاہتے ہیں اگر اس کی اجمالی تفصیل دیں تو اس سے موضوع کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

رضا میں تفصیل یوں نہیں دینا چاہتا کہ لوگ اگر سمجھ لیں گے اس بات کو تو ایک آدھ کتاب اس موضوع پر لکھ ڈالیں گے اور موضوع کا بیڑا غرق کر دیں گے اور کوشش یہ ہوگی سب سے پہلے ہم نے یہ موضوع لیا تھا، اس پر ہمارا کام موجود ہے۔ کہاں ایک موضوع پر میں تیس سال لگانا چاہتا ہوں اور لوگ پندرہ دن میں ایک گھٹیا سی کتاب پیش کر دیں گے۔

افتخار عموماً ایسا ہوتا ہی ہے۔ لوگوں کے پاس سوچنے سمجھنے کے لیے دماغ تو ہوتا نہیں، یا تو کسی پر

کبھی مارنا یا پھر ادھر ادھر سے آئیڈیے اڑا کر اسے نہایت ہی بھونڈے انداز میں پیش کرنا۔ اس سے آگے تو سوچ بھی نہیں سکتے۔ بہر حال! میں قدرے وضاحت چاہتا ہوں کہ اب غالب پر کس نہج پر کام ہونا چاہیے؟

رضا غالب کی تفہیم ابھی تک کم ہے۔ غالب پر ایک بہت بڑا کام جو ابھی تک نہیں ہوا ہے غالباً وہ یہ ہے، اب پھر وہی بات آجائے گی کہ مجھے بتانا پڑے گا۔ اب آپ مصر ہیں تو ایک جزو بتا ہی دیتا ہوں اور وہ یہ کہ غالب کے معاصرین میں دوسری زبانوں کے شعراء کیا کر رہے تھے۔ ان کا تقابلی مطالعہ غالب کے ساتھ۔ غالب اگر بہت بڑا شاعر ہے اردو کا تو ہم یہ دکھائیں گے اور دیکھیں گے کہ دوسرے شعراء کے سامنے کیا قدر و قیمت تھی اس کی۔

افتخار یعنی غالب کے عہد میں ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے شعراء کس طرح کی شاعری کر رہے تھے؟

رضا بالکل وہی دور، اس میں محنت بہت ہوگی اور یہ کام معمولی نہیں ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ میرے کہنے کے بعد آپ اسے شائع کر دیں گے اور کوئی نہ کوئی اسے کر گذرے گا حالانکہ ہوگا کچھ بھی نہیں۔

افتخار کیا ایک محقق کا کام اتنا ہی ہے کہ وہ صرف خام مواد پیش کر دے اور نتیجہ قاری پر چھوڑ دے؟

رضا نہیں! غلط، محقق کو نتیجہ بھی اخذ کرنا چاہیے۔ دیکھئے، محقق اور مورخ میں بہت کم فرق ہے۔ دونوں کم و بیش ایک طرح کے کام کرتے ہیں۔ مورخ وہی مستند سمجھا جاتا ہے جو نتیجہ خود اخذ کرتا ہے، میں نے "کلیاتِ چکبست" ایڈٹ کی۔ ایڈیٹنگ تو اپنی جگہ پر رہی، اس پر ۸۵ صفحات کا مقدمہ لکھا۔ اصل کام تو یہ ہے۔ شاعر کا کلام تو اپنی جگہ رہ گیا۔ کلام کی ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ میں کیا کہتا ہوں، میں کیا سمجھتا ہوں، مثلاً میں نے اس میں ایک بات لکھی ہے کہ چکبست کا ایک مشہور شعر ہے

غم نہیں مجھ کو یہاں دیں کی بربادی کا
ست سلامت رہے انساں کی آزادی کا

یہ شعر چکبست نے ۱۹۱۷ء میں کہا تھا جبکہ ترقی پسند کانفرنس بہت بعد میں ہوئی تھی۔ یعنی بیس سال پہلے چکبست نے یہ شعر کہا تھا۔ اب دیکھئے "آزادی کا ست"، "انسان کا ست" یہ ترکیب بہت چلی لیکن کسی نے اس کی دریافت چکبست کی جھولی میں نہیں ڈالی۔ اردو میں سب سے پہلے یہ ترکیب وہی لائے اس طریقے سے کوئی بھی شاعر کا مطالعہ نہیں کرتا۔ میں نے نتائج اخذ کیے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ چکبست تو آتش و غالب کے مقلد تھے۔ میں نے پورا باب اس پر لکھا ہے وہ کہیں بھی مقلد نہیں۔

افتخار اردو کے رسم الخط کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا اسے تبدیل ہونا چاہیے؟

رضا اردو کا رسم الخط ہرگز تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔ رسم الخط کی تبدیلی کا نعرہ لگانے والے اسے جس رسم الخط میں ڈھالنا چاہیں ڈھال لیں، لیکن اردو کا انحصار اس کے رائج رسم الخط پر ہی رہے گا۔

افتخار اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

رضا اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ میں نے اردو کے دانشوروں کو اس سے دلچسپی رکھے ہوئے نہیں دیکھا۔ زیادہ تر خود غرضانہ باتیں ہیں۔ ایسے حالات میں اردو کی ترقی کیسے ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اب ہمیں اپنے آپ کو اردو کا کہلوانے میں شرم آتی ہے۔ جب حالت یہاں تک پہنچ جائے تو سوائے تاریکی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اردو اکاڈمیاں سرکاری نہیں ہونی چاہئیں۔ اگر ان پر سرکار کا غلبہ ہے تو اکاڈمیاں نہیں بن سکتیں۔ اکاڈمیوں والے بھی سرکاری آدمی نہیں ہونا چاہیے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ چند لوگوں پر انحصار کر کے پورے ہندوستاں میں اردو کی ترقی کی توقعات لیے بیٹھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مشکل سے ساٹھ ستر لوگ ہوں گے جو ہندوستاں بھر کی اردو کادمیوں، انجمن ترقی اردو اور اس طرح کے دوسرے اداروں کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں۔

افتخار آپ کے پاس مخطوطات، نایاب و کمیاب کتابیں اور رسائل کا بہت قیمتی ذخیرہ ہے۔ آپ نے اس کے تحفظ کے لیے کیا کیا ہے؟

رضا ان کے کارڈ تو تقریباً پورے تیار ہوگئے ہیں۔ ان کا ایک ماسٹر رجسٹر ڈ بھی ہے جس سے کتاب فوری طور پر نکالی جاسکتی ہے۔ جب تک یہ سارا سرمایہ میرے پاس ہے تو محفوظ ہی ہے اور اس کا تحفظ میری زندگی تک تو ہے اس کے بعد کیا ہوگا یہ خدا کو معلوم۔

(ماہنامہ 'شاعر' سے ماخوذ)

☆☆☆

کالی داس گپتا رضاؔ سے ایک ملاقات

محمد ایوب واقف

دولت ایک ایسی شئے ہے جو کبھی انساں کو راہ راست سے ہٹا کرے ہودگیوں کی دلدل میں پھنسا دیتی ہے اور کبھی اس کو ایسا کام کرنے کا حوصلہ اور عزم بخشتی ہے جس سے اس کا مقدر سنور جاتا ہے۔

کالی داس گپتا رضاؔ کے یہاں نایاب اور کم یاب کتابوں کا گیارہ ہزار (اب اس ذخیرۂ کتب میں نمایاں اضافے ہو چکے ہیں۔ ساحر شیوی) کا ایک ایسا انوکھا ذخیرہ ہے جس پر وہ نازاں ہوں تو غلط نہیں۔ اس پائے کی کوئی ذاتی لائبریری اس وقت پورے برصغیر ہند و پاک میں نہیں ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ کا ذاتی کتب خانہ بھی اگرچہ بڑا گراں بہا واقع ہوا تھا مگر رضا صاحب کی لائبریری نے اسے بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ اور یہ ان کی اس غیر معمولی لائبریری کا نتیجہ ہے کہ گپتا صاحب اس وقت پورے ملک میں ایک سر بر آوردہ ادیب و محقق کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے ہیں۔ چکبستؔ اور غالبؔ پر ان کی تحریروں کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے ذوقِ خاص سے ایک اعلا پائے کی لائبریری قائم کر کے ان لوگوں کو کام کرنے کا موقع فراہم کیا ہے جو قلیل آمدنی کے سبب نایاب کتابیں خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔

تین بجے شام کا وقت ہے۔ چرچ گیٹ اسٹیشن پر اُتر کر چرچ گیٹ چیمبرز کی خوبصورت عمارت کے کمرہ نمبر ۳۰۵ کے سامنے آکر تھوڑی دیر کے لیے میں کھڑا ہو گیا۔ پتہ نہیں کیوں لفٹ نہیں چل رہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جو آیا تو سانس پھولنے لگی۔ ذرا دیر ٹھہر کر تازہ دم ہوا تو گھنٹی بجائی ایک صاحب نمودار ہوئے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا مجھ سے کہا گیا کہ گپتا صاحب آپ کے منتظر ہیں۔ اندر داخل ہوا تو کتابوں کا اسٹور تھا۔ ہزاروں چھوٹی بڑی نئی پرانی کتابوں کا انبار دعوتِ شوق دے رہا تھا مگر نظریں بچا کر میں گپتا صاحب کے حجرۂ خاص میں داخل ہوا۔ میں سامنے رکھی ایک کرسی پر بیٹھ چکا ہوں۔ ہفت روزہ قومی آواز نے اردو اکادمی کے اربابِ اقتدار کے خلاف حق اور انصاف کی جو جنگ چھیڑ رکھی ہے اس کا اثر اتنا شدید ہے کہ اس کے چرچے ہر حلقے میں ہیں۔ شاید میرے پہنچنے سے پہلے گپتا صاحب کے دفتر میں بھی یہی چرچا ہو رہا ہوگا جبھی تو انھوں نے مسکرا کر کہا

"واہ بھئی ہفت روزہ قومی آواز نے تو بڑی جرأت اور ہمت کا ثبوت دیا ہے؟" بات چیت کو آگے بڑھانے کے لیے میں نے گپتا صاحب سے کہا۔

"جناب آپ تو اسی شہر میں رہتے ہیں اور جملہ صفات کے حامل بھی ہیں پھر آپ کو اکادمی کی رکنیت

کیوں نہیں دی گئی؟"

گپتا صاحب میرے سوال پر مسکرائے اور پھر سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا "میرا خدا مجھ سے خوش تھا جو میں اکادمی میں نہیں ہوں ورنہ قومی آواز کے اٹھائے ہوئے طوفاں کا شکار میں بھی ہوتا"۔ (برہائے مذاق)

پھر گپتا صاحب نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"دیکھو بھائی میں تو گوشہ نشین آدمی ہوں۔ اپنا کاروبار کرتا ہوں۔ کاروبار سے فرصت ملتی ہے تو یہ کتابیں جو تمہارے سامنے ہزاروں کی تعداد میں پڑی ہوئی ہیں مجھے اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور میں باقی وقت میں ان ہی کتابوں کی ورق گردانی، مطالعہ اور محاسبہ میں کھو جاتا ہوں۔ یہ صرف مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی ہی کی بات نہیں ہے میں کہیں بھی نہیں جاتا اور کہیں جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے"۔

سوال مگر آپ کو ہندوستان کے ادبی اجتماعات میں بلایا تو جاتا ہوگا؟

تھوڑے وقفے کے بعد رضا صاحب نے بڑے سکوں اور اطمیناں کے ساتھ کہنا شروع کیا "وقت وقت کی بات ہے۔ پہلے تو مجھے اردو کا وہ گروپ جسے محققیں و ناقدیں کا گروپ کہتے ہیں، لائق اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ میں کسی سے کوئی استفادہ کرنے کے لیے خط و کتابت کرتا تو میرے خطوط کے جواب بھی نہیں دیے جاتے تھے مگر اب صورتحال مختلف ہے۔ اب میرے پاس درجنوں خطوط آتے ہیں۔ ادب و تحقیق کے کسی نہ کسی پہلو پر مجھ سے کبھی کبھی معلومات بھی طلب کی جاتی ہیں۔ تقریباً سبھی بڑی کانفرنسوں اور اجتماعوں میں بلایا جاتا ہوں، یہ اور بات ہے کہ عموماً میں شامل ہوتا نہیں"۔

سوال ہاں یہ تو درست ہے گپتا صاحب کہ ان دنوں ممبئی میں آپ کے بڑے چرچے ہیں مگر آپ کی شہرت میں کس کا دخل زیادہ ہے؟ آپ کی نادر و کمیاب کتابوں اور مخطوطوں کے ذخیرے کا یا آپ کی تصنیفات و تالیفات کا؟

جواب کتابوں کا اور مخطوطوں کا ذخیرہ جو میرے یہاں ہے اس کا مقام اپنی جگہ ہے اور میری تصنیفات اور تالیفات کا مقام اپنی جگہ۔ ظاہر ہے میری ادبی اور تحقیقی حیثیت کے تعین میں میری اپنی تصنیفات و تالیفات ہی کام کریں گی۔ میں نے جو نادر و کمیاب کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا ہے ان کی حیثیت جو بھی ہو مگر اس سے ادب اور تحقیق کے میدان میں میری نہ تو شہرت ہوگی اور نہ ہی کوئی مقام ملے گا۔

سوال آپ نے ابھی یہ بات کہی کہ پہلے اردو کے ادیب و محقق آپ کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے تھے مگر اب آپ کے تحقیقی کاموں کی گونج ہے تو اس کا اندازہ آپ کو کس طرح ہوا کہ آپ کے تحقیقی کاموں کو لوگ وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

جواب میرے تحقیقی کاموں کی وقعت و افادیت کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا ہے کہ وہ محقق جو اردو تحقیق کے ستون مانے جاتے ہیں میری تحقیقات کو پڑھ کر میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر

میری کتاب "متعلقاتِ غالب" پر پٹنہ کے مشہور اور بزرگ محقق قاضی عبد الودود نے لکھا کہ "متعلقاتِ غالب پیش نظر ہے۔ یہ غالبیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس سے مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں جو پہلے میرے علم میں نہ تھیں"۔

غالب کے علاوہ اردو کے مشہور شاعر برج نرائن چکبست پر بھی میری جو تحقیقات ہیں انھیں احترام سے دیکھا گیا ہے۔

سوال گپتا صاحب اردو کے سیکڑوں شاعروں میں تحقیقات کی غرض سے آپ نے برج نرائن چکبست کا انتخاب ہی کیوں کیا؟ کیا آپ کے ذہن میں اس طرح کی کوئی بات ہے کہ برج نرائن چکبست پر قصداً اور بربنائے تعصب کام نہیں کیا گیا؟

جواب دیکھیے صاحب ہم اردو کے ہندو ادیب ہیں اور ہماری تعداد اردو کی ادبی تاریخ میں کافی ہے۔ ہم بحیثیت ایک ہندو کے، ایسا سوچتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے ممکن ہے ایسا ہو لیکن میری نظر میں ایسے کئی ادیب و شاعر ہیں جو اتفاق سے مسلمان تھے۔ مگر وہ ناقدین کے انتقاد میں اور ادب میں کوئی جائز مقام نہ پاسکے اور ایسے مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی تعداد ہندو ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ ہے۔ اس لیے اگر ہم یہ سوچتے ہیں کہ اردو کے ہندو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے تو کسی حد تک غلط ہی سوچتے ہیں۔

سوال اب میرے بنیادی سوال کی طرف آیئے کہ آپ نے چکبست پر کام کرنے کا ارادہ کیوں کیا؟

جواب دیکھیے صاحب! میں نے چکبست لکھنوی پر اس لیے کام نہیں شروع کیا کہ وہ ہندو تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے بچپن کے دنوں میں چکبست کا بڑا نام تھا۔ اس کی شاعری کے ہر طرف چرچے تھے۔ اس کے بہت سے اشعار مجھے میرے بچپن کے عہد میں ہی ازبر ہوگئے تھے ایک مدت گزرنے کے بعد جب میں چکبست پر معلومات جمع کرنی چاہیں تو معلوم ہوا کہ ان پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے اور ان کا کلام بھی کہیں پورا کا پورا یکجا شکل میں نہیں ہے۔ دراصل اسی بات نے میرے اندر تحریک پیدا کی اور میں برج نرائن چکبست پر مواد جمع کرتا رہا، اس کے بعد اپنے تحقیق شدہ مواد کے ساتھ ان کے کلام کو یکجا شکل میں میں نے ادبی دنیا کو دیا۔ آپ نے میرا مرتب کردہ "کلیاتِ چکبست" دیکھا ہوگا اور چکبست اور باقیاتِ چکبست بھی ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے آپ پر مترشح ہوگیا ہوگا کہ میں نے اس سلسلے میں کتنی محنت اور کتنی تگ و دو کی ہے۔

سوال جی ہاں میں نے "کلیاتِ چکبست" بھی پڑھا ہے اور "چکبست اور باقیاتِ چکبست" کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ چکبست جیسے عظیم اور اہم شاعر کے کلام کو جس حسن اور ترتیب کے ساتھ جمع کرنا چاہیے تھا آپ نے اسی حسن و ترتیب کے ساتھ ان کے کلام کو جمع کیا ہے اور پھر اس کا مقدمہ اپنی ایک علاحدہ حیثیت رکھتا ہے۔ چکبست اور باقیاتِ چکبست میں برج نرائن چکبست کی حیات اور ان کے فن کے مخفی گوشوں کو آپ نے جس طرح اُجاگر کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ ایک طرفہ شے ہے۔

جواب مگر جناب اردو کے بعض لوگوں نے بجائے اس کے کہ میرے کام کو سراہتے مجھے بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ گپتا صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

سوال آپ کے معترضین کو کیا گلہ ہے؟

جواب بس خدا واسطے کا بیر ہے جس کا مجھے سامنا ہے لیکن میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ اگر دو ایک اشخاص مجھے ناپسند کرتے ہیں تو درجنوں اچھا لکھنے اور پڑھنے والے حضرات جو یہاں سے پاکستان تک پھیلے ہوئے ہیں مجھے پسند کرتے ہیں، اس لیے مجھے اپنے ناقدوں سے کوئی گلہ نہیں ہے اور پھر اس لیے کہ چشمک کس شعبے میں نہیں ہے۔

سوال آپ نے غالبؔ اور چکبستؔ پر یقیناً بڑا کام کیا ہے اب یہ بتائیے کہ دوسرے کس شاعر پر کام کرنے کا ارادہ ہے آپ کا؟

جواب بعض احباب مصر ہیں کہ میں اقبالؔ پر کام کروں۔

سوال کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبالؔ پر ہندوستان اور پاکستان میں جو کام ہوا ہے وہ ناکافی ہے؟

جواب اقبالؔ پر صحیح معنوں میں ابھی تک تحقیقی کام ہوا ہی نہیں ہے۔ ان کی حیات کے بہت سے گوشے ایسے ہیں جو ابھی تک نہ مالکی سے سامنے نہیں لائے گئے ہیں۔ میں نے دانستہ اب تک اقبالؔ پر کم لکھا ہے۔ اب شاید لکھوں۔ چکبستؔ پر میں نے نو سال صرف کیے ہیں۔ اقبالؔ پر اچھا اور معتبر کام کرنے کے لیے مجھے دس سال درکار ہیں۔ اقبالؔ کی جتنی سوانح عمریاں اب تک لکھی گئی ہیں انھیں باقاعدہ تحقیقی طور پر ایڈٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبالؔ پر پڑھتے وقت میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ ان کی سوانح عمریوں کو قلمبند کرتے ہوئے جزئیات کا پاس نہیں رکھا گیا ہے۔ اگر جزئیات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہوتا تو ان کے بارے میں لکھی گئی کتابیں واقعی بہت عمدہ اور مفید ہو سکتی تھیں۔ اقبالؔ کے بارے میں کئی باتیں قیاسی ہیں۔ ان قیاسی باتوں کو تحقیق کے بعد خارج کردینا ضروری ہے۔ اقبالؔ بڑا موضوع ہے اس لیے بہت انہماک چاہتا ہے۔

سوال جناب ذکر اقبالؔ کا ہو رہا ہے تو اقبالؔ کے تعلق سے ایک بات اور بتائیے، اقبالؔ کو برصغیر ہند و پاک کا ایک خاص طبقہ اسلامی شاعر یا مسلمانوں کا شاعر کہنے پر مصر ہے۔ کیا اقبالؔ واقعی صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں؟ اور کیا اقبالؔ کو مسلمانوں کا شاعر سمجھا جائے تو اس سے اقبالؔ کی شخصیت یا حیثیت مجروح ہوتی ہے؟

جواب ویسے اقبالؔ کو میں کسی ایک فرقے کا شاعر سمجھتا نہیں ہوں۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ اقبالؔ کو سیکولر اور ترقی پسند ثابت کرنے پر زور صرف کیوں کیا جارہا ہے۔ فرض کرلو اقبالؔ صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں یا اسلامی شاعر ہیں تو بھی بطور شاعر کیا فرق آتا ہے۔

سوال ہماری گفتگو غالبؔ سے شروع ہوئی تھی۔ چکبستؔ سے ہوتی ہوئی اقبالؔ تک آئی۔ اب اس سے ہٹ کر ذرا اپنی شاعری کے بارے میں کچھ بتائیے کیونکہ بنیادی طور پر تو آپ شاعر ہی ہیں، اس لیے کہ کلیات

چکبست، متعلقاتِ غالب، چکبست اور باقیاتِ چکبست، مشوراتِ جوش ملسیانی، مکتوباتِ جوش ملسیانی، دعائے صباح سے قبل تو ہمیں شعلۂ خاموش، شورشِ پنہاں، شاخِ گل، اور اُجالے وغیرہ ہی پڑھنے کو ملیں۔

جواب یہ درست ہے کہ میں بنیادی طور پر شاعر ہوں۔ میری شاعری افریقہ میں پروان چڑھی۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب میں افریقہ سے ہندوستان آیا تو ایک کاروباری آدمی کی حیثیت سے میں نے یہاں کے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ یہاں کے شاعرانہ ماحول کا میں حصہ نہیں بن سکتا کیونکہ یہاں شعری سانچے بہت کچھ بدل چکے ہیں۔

سوال کیوں؟ ایسا کیوں سوچا آپ نے؟

جواب اس لیے کہ افریقہ میں ایک طویل عرصے تک قیام کی وجہ سے میری شاعری اردو کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہ رہی تھی۔ ڈر تھا کہ میں یہاں کے شعری ماحول کا حصہ نہ بن پاؤں گا۔

سوال آپ کی اس طرح کی تحیلات کے نتائج کیا برآمد ہوئے؟

جواب نتیجے کے طور پر میں نے کچھ عرصے کے لیے شاعری سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اب میری رباعیوں کا مجموعہ "شعاعِ جاوید" شائع ہوا تو میری امید سے کہیں زیادہ اردو کے مشہور نقادوں نے جن میں شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ بھی شامل ہیں، میرے اس مجموعہ کو سراہا اور میرے کلام کے ادبی و فنی محاسن کی داد دی۔

سوال اس کا مطلب یہ کہ آپ کا شعر گوئی سے قطع تعلق کا ارادہ، ارادہ ہی رہ گیا۔ اس پر عمل نہ ہوسکا؟

جواب جی ہاں، کچھ ایسا ہی ہوا۔ میرے کلام کے دو مجموعے اب ایک ساتھ آئیں گے۔ ان دونوں مجموعوں میں جو کلام شامل ہے وہ میرے ہندوستان آنے کے بعد کا کہا ہوا ہے۔ اپنے ان مجموعوں میں شامل کلام کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ بڑی حد تک نئے اسلوب اور نئے آہنگ کا حامل ہوگا تاہم وہ نثری شاعری نہیں ہوگی۔ ایک مجموعۂ نظم ہے اور دوسرا مجموعۂ غزل ہے۔

سوال مگر گپتا صاحب شعر کہتے کہتے آپ پر تحقیق کا ذوق کیسے سوار ہوگیا؟ آپ کاروباری آدمی ہیں، کیا آپ کے لیے یہ راستہ کافی دشوار گذار ہوگا؟

جواب بھائی! میرا ذہن شروع ہی سے تحقیقی تھا۔ مجھے تاریخ سے پہلے ہی سے بہت زیادہ دلچسپی رہی اور تحقیق تاریخ کا ہی ایک جزو ہے۔ اس بنیاد پر میں تحقیق کے کاموں میں لگ گیا۔ میرے والد محترم بھی کتابوں کے بہت شوقین تھے، ان کی جمع کی ہوئی کتابیں بھی پڑھتا رہتا تھا۔ کچھ ان کتابوں کا عمل دخل رہا۔ نتیجے کے طور پر ان تمام عناصر نے مل کر مجھے محقق بنادیا۔ تحقیق کے معاملے میں اس کے ہر ممکن مآخذ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ قیاسی طور پر کوئی بات کہنا مجھے پسند نہیں ہے۔

سوال کچھ باتیں اب اردو زبان کے تعلق سے کر لی جائیں گپتا صاحب؟

جواب بہتر ہے۔

سوال کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کے ساتھ ہندوستان میں کوئی ناانصافی ہو رہی ہے؟

جواب اردو کے سلسلے میں مجھے سب سے پہلی شکایت یہ ہے کہ یہ دوسرے درجے کی زباں سمجھی جانے لگی ہے حالانکہ ہندی کے مقابلے میں یہ ایک پختہ اور شستہ زبان ہے۔ مجھے ہندی زباں کی تنقید لفظی و معنوی سے بڑی چڑ اور کوفت ہوتی ہے۔ اردو یقیناً ایک اہم زباں ہے، اس کی حق تلفی ضرور ہوئی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اب بھی اگر لقمہ لواری ترک کر کے حق پسندی اختیار کی جائے تو اردو جیسی زندہ زباں کو ختم کرنا دشوار امر ہوگا کیونکہ اس کے اندر زندہ رہنے کی زبردست صلاحیت ہے۔ یہ اپنے آپ کو ہر عہد میں نکھارتی اور سنوارتی رہی ہے۔ اور ہندی والے اپنی زباں کو سوارنے کی کوشش نہیں کرتے۔

سوال اردو رسم الخط کے بارے میں بھی رائے دیں گے آپ؟

جواب دیکھیے صاحب! میں لسانیات کا آدمی نہیں ہوں تاہم ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ جہاں زباں کا رسم الخط بدل دیا گیا تھا۔ میری مراد مشرقی افریقہ میں بولی جانے والی زبان سواحلی سے ہے۔ اسے پہلے عربی رسم الخط میں لکھا جاتا تھا۔ لیکن اب رومن رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ اسے انگریزی میں Kiswahili کہتے ہیں۔ جس سے خاک بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ زبان کا نام کیوں ہے لیکن اگر اسے عربی یا فارسی رسم الخط میں سواحلی لکھا جاتا تو فوراً معلوم پڑ جاتا کہ یہ ساحل کی جمع سواحل سے ہی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہ زباں ساحلی لوگوں کی ایجاد کردہ ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی سے بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اردو رسم الخط کو بدلنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کے ذریعے بہت اختصار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ باتیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ویسے دنیا میں اردو کا کیا کسی زبان کا رسم الخط مکمل نہیں ہے۔

(ماخوذ از "قومی آواز"، ممبئی جون ۱۹۸۲ء)

☆☆☆

Mangal Ashees B

Flat No 43, Fourth Floor,

Sector No 12, Kopor Khairane,

Navi Mumbai - 400 709 M. S

کالی داس گپتا رضا سے ملاقات

سنجے گوڑبولے (مراٹھی سے ترجمہ)

سوال مراٹھی عوام کی تفہیم کے لیے یہ بتائیں کہ اردو کا جنم کب اور کہاں ہوا؟

جواب اردو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے لشکر کی چھاؤنی۔ میر کے زمانے میں اسے ریختہ کہتے تھے۔ میں ماہر لسانیات نہیں ہوں، اس لیے اردو کے قدیم رنگ و روپ پر گفتگو نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اردو نے پچھلی کئی صدیوں میں دھیرے دھیرے ترقی کے رستے طے کیے ہیں۔ اردو کا موجودہ روپ سنگھار کئی آئینوں سے ہو کر گزرا ہے۔ ہندوی بھاشا کتنی پرانی ہے، یہ بتلانا بھی دشوار ہے، مثال کے طور پر دلی کے پاس ایک پرانے کنویں پر ایک پتھر موجود ہے اس پر دلی کا نام "دل ہائی" کھدا ہوا ہے۔

سوال موجودہ اردو اور قدیم اردو میں کیا فرق ہے؟

جواب ۱۸۱۰ء میں میر کا انتقال ہوا۔ میر کی شاعری پر فارسی زباں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی لوک گیت اور ہندی چھندوں کا گہرا اثر موجود ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے جب عوامی زبان میں اپنی تخلیق پیش کی تو اس کو ناپسند کیا گیا۔ میر کے بعد لکھنو کے ناسخ نے اردو زبان میں سے ہندی کے "مدھر شبد" نکال کر اس میں فارسی کے خوبصورت لفظ بھر دیے۔ اس سے اردو کو ایک نیا رنگ، نیا آہنگ ملا۔ اس کے بعد فارسی کے محاورے اور روزمرہ کا بھی استعمال کیا (شاعری میں) اس وجہ سے فارسی اور اردو ایک مخلوط زبان کا روپ لے کر عوام کے سامنے آئی۔ اسی فارسی آمیز اردو نے ذوق، غالب اور مومن کی شاعری پر اپنا اثر ڈالا۔ اس کے بعد جہاں استاد داغ دہلوی نے (۱۹۰۵ء - ۱۸۳۱ء) نے عوامی زبان کا استعمال اپنی شاعری میں کثرت سے کیا۔ آج اردو حسن رنگ و روپ میں موجود ہے، ایک طرح سے وہ داغ ہی کی رائج کردہ زبان ہے۔

سوال آپ نے اپنی تحقیق کے لیے صرف غالب ہی کا انتخاب کیوں کیا؟

جواب مطالعے کے بعد مجھے یقین ہوا کہ غالب کی شاعری ہی تحقیق کا موضوع بن سکتی ہے۔ غالب کا تخیل، فارسی پر غالب کی مکمل دسترس، خیالات کی بلندی اور غالب کی مشکل پسندی، ان تمام باتوں سے غالب کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ انیسویں صدی میں دہلی والے فارسی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے وہ غالب کی فارسی آمیز شاعری پسند کرتے تھے۔ غالب کی مشکل پسندی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابتداء میں غالب بے دل سے متاثر تھے۔ غالب، میر کو بھی بڑا شاعر تسلیم کرتے تھے لیکن بعد میں میر کے تعلق سے غالب کا نقطہ نظر تبدیل ہو گیا۔

غالب اگرچہ فی البدیہہ شاعر نہ تھے لیکن فکر اور فارسی زبان دانی میں وہ میر سے بھی بڑے شاعر تھے۔ شاعری کی مختلف اصناف پر غالب نے طبع آزمائی کی ہے لیکن غالب کی شناخت صرف غزل سے ہی نمایاں ہوتی

ہے۔ ذوق سہرا لکھنے میں اور فن استادی میں غالب سے زیادہ مشاق تھے۔ اس کے باوجود زبان دانی اور فنِ شعر میں غالب کے یہاں جوہر زیادہ ہے۔ اسی لیے میں نے غالب کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔

سوال غالب کی دو سو سالہ جشن کی تقریب جگہ جگہ منعقد ہو رہی ہے۔ اس موقعہ پر آپ نے غالب کے حضور کونسا نذرانہ پیش کرنا چاہتے ہیں؟

جواب غالب کی اردو شاعری کو اس کی موت کے ۱۳۰ ر سال بعد بھی عالمی شہرت مل رہی ہے حالانکہ غالب تو اصل فارسی کے شاعر تھے۔ کئی جگہ غالب نے اپنی فارسی میں خسرو اور فیضی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ غالب نے فارسی میں چودہ ہزار شعر کہے ہیں۔ غالب کا فارسی کلیات شائع کرنے کا کام ایراں میں شروع ہو چکا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں غالب کی تمام فارسی شاعری اردو میں منتقل کرکے اسے اصل کے ساتھ شائع کر دوں۔ غالب سے متعلق میں نے غیر مطبوعہ مواد کثرت سے شائع کیا ہے۔ اب بھی سوچ رہا ہوں۔ "شہر شہر غالب غالب" نام سے ایک رسالہ جاری کروں۔ اس میں غالب کے فارسی خطوط، اردو ترجمے کے ساتھ شائع کروں۔ یہ میری خواہش ہے۔ پاکستان نے "دیوانِ غالب تاریخی ترتیب سے" کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں مجھے الٰہ آباد میں ۱۸۴۱ء کا لیتھو پر شائع شدہ ایک دیوانِ غالب دستیاب ہوا تھا۔ اسے میں نے پیش لفظ کے ساتھ عکسی شائع کیا تھا۔ یہ عکسی دیوان بھی اب نایاب ہے۔ میں اسے دوبارہ شائع کرنا چاہتا ہوں۔

سوال آپ کے پاس جو بے شمار ادبی ذخیرہ ہے اس کی اشاعت کے لیے آپ نے کیا منصوبہ بنایا ہے؟

جواب اس کی اشاعت کے لیے میری ساکار اور دل پبلی کیشنز دو کمپنیاں موجود ہیں۔ اپنی کتابوں کی اشاعت کے لیے میں نے آج تک کسی سرکاری ادارے سے کوئی تعاون نہیں لیا ہے۔ حالانکہ میری مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن میرا وجود اردو کی وجہ سے ہے۔ چکبست، جوش، داغ اور فراق کے بعد میں نے ذوق پر جو کام کیا ہے اسے شائع کرنے کا منصوبہ بھی زیرِ غور ہے۔ میں نے ان گنت ادبی کتابوں کے پیش لفظ اور حرفے چند لکھے ہیں اور معروف ادبی رسائل کی سرپرستی کی ہے۔

سوال ممبئی اردو کا مرکز بن گیا ہے، کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

جواب کوئی زبان کسی کی ملکیت نہیں ہوتی۔ آزادی سے قبل بیشتر ہندوستان میں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہوتی تھی، وہ بھی اردو سیکھتے تھے۔ لیکن آج صورتحال مختلف ہے۔ آزادی کے بعد ریاستوں کی تقسیم زبانوں کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ پھر بھی مہاراشٹر اور ممبئی میں اردو کی حالت بہتر ہے۔ مہاراشٹر میں ۱۴۸۰ ر اردو اسکولیں ہیں۔ بے شمار کتابیں اور رسائل اردو میں شائع ہوتے ہیں۔ دلی اور لکھنو کی اردو کی ہم تعریف کرتے ہیں البتہ مہاراشٹر میں اردو کی ترقی ہو رہی ہے اور ممبئی جیسا شہر اردو کی ٹکسال بن چکا ہے۔ اردو کی جو خوبیاں ہیں ان کی وجہ سے میرے جیسا آریہ سماجی بھی اردو پرست بن گیا۔ حال ہی میں شولاپور میں آل انڈیا اردو میلہ ہوا۔ ایسی کوششیں دیگر مقامات پر بھی کی گئیں۔ اس لیے اردو کی ترقی کو کوئی روک نہیں سکتا۔

☆☆☆

علامہ کالی داس گپتا رضاؔ کے ادبی سفر

رضاؔ، مشرقی افریقہ میں

وجے اروݨ

میری ہی ایک غزل کا مقطع ہے ۔

خورشید بن کے روز نکلتا ہوں مَیں اروݨ	دیتا ہوں سب کو دھوپ یہی کام کاج ہے

مَیں نے یہ شعر اپنے تخلص اروݨ (سنسکرت میں چڑھتا سورج) کی رعایت سے لکھا تھا، لیکن مشرقی افریقہ میں جناب کالی داس گپتا رضاؔ صاحب نے اردو کے فروغ، بالخصوص اردو شاعری کی ترویج کے لیے جو بیس سال تک بے پناہ کام کیا، اُس پر یہ شعر بالکل ٹھیک اُترتا ہے۔

رضاؔ صاحب نے اپنے کلام میں جگہ جگہ اردو زباں سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے ۔

تجھ سے میں اے حسینۂ اردو	لوگ کہتے ہیں پیار کرتا ہوں
پیار ہی تجھ سے مَیں نہیں کرتا	جاں تجھ پر نثار کرتا ہوں

میں جس پر فدا ہوں وہ اردو زباں ہے

جائیں تو کدھر جائیں بتا اے ستِ اردو	برباد ترے روپ کے، مارے تری لٹ کے
ہندو ہے نہ مسلم ہے رضاؔ مذہب اردو	دونوں ہی کی آغوش میں یہ پھولی پھلی ہے
دھکے دیتا ہے ہر اک چھوٹا بڑا اردو کو	ہائے کیا میٹھی زباں ملک بدر ہوتی ہے

رضاؔ صاحب سے میری پہلی ملاقات ۲۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو "بزم سخن" نیروبی کی جانب سے ایڈوکیٹ جناب عبد الرؤف صاحب (بعد میں مجسٹریٹ) کے مکان پر ہوئے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ کینیا میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے کی غرض سے مجھے نیروبی پہنچے صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔ اسی اثنا میں میری واقفیت ایشر سنگھ اینڈ سنز کے سردار کرپال سنگھ اور پنجابی شاعر سردار نرنجن سنگھ رنجن سے ہو چکی تھی۔ اُنہیں نے مجھے مندرجہ بالا مشاعرے کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ اس دن مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ سو مشاعرے کے دن ہم تینوں سردار کرپال سنگھ کی کار میں وہاں پہنچے۔ مشاعرہ غالباً شروع ہو چکا تھا۔ طرح مصرعہ پر غزلیں پڑھی جا رہی تھیں۔ مجھے اُن ہر دو حضرات نے طرح مصرعہ کے بارے میں بالکل نہیں بتایا تھا۔

وہاں مَیں نے دیکھا کہ ایک دراز قد، بھرے بھرے جسم والا، سانولا لیکن خوش شکل، عمر میں مجھ سے کوئی دس برس بڑا ایک نوجوان اُس فرشی مشاعرے کے میر مشاعرہ کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سر انجام دے رہا تھا۔ وہ جناب کالی داس گپتا رضاؔ تھے۔

بنا کوئی خاص حاشیہ آرائی کے وہ ایک کے بعد ایک شاعر کا نام پکارتے جاتے تھے اور وہ شاعر طرحی

مصرعہ پر اپنا کلام آکر پڑھ دیتا تھا۔ طرحی مصرعہ تھا

فروغِ مال سے روشن حسین نہیں ہوتی

آخر میں جناب رضا صاحب نے اس مصرعہ پر اپنی غزل پڑھی۔ اب تک کسی بھی شاعر کا کوئی شعر میرے ذہن نشیں نہ ہو سکا تھا۔ لیکن رضا صاحب کی غزل کے مندرجہ ذیل دو شعر اسی وقت میرے ذہن میں بیٹھ گئے ۔

دوائے دردِ محبت کہیں نہیں ہوتی	یہی نہیں کہ یہیں یا وہیں نہیں ہوتی
حسین کہنے سے دنیا حسیں نہیں ہوتی	جگر کے خوں سے رنگ اس میں بھرے پڑتے ہیں

یہ غزل رضا صاحب کے سب سے پہلے مجموعہ کلام "شعلہ خاموش" کے صفحہ ۲۵۱ پر موجود ہے لیکن مندرجہ بالا پہلا شعر اس میں شامل نہیں ہے اور دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ کو یوں بدل دیا گیا ہے ۔

نگاہِ شوق سے رنگ اس میں بھرے پڑتے ہیں[1]

بقول رضا صاحب "اصلاحِ سخن کبھی مکمل نہیں ہوتی"۔ (مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا، صفحہ ۷۹)

مندرجہ بالا دونوں اشعار کے اُسی وقت میرے ذہن نشین ہو جانے کی وجہ اُن کی سادگی ہے، اگرچہ اس غزل میں اور بھی اچھے اشعار ہیں، جیسے کہ ۔

جفائے حسن بھی کچھ کم حسیں نہیں ہوتی	ستائیں لاکھ وہ ہم سے نہیں نہیں ہوتی
نگاہ آپ کی کب اوّلیں نہیں ہوتی	نئے ہی ڈھنگ سے ہر بار دیکھتے ہیں مجھے
نظر غریب کی کم دوربیں نہیں ہوتی	یہ اور بات ہے آنکھیں ہی بند کر لے وہ

غیر طرحی دَور میں مجھے بھی اپنا کلام پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ میں نے ایک غزل پڑھی۔ فرمائش ہوئی کہ ایک اور پڑھوں۔ سو میں نے ایک اور غزل بھی پڑھ دی۔

بچپن ہی سے مجھے شعر و شاعری سے شغف ہے۔ میں اساتذہ کا کلام بڑے غور و تعمق سے پڑھتا رہا ہوں اور اسی طرح مشاعروں میں شعراء کا کلام بھی سنتا رہا ہوں۔ سو فنِ شاعری کے کچھ کچھ نکات سمجھ میں آگئے تھے۔ کلام پڑھنے کا میرا انداز بھی اچھا ہے۔ سو بچپن ہی سے مجھے اسٹیج پر کلام پڑھنے کے مواقع ملتے رہے تھے۔ لیکن حصولِ تعلیم کی سرگرمیوں کی وجہ سے مجھے تب تک کسی استاد سے اپنے کلام پر اصلاح لینے کا موقعہ

---

[1] ساحر لدھیانوی نے بھی اپنی مشہور نظم "تاج محل" کے بند ۔

مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستون	یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
جذب ہے ان میں ترے اور میرے اجداد کا خوں	سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور

کے تیسرے مصرعہ کو بعد میں یوں بدل دیا تھا ۔

سینۂ دہر پہ اس رنگ کی گلکاری ہیں

نہیں ملا تھا۔ لیکن فن شاعری میں مجھے اپنی کیوں کا احساس ضرور تھا۔ سو اب جناب رضا صاحب کو سامنے دیکھ کر دل نے کہا کہ لے تجھے رہبر مل گیا!

اس مشاعرے کے چند دن بعد ہی جناب قاری محمد اسحٰق صاحب مرزا، جو مرزا قاری کے نام سے معروف تھے، ان سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بزمِ سخن کے رکن تھے اور مندرجہ بالا مشاعرے میں موجود تھے۔ ان سے کیا بات چیت ہوئی یہ تو اب یاد نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے شعر و شاعری میں اُنھیں اپنا استاد بنا لینے کی بات نہیں کہی تھی۔ اس کے ایک دو دن بعد ہی "بزمِ سخن" کے سب سے سرگرم رکن جناب مومن علی صاحب حیدری سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے جناب کالی داس گپتا رضا صاحب کا پتہ پوچھ لیا۔ بس ایک دن مَیں جناب رضا صاحب کے دفتر پہنچ گیا۔ رضا صاحب کے کمرے میں اس وقت ان کے بڑے بھائی جناب کشمیری لال گپتا صاحب بھی، جو کہ مزاحیہ کلام کہتے تھے، موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر دونوں بہت خوش ہوئے۔ تھوڑی سی رسمی بات چیت کے بعد جناب رضا صاحب کہنے لگے کہ جناب مرزا قاری صاحب آئے تھے اور وہ کہہ رہے تھے کہ آپ فن شاعری میں اُنہیں اپنا اُستاد بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے فی الفور جواب دیا کہ کیا کوئی شخص چشمہ کو چھوڑ کر جوہڑ پر پانی پینے جاتا ہے۔ بس پھر کیا تھا، میں اُسی دن سے جناب کالی داس گپتا رضا صاحب کے حلقۂ تلمذ میں آگیا۔

یہ بتا دوں کہ اُس وقت نیروبی میں اردو شعراء کی ایک بڑی تعداد جناب رضا صاحب سے اصلاح لیتی تھی۔ مجھ جیسے بہت سے شاعر تو ببانگ دہل رضا صاحب سے اصلاح لینے کا اقرار کرتے تھے لیکن چند ایک شاعر یہ کام در پردہ کرتے تھے۔ جناب رضا صاحب کی ایک خاص صفت وہاں بھی اَور یہاں بھارت میں بھی یہ رہی کہ وہ حتی الوسع اس بات کو چھپائے رکھتے تھے کہ اُن سے کون کون شخص اصلاح لے رہا ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں نہ کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

آج رضا صاحب کو ایک بلند مرتبت محقق، ناقد، ادیب اور شاعر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لیکن مشرقی افریقہ میں اپنے بیس سال کے قیام کے دوران جناب رضا صاحب صرف شاعر تھے۔ یوں فن شاعری میں مشہور شاعر استاد الفصاحت حضرت جوش ملسیانی کا شاگرد ہونے، اردو فارسی میں منشی فاضل اور ادیب فاضل جیسے امتحانات پاس کرنے اور سب سے بڑھ کر اپنی اردو دوستی، روشنی طبع اور مشفق طبیعت کی وجہ سے وہ وہاں بیشتر شاعروں کے رہنما رہے۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۶۹ء کو نیروبی کے سر علی کلب کے شاندار ہال میں جناب رضا صاحب کے لیے جو الوداعی مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا، اس میں رضا صاحب کے بارے میں مَیں نے جو دو قطعات بالخصوص کہے تھے، وہ ان کے اس کام پر روشنی ڈالتے ہیں ۔

تار دل کے نہ ساعت سے کبھی یوں ملتے ایسے لمحات اروں ہم کو کہاں کب ملتے

حو نہ کی ہوتی نگہبانی رضا نے یاں پر پھول ہرگز نہ کبھی شعر و ادب کے کھلتے

چاہتا ہے کہ رہے ہند میں آباد رضا اچھا! جائے یہ جہاں پر بھی رہے شاد رضا
لکھا جائے گا یہ تاریخ سخن گوئی میں کہ یہاں بیس برس تک رہا اُستاد رضا

جناب رضا صاحب جون ۱۹۴۹ء کے وسط میں "کمپالا" نامی بحری جہاز سے مشرقی افریقہ کے لیے روانہ ہوئے اور کوئی دس دن کے سفر کے بعد ان کا جہاز ملک کینیا کی بندرگاہ ممباسہ پہنچا۔ دس دن کا بحری سفر کافی طویل ہوتا ہے۔ وقت کاٹنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ میں نے خود مشرقی افریقہ کے لیے اپنا پہلا سفر بحری جہاز ہی سے کیا تھا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ایک شاعر کے لیے یہ سفر کاٹنا اتنا مشکل نہیں رہتا۔

رضا صاحب کے ایک ہم سفر کوئی چودھری صاحب تھے۔ یہ مشرقی افریقہ کے پرانے باشندے تھے، جو کہ واپس مشرقی افریقہ جارہے تھے۔ وہ الہٰ آباد سے کچھ آم بھی خرید لائے تھے۔ اب آگے کی داستان خود رضا صاحب کی زبانی سنیے

"یہ آم بے حد میٹھے اور ذائقہ دار تھے۔ مجھے بھی عنایت ہوئے۔ اتفاق سے چودھری صاحب کو شعر و شاعری سے رغبت تھی۔ میری مشق کا زمانہ تھا۔ بدیہہ گوئی اور بات بات پر مختلف اصناف و اوزان میں فکر شعر میری عادت ثانیہ بن گئی تھی۔ میں نے گھنٹہ بھر میں پندرہ بیس رباعیاں کہہ لیں۔ ایک کے بعد ایک رباعی کہتا گیا اور سناتا گیا۔ کچھ یاد رہ گئیں"۔

رضا صاحب نے اپنے اس مضمون میں چار رباعیاں درج کی ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں ایک رباعی درج کی جاتی ہے ۔

گھر گھر کے گھٹا اُٹھی وہ چھائے بادل ہے رنگ فضا ایسی کہ جیسے کاجل
ایسے میں پھر اے چودھری صاحب! لاؤ وہ آم جو لذت میں تھے شربت کا بدل

رُباعی سب سے مشکل صنف سخن سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ چالیس برس کی عمر سے پہلے رباعی نہ کہنا چاہیے۔ ایک تو اسے اس کے مخصوص چوبیس اوزانوں میں ہی کہنا ہوتا ہے۔ دوسرے مضمون کو چار مصرعوں میں مربوط رکھنا ہوتا ہے، لیکن جناب رضا صاحب چڑھتی جوانی ہی میں اتنی آسانی سے ایک گھنٹہ میں اتنی رباعیاں کہہ لیتے تھے، یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔

جناب رضا صاحب نے اپنے اس دس دن کے بحری سفر کے دوران اور بھی بہت سا کلام کہا جو کہ ان کی کتاب "بہار اردو گلشن مشرقی افریقہ میں" میں درج ہے۔ یہاں اُن کا صرف ایک کلام دیا جاتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ جب جہاز ممباسہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہو گیا اور امیگریشن وغیرہ پر ابھی کافی وقت خرچ ہونا تھا، تو شاعری نے پھر زور مارا اور رضا صاحب سے یہ اشعار کہلوائے ۔

سر کو پھوڑیں گے تو تجھ تک بھی پہنچ جائیں گے ہم　　گرتے پڑتے تری دیوار تک آ پہنچے ہیں
راہ میں تیری کٹالیں گے ہم اپنا سر بھی　　اب تو عاشق رسن و دار تک آ پہنچے ہیں
کیا عجب یار کے رُخ کا بھی نظارا کرلیں　　چل کے جب جلوہ گہ یار تک آ پہنچے ہیں
اے دلِ زار ! یہ کیا ، بند کر آہ و زاری　　نالے اب ہونٹوں سے انکار تک آ پہنچے ہیں
سرخیٔ نقشِ قدم صاف بتاتی ہے کہ ہم　　کھوج میں گل کی خس و خار تک آ پہنچے ہیں
یا رب ! اب ختم بھی کر راہ کہ اشک خاموش　　بہہ چلے اتنے کہ رُخسار تک آ پہنچے ہیں

جناب کالی داس گپتا رضاؔ صاحب ممباسہ میں دو تین دن رُکنے کے بعد وہاں سے کوئی تین سو میل دور کینیا کے دار الخلافہ نیروبی پہنچے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے پہلے پہل جن مشاعروں میں حصہ لیا اور جو تاثرات اخذ کیے اس کے بارے میں لکھنے سے پیشتر یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ رضاؔ صاحب مجھے بہت عزیز مانتے تھے۔ اس کی چند ایک وجوہات ہیں، لیکن ان پر نہ جاتے ہوئے اس عزیز داری کا ذکر مَیں نے اس لیے ضروری سمجھا ہے کیونکہ انھوں نے مجھے چند وہ باتیں بتائی تھیں، جنھیں اُنھوں نے اپنی تصنیفات میں نوکِ قلم پر لانا تو کجا شاید ہی کسی اور سے اُن کا ذکر کیا ہو۔ ان کی شریف النفسی اُنہیں ایسا کرنے سے روکتی تھی لیکن آدمی کسی سے تو وہ سچائی بیاں کرتا ہی ہے جس میں کچھ اصلیت ہو۔

جناب رضاؔ صاحب نے نیروبی پہنچنے کے بعد ایک دو مشاعروں میں جب شرکت کی تو ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہاں کے شاعر فن شاعری میں کس قدر ناپختہ کار تھے۔ اس بارے میں رضا صاحب اپنی کتاب "بہار اردو گلشن مشرقی افریقہ میں" کے صفحہ ۶۹ پر یوں رقمطراز ہیں

"یہ وہ زمانہ تھا جب میں جوش ملسیانی شاگرد جہاں استاد داغؔ دہلوی ایسے ماہر عروض اور زباں داں سے اصلاح لیتا تھا۔ اس لیے مشرقی افریقہ کے شاعر جو بیشتر نیروبی ہی میں رہے، نظروں میں نہیں سماتے تھے کیونکہ یہ شاعر زیادہ تر شوق اور موروثیتِ طبع ہی کے بل بوتے پر شعر کہتے تھے اور باقاعدہ تربیت سے محروم تھے زباں، بیان اور فن کی غلطیاں عام تھیں جو مجھے بہت ناگوار گزرتیں۔ سامعین بھی صحیح داد دینے سے قاصر تھے

غالبؔ کا ایک مشہور مصرعہ ہے ع روک لو گر غلط چلے کوئی　　جناب رضاؔ صاحب بہت ہی صاف آدمی تھے۔ بھولے بھٹکوں کو راہ دکھانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ اس سے ا مشاعرے میں پہنچے تو کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے۔ جو شاعر بھی کلام پڑھتا اس میں جو جو بھی فنی سقائم ہو۔ انہیں نوٹ کرتے جاتے۔ جب سب پڑھ چکے تو انھوں نے صاحب صدر سے شاعروں کے کلام پر تبصرہ کرنے کے لیے وقت مانگا جو کہ اُنھیں مل گیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک ایک شاعر کی شعری لغزشوں کا کچا چٹھا پیش کیا۔ دوسرے ہی دن وہاں کے انگریزی اخبار "دی کولونیل ٹائمز" (The Colonial Times) میں ایڈوکیٹ سنگھ (بعد میں جسٹس) نے اس مشاعرے کی رپورٹ لکھتے ہوئے سرخی دی "اٹھارہ برس کے لڑکے نے اس

کے بخئے اُدھیڑ دیے" (Boy of 18 slashes Ustads)۔ رضا صاحب نے اُنہی دنوں کے اپنے تاثرات کو اپنے پہلے مجموعہ کلام "شعلہ خاموش" کے صفحہ ۱۶۹ پر اس طرح درج کیا ہے

نیروبی میں ایک مشاعرے کے بعد

شاعر کی نہ شاعری کی عزت دیکھی — تحقیر غزل ، نظم کی ذلت دیکھی
تھا تو وہ مشاعرہ مگر آنکھوں نے — اشعار کی بدترین صورت دیکھی

محفل میں کئی ٹاٹ کے پیوند ملے — محفل میں بہت تھوڑے ہنر مند ملے
چالیس میں بس پانچ ہی شاعر ہوں گے — باقی جو تھے پینتیس وہ "تک بند" ملے

ہر نظم کو شاعری پہ دھبا کہیے — ہر شعر کو خامیوں کا لتا کہیے
اک بحر میں سو بحریں اکٹھی ہوں اگر — کیوں اس کو نہ چوں چوں کا مربا کہیے

نتیجہ یہ کہ جن شاعروں نے اپنے سر کے پیچھے اُستادی کا ہالہ قائم کیا ہوا تھا، اُنھیں رضا صاحب کی موجودگی سے وہ ہالہ غائب ہوتا نظر آیا۔ پہلے تو انھوں نے رضا صاحب کا سامنا کیا لیکن پھر وہ جلد ہی لنگوٹیاں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن ایک بات ہے کہ دیار غیر ہونے کی وجہ سے مشرقی افریقہ کے ایشیائی لوگوں میں حد نہ اخلاص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر شعراء نے رضا صاحب کی آمد کو اپنی خوش قسمتی جانا اور اُن سے اصلاح لینے لگے۔

چنانچہ رضا صاحب کی بدولت وہاں ادبی سمت کا تعین ہوگیا۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو "محفل ادب" وجود میں آئی۔ چار پانچ سال تو یہ ادارہ خوب سرگرم رہا۔ اس کے جھنڈے تلے کئی ایک مشاعرے ہوئے لیکن پھر اس پر جمود طاری ہوگیا۔ چنانچہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسی تنظیم قائم کی جائے جو صرف دیرپا ہی ثابت نہ ہو بلکہ اونچی سطح پر گورنمنٹ براڈ کاسٹنگ سروس (Voice of Kenya) پر بھی اردو رساں کو مزید تقویت دے۔ چنانچہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کو "محفل ادب" کی جگہ "بزمِ سخن" وجود میں آئی جس کے صدر جناب کالی داس گپتا رضا صاحب منتخب ہوئے۔

"بزمِ سخن" کے جھنڈے تلے متعدد مشاعرے منعقد ہوئے۔ اس بارے میں جناب رضا صاحب اپنی کتاب "بہارِ اُردو گلشن مشرقی افریقہ میں" کے صفحہ ۸۷ پر اس طرح رقم طراز ہیں

" لوگوں کے ذوق میں اس قدر ترقی ہوئی کہ اگر کچھ عرصے بزم سخن منعقد نہ ہوتی تو اس کے انعقاد کے لیے شائقین کی طرف سے اصرار شروع ہو جاتا۔ اقبال ڈے، یوم عید میلاد النبی، عید الفطر، جشن

دیوالی، مہاراجہ رنجیت سنگھ ڈے، سوامی شردھانند شہیدی دوس، قائد اعظم ڈے، سردار پٹیل ڈے، ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں کی شادیوں پر سہرے، آریہ سماج، سانن دھرم کے سالانہ جلسوں کے مشاعرے، ریڈیو پر مشاعرے، گھروں میں تقاریب غرض کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا تھا، جس پر پوری تابانی کے ساتھ محفل برپا کی جاتی تھی۔ میرے قیامِ افریقہ کے آخری چار سال آغاز ۱۹۶۶ء سے آخر ۱۹۶۹ء تک تو میرے غریب خانے پر ہر ماہ محفل مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی جس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر ماہر القادری (مرحوم) بھی بھری محفل میں کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ لکھنو اور دہلی کی محفلیں آنکھوں میں پھر گئیں"۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں کینیا میں اُس وقت وارد ہوا جب کہ "بزم سخن" ابھی نئی نئی وجود میں آئی تھی۔ اس تنظیم کے زیر سایہ منعقد ہونے والے تقریباً ہر مشاعرے میں میں شامل تھا۔ میں نے اس کی سرگرمی دیکھی بھی اور سنی بھی۔ اس کے آخری دور میں اس کی سستی کی ایک بڑی وجہ ایشیائیوں کے سامنے کھڑی ہو جانے والی فکر مستقبل تھی۔ جناب رضا صاحب "بزم سخن" کے پہلے صدر منتخب ہوئے تھے اور وہ آخر تک دستور اس کے صدر رہے۔ لیکن صدر تو صدر ہی ہوتا ہے۔ وہ تو ہدایت دیتا ہے، جہت بتاتا ہے۔ بھاگ دوڑ کا کام تو اولا سیکریٹری کا ہوتا ہے یا پھر کوئی ایک یا دو کمیٹی ممبر اس کام کو کرتے ہیں۔ کسی بھی مشاعرے کا انتظام کرنا بڑی دوڑ دھوپ کا کام ہوتا ہے۔ میرے خیال میں "بزمِ سخن" میں یہ کام جناب مومن علی صاحب حیدری کیا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ صرف کمیٹی ممبر تھے لیکن جب تک وہ نیروبی میں رہے "بزم سخن" کی جانب سے متواتر مشاعرے ہوتے رہے۔ کبھی عام مشاعرے اور کبھی کسی کے گھر پر خاص مشاعرے۔ جناب حیدری صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد یہ سلسلہ تقریباً منقطع ہو گیا۔ یوں چند سالوں کے بعد جناب رضا صاحب کے گھر پر ہر ماہ محفل مشاعرہ منعقد ہونے لگی۔ اس کی ترغیب میں راقم الحروف کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ محفل مشاعرہ آغاز ۱۹۶۶ء سے آخر ۱۹۶۹ء تک یعنی کہ رضا صاحب کے بھارت لوٹنے تک جاری رہی۔

"بزم سخن" کی جانب سے منعقد ہونے والے پہلے مشاعرے کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ اب اس کی جانب سے منعقد ہونے والے اس سے اگلے مشاعرے کا ذکر کرنا یہاں مناسب ہوگا۔ یہ ایک زبردست مشاعرہ تھا اور میرے لیے ایک یادگار مشاعرہ بھی ثابت ہوا۔ یہ مشاعرہ ۹ / جولائی ۱۹۶۰ء کو محرم الحرام کے موقعہ پر کوکی مسلم کمیونٹی ہال میں منعقد ہوا۔ چونکہ اس جلسے میں غزلیں بھی پڑھی جانی تھیں اور اس لیے بھی کہ کہیں یہ جلسہ مذہبی تقریب نہ بن کر رہ جائے، اس کو مسالمے کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے صدر پاکستان کے کمشنر جناب کے ایف سجان تھے۔ کمشنر آف انڈیا کی طرف سے جناب ایم ایم کے آنند شامل ہوئے کیونکہ کمشنر صاحب بلجیئن کانگو کے دورے پر تھے۔ اس مشاعرے کے اشتہار میں ۳۳ شاعروں کے نام تھے، جن میں سے سات ہندو تھے۔

اسی ضمن میں یہ بھی بتا دوں کہ "بزم سخن" جس کے صدر جناب کالی داس گپتا رضا تھے، نے اردو کے

وقار کو تو ایک عرصے تک قائم رکھا ہی، اس نے ہندوستانی اور پاکستانی سفارت خانوں کو قریب تر لانے کا زبردست کام بھی انجام دیا۔ "بزم سخن" جب کوئی بڑا پروگرام منعقد کرتی تو دونوں سفارت خانوں کو دعوت شمولیت دیتی۔ ایک خاص وفد دونوں ملکوں کے کمشنروں کو، جس میں ایک کو جلسے کی صدارت سونپی جاتی، مدعو کرنے کے لیے جاتا اور عموماً کامیاب ہو کر لوٹتا۔

مندرجہ بالا مشاعرے کا مصرعہ طرح تھا ۔

قوم نے سمجھا نہ مفہومِ شہادت اے حسینؑ

جناب رضا صاحب نے اس طرحی سلام میں ۱۴/ اشعار پڑھے تھے۔ اختصار کو دیکھتے ہوئے قارئین کی دلچسپی کے لیے صرف مطلع کے بعد کا شعر یہاں تحریر کیا جاتا ہے ۔

تیری عزت، تیری عظمت سے اجازت مانگ کر
کہہ رہا ہوں قصہ حق و صداقت اے حسینؑ

ظاہر ہے کہ رضا صاحب نے سب سے بعد میں پڑھا۔ اُن کا یہ کلام ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ لیکن یہ بات شک ظاہر ہے کہ جناب رضا صاحب کا کلام پڑھنے کا انداز کوئی بہت اچھا نہ تھا۔ اس بات کو جناب قمر جلال آبادی صاحب نے رضا صاحب سے متعلق اپنے ایک مضمون میں اس طرح لکھا ہے "ان کا شعر پڑھنے کا انداز پُر سکون ہے۔ اس میں داد لینے کی تڑپ نہیں۔ جیسے وہ خود کو سنا رہے ہوں۔ جیسے وہ جانتے ہیں کہ شعر اچھے ہیں"۔

اپنی باری آنے پر مَیں نے جو طرحی سلام پڑھا، اس میں سات اشعار تھے۔ ان میں سے ایک شعر یہ تھا

تھیں جو پیغمبر کو اُمیدیں وہ پوری تو نے کیں
اے مقدم ، اے نگہبانِ رسالت، اے حسینؑ

بیرونی نیعنی کہ کینیا میں یہ میرا پہلا عام مشاعرہ تھا۔ میرا طرحی سلام اچھا پڑا تھا۔ میرا تحت اللفظ پڑھنے کا انداز بھی موثر ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا ایک ایک شعر سامعین کو مسحور کر رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مندرجہ بالا شعر کے دوسرے مصرعہ میں جب میں بحر کے ارکان کے مطابق پہلے 'اے مقدم' کہہ کر ذرا سا رُکا، پھر 'اے نگہبانِ رسالت' کہہ کر ذرا سا رُکا تو جناب مومن علی صاحب حیدری نے والہانہ انداز میں بلند آواز سے 'اے حسینؑ' کہہ دیا۔

طرحی دور کے بعد انٹرول تھا۔ جناب رضا صاحب اور صاحبِ صدر اپنی اپنی کرسیوں سے اُٹھ کر اسٹیج سے دور جا کھڑے ہوئے تھے۔ میں ان دونوں کی قربت حاصل کرنے کے لیے ان کے قریب چلا گیا۔ صاحب صدر نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ بھئی! آپ کا کلام تو مجھے رضا صاحب کے کلام سے بھی اچھا لگا۔

مجھے صاحب صدر سے اس جملے کی اُمید نہیں تھی۔ خاص طور سے تب جب کہ رضا صاحب بھی ساتھ

ہی کھڑے تھے۔ لیکن مَیں نے دیکھا کہ رضؔا صاحب اس تبصرے سے ذرا بھی چیں بجبیں نہیں ہوئے۔ مَیں نے خود کو شرمسار محسوس کرتے ہوئے فوراً کہا کہ میرا کلام رضؔا صاحب کا اصلاح کیا ہوا ہے۔

اصلاح کا ذکر چھڑا ہے تو عرض کردوں کہ جناب رضؔا صاحب کو اس میں ملکہ حاصل تھا۔ انہیں اس کام کے لیے زیادہ سوچنا نہیں پڑتا تھا۔ وہ کسی کے بھی کلام پر بہت جلدی اصلاح کردیتے تھے۔ نیرولی میں اُن کے دفتر میں شاعر لوگ اس کام کے لیے پہنچتے رہتے تھے۔ میرے جیسے چند ایک، جنھیں ان کے دولت کدے پر جانے کی اجازت تھی، کئی بار مشاعرہ شروع ہونے سے ایک دو گھنٹے پہلے ان کے گھر پر بھی پہنچ جاتے تھے اور ان سے یہ کام کروا لیتے تھے۔ اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار جناب جوگندر پال صاحب کے بھوئی صاحب جناب ٹھورام ناگپال صاحب شائقؔ تو جائے مشاعرہ کے باہر کھڑے رہتے تھے اور جیسے ہی رضا صاحب وہاں پہنچتے تھے ان سے وہیں کھڑے کھڑے اصلاح کروالیا کرتے تھے۔ رضؔا صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ایک دو بار جب انھوں نے شائقؔ صاحب سے کہا کہ وہ ان سے پہلے مل کر اصلاح کیوں نہیں کروالیا کرتے تو شائق صاحب نے کہا تھا کہ جب اس طرح سے اصلاح ہو جاتی ہو تو وہ خاص طور سے ملنے کی زحمت کیوں گوارا کریں۔

اس ضمن میں یہ عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اصلاح کے کام کو کلام گوئی سے زیادہ مشکل کام مانا جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اصلاح کرنے والے کو اصلاح کروانے والے کے ذہن میں بیٹھ کر اس کے معیار کے مطابق اصلاح کرنی ہوتی ہے۔ اپنے تخیلات کو اس پر تھوپنا نہیں ہوتا۔ اس بارے میں ایک دلچسپ تذکرہ ہے کہ ایک بار کسی مشاعرے میں جانے سے پہلے جناب حفیظؔ جالندھری صاحب نے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ آج مَیں کون سا کلام پڑھوں۔ ایک شاگرد نے فوراً جواب دیا کہ آپ میرا کلام پڑھ دیجئے۔ حفیظؔ صاحب نے ڈانٹتے ہوئے کہا ابے! تیرا کلام کیسے پڑھ دوں۔ شاگرد نے جواب دیا کہ میرے کلام میں اس قدر ترمیم ہو گئی ہے کہ اب وہ میرا کلام رہا ہی نہیں"۔

اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ رضؔا صاحب کے نیرولی پہنچنے سے پہلے وہاں کئی ایک شعراء نے اپنا سکہ جمایا ہوا تھا۔ اُن میں سے بیشتر تو فنِ شاعری پر رضؔا صاحب کی دسترس کے قائل ہوگئے اور ان سے مشورۂ سخن لینے لگے۔ لیکن چند ایک ان کی علمیت سے مرعوب ہونے کے باوجود اپنا جھنڈا الگ دکھانے کی کوشش کرتے رہے۔ جیسا کہ میں اوپر ذکر کرچکا ہوں جناب رضؔا صاحب عموماً یہ بات ظاہر نہیں کرتے تھے کہ کون کون شخص ان سے اصلاح لے رہا ہے۔ لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اور محسوس کیا اس سے اندازہ لگا سکتا ہوں کہ جناب سجاد حسین ششیؔ، جناب نریندر ناتھ زاہدؔ، جناب علی جمال جمالؔ، پنڈت لکشمی نارائن گردشؔ، موخر الذکر لوگوں میں سے تھے۔ جناب مرزا قاریؔ تو ایسے شخص تھے جو رضؔا صاحب سے اصلاح بھی لے لیتے تھے اور انہیں آنکھیں بھی دکھاتے تھے۔ میرے سامنے کا ہی ایک واقعہ ہے کہ مَیں جناب رضؔا صاحب کے دفتر میں ان کے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ مرزا قاریؔ صاحب جناب رضا صاحب سے کسی لفظ یا شاعرانہ نکتے پر اتفاق نہ رکھتے ہوئے سیخ پا ہو کر

اس بات کی دوہائی دیتے رہے تھے کہ وہ بھی ایک عالم ہیں۔ اس کے فوراً بعد ہی جب جناب قاری صاحب وہاں سے چلے گئے تو رضا صاحب نے مجھ سے کہا کہ آج پہلے تو قاری صاحب نے اپنے کلام پر اصلاح لی اور پھر

ایک بار جناب شری بیدر ناتھ زاہد کی زباں سے بھی جاں حسرت کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ ۷ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ڈچز آف گلاسٹر اسکول میں مشاعرہ تھا۔ مصرعہ طرح تھا ۔

دم بھر نہ ٹھہرے سامنے آکر چلے گئے

زاہد صاحب نے جب اپنی غزل پڑھی تو اس میں ایک شعر کا دوسرا مصرعہ تھا ع

میرے حسود مجھ کو گرا کر چلے گئے

جناب رضا صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ پھر اُٹھے کس طرح تھے۔

مندرجہ بالا شعراء حضرات کے اپنا الگ جھنڈا لہراتے رہنے کی وجہ ان کی اردو اور فارسی سے واقفیت تھی۔ جیسا کہ سنا ہے جناب مرزا قاری صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایف اے تک پڑھے تھے اور جناب جمال صاحب بی اے تک۔ اسی طرح سے مندرجہ بالا دوسرے حضرات بھی اردو اور فارسی میں تعلیم یافتہ تھے۔

جناب رضا صاحب کا مکان نیروبی میں جوجا روڈ پر تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ دوسری منزل پر ایک طرف رضا صاحب کا اسٹڈی روم تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں کھڑکی لگا ہوا ایک دیوان بیڈ تھا۔ جناب رضا صاحب نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے اس اسٹڈی روم میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے تک بتائے تھے۔

اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب مانک ٹالہ صاحب نے "تناظر" کے گپتا رضا نمبر میں اپنے مضمون میں رضا صاحب سے اپنی جس ملاقات کا ذکر کیا ہے وہ اسی اسٹڈی روم میں ہوئی تھی۔ جناب مانک ٹالہ صاحب نے اپنی اس ملاقات میں جناب چمن لال چمن کے ہمراہ ہونے کا تو ذکر کیا ہے لیکن وہ یہ بھول گئے کہ راقم الحروف بھی اُن کے ساتھ تھا۔ چمن صاحب میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ وہ اب ایک عرصے سے لندن میں مقیم ہیں لیکن وہ ان دنوں وائس آف کینیا میں ایک اونچے عہدے پر فائز تھے۔ ہر فن مولا فنکار ہیں۔ وہ ہندی، اردو کے کم اور پنجابی کے شاعر زیادہ ہیں۔ اردو شاعری میں رضا صاحب سے اصلاح لیتے تھے۔ وہسکی کے رسیا ہیں۔ وہ جناب رضا صاحب کی پہلی کتاب "شعلۂ خاموش" کی اشاعت کی خوشی میں اُن سے وہسکی پینا چاہتے تھے۔ اسی دوران جناب مانک ٹالہ بھی اپنے کاروبار کے سلسلہ میں نیروبی آئے ہوئے تھے اور جناب رضا صاحب سے ملنے کے خواہشمند تھے۔ رضا صاحب، جیسا کہ سب جانتے ہیں، نہ پینے والوں میں تھے اور نہ پلانے والوں میں۔ لیکن چمن صاحب ایک بہت پیاری شخصیت ہیں۔ سو رضا صاحب نے اس معاملے میں اپنے سب اصول بالائے طاق رکھ کر "جانی واکر" کی ریڈ لیبل وہسکی منگوالی تھی۔ ان دنوں میرا دفتر رضا صاحب کے دفتر کے پاس ہی تھا۔ دعوت شام کو تھی اور ہم صرف تین لوگ ہی اُس میں مدعو تھے۔ چونکہ وہ سنیچر کا دن تھا اور میرا دفتر دوپہر بارہ بجے بند ہو جاتا تھا سو میں دفتر سے کچھ اور بھی جلدی نکل کر رضا صاحب سے ملنے چلا گیا۔ رضا صاحب نے مندرجہ

مالا وہسکی کی بوتل لفافے میں سے نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے پوچھا کہ کیوں یہ جمن کیلئے ٹھیک رہے گی نا؟

شام کو مقررہ وقت پر ہم تینوں یعنی کہ میں، جمن صاحب اور مانک ٹالہ صاحب اکٹھے ایک کار میں رضا صاحب کے مکاں پر پہنچے۔ ہمیں مندرجہ بالا اسٹڈی روم میں بٹھایا گیا۔ خاطر تواضع شروع ہوئی۔ جمن صاحب اور مانک ٹالہ صاحب وہسکی سے لطف اندوز ہوتے رہے اور میں اور رضا صاحب سافٹ ڈرنکس اور فروٹ جوس سے۔ یوں بائیٹنگز (Bitings) میں ہم چاروں برابر کے شریک تھے۔

ظاہر ہے کہ ساتھ ساتھ بات چیت بھی ہوتی رہی۔ اب اس واقعے کے ساڑھے تیس سال بعد یہ تو یاد نہیں کہ کن کن موضوعات پر بات چیت ہوئی لیکن ظاہر ہے کہ زیادہ تر بات چیت "شعلۂ خاموش" اور ادب پر ہی ہوئی ہوگی۔ کھانا کھا چکنے کے بعد جمن صاحب نے رضا صاحب سے فرمائش کی کہ وہ ستار پر کچھ سنائیں۔ جیسا کہ لوگ جانتے ہیں، رضا صاحب نے اپنی چڑھتی جوانی میں ستار کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وِشنو دِگمبر کے ایک شاگرد پنڈت سکھن ناتھ پروہت ستار میں اُن کے استاد تھے۔ رضا صاحب افریقہ پہنچے کے چند سال بعد ہی ستار بجانا ترک کر چکے تھے۔ انھوں نے ستار کو لکڑی کے بکسے میں بند کر کے اپنے دیوان بیڈ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ جمن صاحب کی ستار کی فرمائش پر پہلے تو انھوں نے کافی آناکانی کی لیکن پھر ہم سب کے اصرار پر ستار کو بکسے سے نکالا، اُسے سُر کیا اور اُسے بجانے لگے۔ انھوں نے تھوڑی دیر کے لیے چند ایک راگ اور دُھنیں بجائیں۔ وہ ایک چیز کو تھوڑی دیر تک بجاتے تھے، پھر رُکتے تھے اور ہمیں اس کے بارے میں بتاتے تھے۔ رضا صاحب کے ساتھ یہ ایک یادگار شام تھی۔

لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ ستار ہی کے ساتھ ساتھ رضا صاحب شطرنج کے بھی اچھے کھلاڑی تھے۔ لیکن افریقہ پہنچنے کے بعد وہ اپنے کاروبار کے ساتھ اپنے تین تین مشاغل نہ پال سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے افریقہ پہنچنے کے چند سال بعد ہی ستار اور شطرنج کو خیرباد کہہ دیا اور شاعری کو گلے لگا لیا۔

مکان کی اوپری منزل پر ہی اُن کا کشادہ سٹنگ روم تھا۔ رضا صاحب کے ممبئی کے گھر کے سٹنگ روم ہی کی طرح چھت سے نیچے چاروں طرف الماریاں تھیں، جن میں کتابیں تھیں۔ اسی سٹنگ روم میں محفل مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، رضا صاحب کے وطن لوٹنے سے چار سال پہلے تک ہر ماہ ان کے ہاں محفل مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ میں ہر محفل مشاعرہ میں شامل تھا۔ ان کی صدارت کینیا ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس چانن سنگھ شفق کیا کرتے تھے۔ کسی زمانے میں وہ شعر کہا کرتے تھے لیکن ایک عرصے سے وہ اس سے دستبردار ہو چکے تھے۔ مَیں نے انھیں مشاعروں کی صدارت کرتے ہوئے دیکھا، لیکن کبھی شعر پڑھتے ہوئے نہیں۔ ایک بار رضا صاحب ہی کی کسی محفل مشاعرہ میں انھوں نے کہا تھا کہ "مَیں بے تخلص اور بے بیاض شاعر ہوں"۔

نیروبی میں محفلیں یوں بھی شائستہ اور باوقار ہوتی تھیں لیکن رضا صاحب کے ہاں ہونے والی یہ

مشاعروں کی محفلیں تو اس بارے میں اور بھی بڑھ چڑھ کر ہوا کرتی تھیں۔ رضا صاحب بہت ہی اصول پرست اور باوضع انسان تھے۔ ان محفلوں کی دعوت دیتے وقت مجھ سے بھی پوچھ لیتے تھے کہ کس دو کو ساتھ لاؤ گے۔ ایک بار اُن کے یہ پوچھنے پر جب میں نے دو میں سے ایک نام کیپیا کے اُس وقت کے مشہور گلوکار دیدار سنگھ پردیسی کا لیا تو کہنے لگے کہ اس کے وہاں موجود ہونے سے لوگ اس سے گانے کی فرمائش کر بیٹھیں گے، لہذا اُسے رہنے دو۔

مندرجہ بالا مشاعروں کی محفلوں میں سب سے زیادہ یادگار محفل وہ تھی جو کہ جناب ماہر القادری صاحب کے اعزاز میں ۲۱ر مئی ۱۹۶۹ء کو برپا کی گئی تھی۔ جناب ماہر القادری صاحب جنوبی افریقہ کے سفر سے واپسی پر نیروبی میں چند روز کے لیے رُکے تھے۔ ہمیشہ ہی کی طرح اس محفل کے صدر آنریبل مسٹر جسٹس چاننن سنگھ تھے۔ شعرائے نیروبی کے علاوہ پچاس ساٹھ منتخب شائقین جمع تھے۔ رضا صاحب کی کتاب "بہارِ اردو گلشن مشرقی افریقہ میں" میں اس محفل مشاعرہ کا مفصل ذکر ہے۔ لیکن اس میں رضا صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ جناب ماہر القادری صاحب نے رضا صاحب کی غزل کے بعد کلام سنانے سے پہلے ایک مختصر تقریر بھی کی اور ان ہی کی غزل کی زمین میں فی البدیہہ شعر بھی پڑھا، دراصل ہوا اس طرح تھا کہ رضا صاحب کے غزل کا مقطع پڑھتے ہی جناب ماہر القادری صاحب نے وہ شعر فی البدیہہ پڑھا تھا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے بتادوں کہ رضا صاحب نے غزل سے پہلے دو رباعیاں ماہر صاحب کے لیے کہیں اور پھر غزل سنائی۔ یہاں اختصار کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے غزل کے صرف چار اشعار دیے جاتے ہیں۔

وہ لاکھ اہلِ خرد ہیں نکتہ داں ہیں　　جہاں والے ابھی جاگے کہاں ہیں
نہ جانے کیا تھا غنچے کی چٹک میں　　گلوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں
شجرہ ہو، کوہ ہو، ہمت آسماں ہو　　پرِ پرواز کو سب آشیاں ہیں
رضا جو شعر کے فن میں تھے کامل　　وہ شاعر رہ سخن گستر کہاں ہیں

ماہر صاحب نے فوراً کہا۔

جہاں میں ایسے انساں بھی کہاں ہیں
رضا شاعر ہیں اور شیوا بیاں ہیں

ماہر صاحب نے اس محفل مشاعرہ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس نشست کو دیکھ کر لکھنو، رامپور اور دلی کی محفلیں یاد آگئیں　جب سر علی مسلم کلب میں ماہر القادری صاحب کے اعزاز میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد کیا گیا تو اس میں انھوں نے اپنی تقریر میں جناب رضا صاحب کو "مشرقی افریقہ میں اردو کا قطب" کہہ کر پکارا تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی تعریف کی تھی۔

آخر میں یہ عرض کردوں کہ جناب کالی داس گپتا رضا صاحب نے بیس برس تک دیارِ غیر میں اردو کو

پھیلانے کی جو سعی کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شاعری کو فنونِ لطیفہ میں سب سے لطیف فن مانا جاتا ہے۔ رضا صاحب اس کے استاد تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے عمدہ کلام سے مشرقی افریقہ کے ایشیائی لوگوں کو محظوظ کیا بلکہ بیسیوں شاعروں کی فن شاعری میں رہنمائی کر کے ایک ایسی فضا تیار کی، جس کی بدولت ان کے مشرقی افریقہ سے چلے جانے کے بعد بھی ایک عرصے تک لوگ اردو شاعری سے محظوظ ہوتے رہے۔

ایک اندازے کے مطابق رضا صاحب کے قیامِ افریقہ کے دوران اردو کے ۱۷ر مشاعرے ریڈیو سے براڈ کاسٹ کیے گئے۔ سو (۱۰۰) سے زائد پبلک مشاعرے منعقد ہوئے۔ ایک درجن سے زائد محفلیں لوگوں کے گھروں میں اور ۲۸ر محفلیں خود ان کے گھر پر منعقد ہوئیں۔ یہ بیشتر نیروبی شہر ہی سے متعلق ہیں۔ مگر اس سے باہر بھی کینیا، یوگنڈا اور ٹانزانیہ ملکوں کے مختلف شہروں میں ہوئے دس مشاعروں میں رضا صاحب نے حصہ لیا۔

کینیا براڈ کاسٹنگ سروس (ریڈیو) پر ہندوستانی / اردو زبان کی اصلاح کے لیے جو کمیٹی بنی تھی، "بزمِ سخن" نے اس میں نمائندگی حاصل کی۔ اس کی کئی میٹنگیں ہوئیں۔ بہت سا کام مکمل ہوا۔ لغت کی شکل میں دو ڈھائی ہزار الفاظ کا ذخیرہ مرتب ہوا۔ ظاہر ہے کہ رضا صاحب اس کام میں پیش پیش تھے۔

رضا صاحب کی شاعری سنجیدہ ہے۔ مگر ان کی طبیعت طنز و مزاح سے لبریز تھی۔ یہ بات ہر وہ شخص جانتا ہے جسے اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا موقعہ ملا۔ طنز و مزاح بڑے آدمیوں کا ایک وصف ہوا کرتا ہے۔ یہ وصف ان کی صاف دلی کی وجہ سے آتا ہے۔ رضا صاحب ایک صاف دل انساں تھے۔

رضا صاحب بیک وقت محقق، ناقد، ادیب اور شاعر تھے۔ تقریباً پینسٹھ (۶۵) کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی رحلت پر مَیں نے ان کے سینکڑوں ادبی وارثوں کو نظر میں رکھتے ہوئے جو قطعہ کہا تھا، اُسی پر اس مضمون کا اختتام کرتا ہوں ۔

کھویا اُسے تو اب تو نہ ہوش و حواس کھو
تو کر سکے تو کام کر چھوڑا ہے اُس نے جو
اللہ کے جو کام ہیں اُن میں ہو دخل کیا
اُس کی یہی رضا تھا ، رضا کے لیے نہ رو

☆☆☆

003, B WING B 18 - GULSHAN,
GOKULDHAM, GOREGAON (E)
MUMBAI - 400 063

علامہ کالی داس گپتا رضاؔ، پنجاب میں

شرون کمار ورما

جو نہ مرتا کوئی دن اور

آج غالبؔ بہت یاد آرہے ہیں۔

میرے دوست سدرشن کپور ایڈووکیٹ کا فون آیا "ایک بُری خبر ہے؟" میں نے ذہنی طور پر خود کو اس کے لیے تیار کیا ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا ہوا؟" "کالی داس گپتا رضاؔ نہیں رہے۔ اخبار نہیں دیکھا؟" میں نے اخبار تو دیکھا تھا، پھر یہ خبر کیسے چوک گئی۔ لگا جیسے کوئی تیز نوکیلی چیز دل میں اُتر گئی ہو۔ میں نے رضا صاحب کے شاگرد اور اپنے دوست ستیہ پال ملہوترہ عارف کو فون کیا۔ انھوں نے اس منحوس خبر کی تائید کر دی۔

غالب نے کہا تھا مقدور ہو تو قدرت کس وقت کیا کرے گی، کیوں کرے گی، کون جانتا ہے۔ انسان کو علم و ذہانت کی خوبی عطا فرما کر بھی خدا نے اسے بے بس ہی رکھا ہے۔ موت برحق ہے، اٹل ہے، عظیم سچ ہے۔ اس بیدرد ہاتھ نے کیسا شگفتہ اور مہکتا ہوا پھول توڑا ہے گلشن اردو کا ایک ہی ثانیہ میں سب کچھ کہانی ہو گیا۔ رضا صاحب تحقیق کی دنیا میں نئے اُفق، نئے نقوش، انمٹ نشاں چھوڑ رہے تھے۔ اپنی محنت، لگن اور ذہانت سے انھوں نے اردو ادب میں اپنے لیے بلند اور محفوظ مقام بنا لیا تھا۔ غالبؔ اور اردو کے دیگر اہم شیدا جنھیں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، پر انھوں نے اچھوتے ڈھنگ سے کام کر کے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ غالب پر سنجیدہ، علمی تحقیق کرنے والوں میں رضا صاحب کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ ابھی تو بہت کام باقی تھا۔ موت نے موقع نہیں دیا۔

۲۶ر فروری ۲۰۰۱ء کو وہ پٹیالہ آئے تھے۔ شرومنی ساہتیہ کا ایوارڈ لینے۔ میں ان کے نام اور کام سے تو بہت پہلے سے واقف تھا۔ عارف صاحب جب بھی ممبئی سے لوٹتے، رضا صاحب کی کتابیں وغیرہ پڑھنے کے لیے ضرور لاتے۔ رضاؔ صاحب کا ذکر خیر بھی ہماری گفتگو کا موضوع رہتا۔ سدرشن کپور ممبئی میں رضاؔ صاحب سے مل کر آتے اور ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ایسا نیک، محقق، شریف انسان بہت ہی کم دیکھا ہے۔ جس شخص کو خدا نے نہ صرف دنیاوی دولت، افراط زر، ذہانت اور اعلیٰ علمی و ادبی ذوق و شوق سے نوازا ہو اس میں گھمنڈ نام کو نہ ہو، عجز جس کا اوڑھنا بچھونا ہو، وہ آدمی نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ قابل پرستش بھی ہے۔ میری بدقسمتی کہ ممبئی جانے کے باوجود رضاؔ صاحب کے نیاز حاصل نہ کر سکا۔ کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا رہا کہ میری یہ خواہش، یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اس لیے جب مجھے یہ خبر ملی کہ رضاؔ صاحب پٹیالہ تشریف لا رہے ہیں تو میں

نے پٹیالہ جانے کا فیصلہ کیا۔ عارف صاحب بھی اس سفر میں میرے ساتھ رہے۔ لدھیانہ میں ایک رات اپنے دوست رتن سنگھ تسنیم (جو اردو کی وسعتوں سے پنجابی کی محدود فضاؤں میں چلے گئے ہیں) کے ہاں قیام کے بعد ہم تینوں پٹیالہ پہنچ گئے۔

پنڈال سجا تھا۔ سیکوریٹی پولیس اور سرکاری کرمچاری مستعدی سے ڈیوٹی پر تھے کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار پرکاش سنگھ بادل یہ ایوارڈ دینے والے تھے۔ ان ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں اردو کی دو شخصیتیں شامل تھیں، میرے دوست آر ڈی شرما تاثیر اور ڈاکٹر سلطان انجم (مدیر تعمیر ہریانہ۔ چندی گڑھ)۔ پنڈال میں میرے برابر والی نشست پر ایک خاتون براجماں تھیں۔ چہرہ اور لباس سے سادگی اور وقار ظاہر تھا جبکہ پنڈال میں دوسری خواتین سج دھج کر آئی تھیں اور اپنے وجود کا احساس مغربی انداز و رکھ رکھاؤ سے دلا رہی تھیں۔ تقریب ختم ہوئی تو میں عارف اور تسنیم کے ساتھ رضا صاحب سے ملنے چل دیا۔ وہ اس وقت جناب خمار جالندھری، آزاد گلاٹی، تاثیر اور انجم وغیرہ میں گھرے کھڑے تھے۔ وہ خاتون جو پنڈال میں میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھیں، اب رضا صاحب کے ساتھ کھڑی تھیں۔ شریمتی رضا۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا۔ رضا صاحب نے مسکرا کر گلے سے لگا لیا اور بولے "میں تو آپ کو جوان آدمی سمجھتا تھا"۔

"میری کہانیوں کی وجہ سے شاید" میں مسکرایا۔

خمار جالندھری، رضا صاحب کو اپنے ہاں لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے اور عارف صاحب نے رضا صاحب سے امرتسر تشریف لے چلنے کے لیے کہا۔ وہ تسنیم اور عزیز پریہار کی دعوت پر لدھیانہ جانے کا پروگرام طے کر چکے تھے۔ چندی گڑھ سے ان کی ہوائی جہاز کی سیٹیں بھی ممبئی کے لیے بک ہو چکی تھیں۔ انھوں نے ہم سے وعدہ کر لیا کہ اگلے ماہ جب وہ 'پدم شری' ایوارڈ لینے دہلی آئیں گے تو امرتسر ضرور آئیں گے۔

ہم نے ان کے شایاں شان ایک ادبی نشست منعقد کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس سلسلہ میں سدرشن کپور کا تعاون بھی ہمیں حاصل ہونے والا تھا لیکن خدا نے ہمیں اس سے محروم رکھا۔ پٹیالہ میں رضا صاحب سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ رضا صاحب ایک باقاعدہ اور محتاط زندگی گذارنے والوں میں سے تھے۔ ڈسپلن، نظم، پابندیٔ اوقات، بامقصد زندگی گذارنے اور کام سے کام رکھنے کی تلقین وہ سب کو کرتے تھے کہ یہی کامیابی کا راز ہے۔ عرصہ ہوا میں نے انہیں ایک شعر کے سلسلہ میں خط لکھا تھا۔ پوچھا تھا کہ "وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا" والا شعر کس کا ہے۔ میں نے میر کے تمام دیوان چھان مارے تھے، یہ شعر کہیں نہیں ملا۔ لیکن سنا اسی طرح تھا۔ خط حوالۂ ڈاک کرکے میں نے سوچا کہ اس کا جواب نہیں آئے گا۔ رضا صاحب جیسا معروف اور بڑا ادیب و شاعر ان معمولی کاموں کے لیے وقت نہیں نکال پائے گا۔ لیکن رضا صاحب کی عظمت و شرافت نے مجھے غلط ثابت کر دیا۔ ان کا جواب آیا۔ (وہ خط میرے پاس محفوظ ہے)۔ انھوں نے لکھا تھا کہ

"مذکورہ شعر میر تقی میر کا نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں کسی "امیر" کا ہے۔ بقول ممتاز عرشی یہ شعر قلق رامپوری کا ہے۔ یادور حسوری ۱۹۶۶ء میں یہ شعر مہاراج بہادر برق کے نام سے منسوب کیا گیا ہے"۔

رضا کا ادبی رشتہ غالب سے جا ملتا ہے۔ رضا، جوش ملسیانی صاحب کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ جوش، داغ کے شاگرد رشید ہی نہیں بلکہ پنجاب میں 'داغ اسکول' کو قائم رکھنے والے بھی تھے۔ کسی نہ کسی طور پر پنجاب کے اردو شعراء داغ اسکول کے ہی پروردہ ہیں۔ داغ نہ صرف غالب کے بھتیجے تھے بلکہ انہیں عزیز بھی تھے۔ غالب کا مزاج داغ سے بالکل مختلف ہے۔ پھر بھی وہ داغ کی زباں دانی کے قائل اور ان کے اشعار کو پسند کرتے تھے۔ غالب اپنی تخلیقی قوتوں کی بنا پر اور رضا غالب پر بنے امدار سے کام کرنے کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ اونچے مقام پر رہیں گے۔ غالب کا ذکر آئے تو رضا، اور، رضا کی بات ہوگی تو غالب تو یاد آئیں گے ہی۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئے گلشن اردو کے لالہ و گل تو اس کا شعری، ادبی، تحقیقی اور تخلیقی سرمایہ ہی ہے۔ رضا سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی پہچانے جاتے رہیں گے۔ بس غالب کی طرح ہم اردو والے بھی پوچھیں گے ع

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

☆☆☆

گلی اوستھاں والی، چوک پراگ داس، امرتسر 140 006

یگانۂ عصر کالی داس گپتا رضا، میسور میں

رزّاق افسر

آزادی کے بعد زندگی کے ہر گوشے میں ایک نئی چہل پہل آگئی۔ میرے ذوقِ مطالعہ میں بھی بلا کی تیزی آگئی۔ اردو ادب کے مسلسل مطالعے نے اردو ادب کی اُبھرتی ہوئی کئی کئی سمتوں سے روشناس کرایا۔ اس سمت میں آگے بڑھنے والے کئی ایک ادباء و شعراء سے متعارف ہوا جن میں سے چند ایک شعراء میرے ذہن سے محو گئے، جن کو میں بغور پڑھتا رہا۔ اُن شعراء میں سے ایک نام آنجہانی کالی داس گپتا رضا کا بھی تھا جن سے میں بہت متاثر رہا مگر برسوں ان سے براہِ راست رابطے کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ تقریباً اکیس بائیس سالوں بعد کرناٹک کے ممتاز شاعر مرحوم حضرت ضمیر عاقل شاہی کی ایما اور سعیِ پیہم کے بعد سال ۱۹۶۸ء میں ادارۂ بزم اردو میسور کا قیام عمل میں آیا۔ ادارے کے قیام میں مرحوم الحاج مظہر الصمد شاہد، جناب اقبال فرید، جناب سیّد عبد القادر مشتاق، مرحوم نواب سیّد محمود، آنجہانی سیٹھ لکشمن داس گذوانی اور میں پیش پیش رہے۔ ادارہ کیا قائم ہوا کہ شہر کا ادبی جمود ٹوٹا۔ ملک اور بیرون ملک کے مشاہیر ادب سے نیاز اور سننے سنانے کے راستے کھل گئے۔ ادبی رابطے بحال ہونے لگے۔ ابتدا ہی میں ڈاکٹر پاٹنائک اڑیسہ، ڈاکٹر اکبر الدین صدیقی حیدر آباد، ڈاکٹر ماچوے بنگال، مرحوم سیّد سجاد ظہیر عرف بنے بھائی، ممتاز ناول نگار و فلمساز خواجہ احمد عباس ممبئی سے نیاز حاصل ہوا اور یہ سلسلہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ اور پھر ایک دن یعنی ۲۷ اپریل ۱۹۸۵ء کو وہ ساعتِ سعد آگئی کہ آنجہانی کالی داس گپتا رضا ممبئی جن سے ملنے کا دیرینہ اشتیاق تھا وہ میسور آپہنچے۔ موصوف کی آمد اور بجے کے لاج ساڑے روڈ میسور کے ایک کمرے میں مشاعرے کے اہتمام کی اطلاع محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد ابراہیم سے ملی جو ان دنوں مہارانی کالج میسور میں صدر شعبۂ اردو تھے۔ شہر کے شعراء اور ادب نواز احباب وقت سے پہلے بجے کے لاج پہنچ گئے۔ سب کے سب رضا صاحب کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ موصوف اپنی بیگم کے ہمراہ ٹھیک وقت پر مشاعرہ گاہ پہنچے۔ رضا صاحب کے اخلاق و محبت نے سب کے ذہنوں پر ایسا تاثر چھوڑا جیسے ہماری اور ان کی پہچان بڑی دیرینہ ہو۔ ہم پہلی مرتبہ نہیں بلکہ حسبِ معمول رضا صاحب سے مل رہے ہیں۔ محفل خوب جمی جسے ایک یادگار یکجائی کہا جاسکتا ہے۔ مشاعرہ کے بعد میں نے دبے دبے لفظوں میں رضا صاحب سے عرض کیا کہ وقت اجازت دے تو بزم اردو میسور میں بھی تشریف لائیں تو رضا صاحب نے بڑی فراخدلی کے ساتھ فوراً کہا کہ میں بزم اردو میسور میں ضرور آؤں گا مگر اوٹی سے واپسی کے بعد۔ پھر موصوف نے مشاعرے کی تاریخ ۱۱ مئی ۱۹۸۵ء اور وقت شام چھ بجے طے کرتے ہوئے کہا کہ مجھے لینے کے لیے ٹھیک وقت پر کسی کو بھیج دیں۔ میں صرف گھنٹہ بھر آپ کے ساتھ رہوں گا۔ موصوف نے میسور، اوٹی کے سفر کا ذکر اپنے ایک مضمون رزاق افسر کی نثری نظمیں (مطبوعہ سہ ماہی اسباق، پونہ، روزنامہ سالار بنگلور، روزنامہ بہار ہردوئی اور ان

کی اپنی ایک تصنیف حرفِ دعا) میں اس طرح کیا ہے

"مدت سے آرزو تھی کہ سلطان شہید ٹیپوؒ کے مزار کی زیارت کروں۔ یہ مراد ۲۷ اپریل ۱۹۸۵ء کو بر آئی۔ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ممبئی سے بنگلور تک تو ہوائی جہاز میں گیا مگر وہاں سے ہم اوٹی کے لیے کار میں روانہ ہوئے تاکہ راستے میں سری رنگا پٹنم (سلطان ٹیپوؒ کا صدر مقام) میں بھی کچھ وقت گزار سکیں۔ جب سلطان شہیدؒ کے خوبصورت اور پروقار مزار جو پھولوں سے لدا پھندا تھا، پر حاضری دی تو فوراً ایک رباعی موزوں ہوگئی۔

پھولوں سے ڈھکا مزارِ سلطان شہیدؒ گویا ہے تر و تازہ گلستان شہیدؒ
دیکھا جو اُسے تو جیسے دیکھا میں نے انوارِ شہیدؒ اوجِ شہید آن شہیدؒ

بعد میں ایک نظم اور چند قطعات بھی کہے تھے مگر وہ اس وقت پیش نظر نہیں۔ میسور چند کوس پر ہی تھا۔ ایک دن وہاں بر مداوں گارڈن میں ہو کر اوٹی چلے گئے۔ جداجدا کر کے انتظار ختم ہوا اور رضا صاحب حسب وعدہ ۱۱ مئی ۱۹۸۵ء شام ساڑھے چھ بجے دفتر بزم اردو میرے غریب خانے آگئے۔ جناب اکرام کاوش، برادر رفیق عارف ہوٹل مہاراجہ، جھانسی لکشمی بائی روڈ پہنچ کر موصوف مہمان خصوصی کو لے آنے میں ذرا سی تاخیر کی۔ شعراء اور سامعین کی آمد میں ذرا وقت لگا اور مشاعرہ بعد مغرب سات بجے شروع ہوا۔ مرحوم شاہد میسوری نے قرأت اور مہمان خصوصی رضا صاحب کی نعت شریف سے اجلاس کا آغاز کیا۔ رضا صاحب نے سلطان شہیدؒ کی مزار پر جو کیفیت محسوس کی اور وہیں فی البدیہہ کہی گئی رباعی اور قطعات عقیدت سنا کر اپنی غزلوں سے مشاعرے کا باقاعدہ آغاز کیا۔ شہر کے تقریباً سبھی شعراء نے باری باری اپنا کلام سنایا۔ درمیاں میں رضا صاحب کو احباب بہ اصرار سنتے رہے۔ محفل جمی تو ایسی جمی کہ وقت کیسے گزرا کچھ پتہ نہ چلا۔ رضا صاحب گھنٹہ بھر کے لیے آئے تھے لیکن محفل سے ان کی دلچسپی اس قدر بڑھ گئی کہ خود بھی سبھی سنانے پر مائل رہے۔ آخر میں رضا صاحب نے کم و بیش تیس سے زیادہ شعری تخلیقات سنائیں۔ آخر میں رضا صاحب نے اردو ادب اور مخالف اردو صورتحال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا جس کا ذکر موصوف نے اپنے مذکورہ مضمون میں اس طرح کیا ہے

"میسور کو واپسی شام ۹ مئی کو ہوئی تھی۔ وہاں سلیم تمنائی صاحب سے ملاقات ہونے کی دیر تھی کہ پورے شہر کے اردو حلقے (جو اتفاق سے کافی بڑا اور جاندار ہے) خبر ہوگئی۔ محفلیں جمنے لگیں۔ میرے ہوٹل میں اور احباب کے دولت کدوں پر۔ ۱۱ مئی ۱۹۸۵ء کو ایک محفل جناب رزّاق افسر کے دولت خانے پر منعقد ہوئی۔ اچھا خاصا مشاعرہ ہوگیا۔ شعرائے میسور کا ذوق و شوق اور انہماک دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بعد میں میں نے ایک رباعی میں اپنے دل کی بات کہہ کر سنائی۔

میسور کے اے نغمہ رباں خوش خو پھیلائی عجب زماں کی تم نے خوشبو
جو ہند شمالی بھی اسی راہ چلے سب دیس پکار اٹھے اردو اردو

میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اردو کی ترقی کے لیے بنائی گئی انجمنیں صرف دو کام کرتی ہیں، ایک تو بیشتر ہندوستان کے صدر مقام پر سمینار کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیتی رہتی ہیں جس سے اردو زبان کی صحت پر کوئی برا اثر تو شاید نہ پڑتا ہو مگر اچھا اثر کبھی نہیں پڑتا، دوسرے اپنے دائرۂ کار کو کبھی چند بڑے شہروں کی فصیلوں کو پار نہیں جانے دیتیں۔ اس طرح اردو کے فعال مگر دور افتادہ مراکز مدستور نظر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ انجمنیں اہل اردو کی خود فراموشیاں، یہ زبان کے اجارہ داروں کی پالیسیاں ہمہ وقت اردو کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے درپے رہتی ہیں۔ یہ اردو کی سخت جانی ہے کہ وہ صحیح سالم ہے اور جیے جا رہی ہے اور بقول شاعر مسلسل کیے جا رہی ہے

حال سب میری سخت جانی کا ماڑھ کہتی ہے مڑ کے خنجر سے

(پنڈت رتن ناتھ سرشار)

مشاعرہ شب کے بارہ بجے ختم ہوا جس کے بعد رضا صاحب اور ان کی بیگم شریمتی ساوتری بھابی نے غریب خانے پر رات کا کھانا کھایا۔ پھر انھیں موٹر کار کے ذریعے برادرم رفیق عارف و بہن محسنہ تاج کے ساتھ واپس ہوٹل پہنچایا گیا۔ وداع ہونے سے پہلے رضا صاحب نے کہا کہ ملاقات ابھی تشنہ ہے اور بہت سی باتیں کہنی سنی ہیں۔ اس لیے ہوٹل مہاراجہ میں کمرے پر آ جائیں۔ ہم تینوں صبح نو بجے یعنی میرے ہم سبق سلیم تمنائی اور سابق نائب صدر ادارہ جناب اکرام کاوش نو بجے ہوٹل مہاراجہ کمرہ نمبر ۲ پہنچ گئے۔ آنجہانی رضا صاحب نے ہم سب کو آگے بڑھ کر بڑی خوشدلی سے گلے لگایا اور پھر ہم اُس آراستہ کشادہ کمرے میں پڑے ہوئے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ بس کیا تھا کہ اردو ادب کی صورتحال پر باتیں شروع ہو گئیں۔ اس بحث میں ہم چاروں اس قدر محویت کے ساتھ مصروف رہے کہ دیوار پر لگی گھڑی دیکھی تو پتہ چلا کہ بارہ گھنٹے بج رہے ہیں۔ رضا صاحب نے کہا کہ مئیں ۱۲:۳۰ بجے کہیں اور مدعو ہوں لہٰذا مجھے وقت پر جانا ہے۔ موصوف نے ہم سے اجازت چاہی اور ہمیں وداع کیا اور بتایا کہ ہم علی الصبح بنگلور چلے جائیں گے۔ وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز ہمیں ممبئی جانا ہوگا۔

یہ اوّلیں ملاقات ہمارے لیے فالِ نیک ثابت ہوئی جس میں رضا صاحب نے اپنے خلوص و محبت سے اس قدر سیراب کیا کہ مجھے اپنی تنگ دامانی کا احساس ہونے لگا۔ آگے چل کر خط و کتابت سے رابطے استوار ہوتے گئے بلکہ یہ یقین ہونے لگا کہ ہماری اپنائیت بڑی دیرینہ ہے اور ہم جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ اردو زبان و ادب کے ناطے ہماری یہ مستحکم اپنائیت ایک مثالی اپنائیت ہے۔ اس ضمن میں رضا صاحب کا ایک خط جوں کا توں ذیل میں نقل کر رہا ہوں

"محبّ مکرم تسلیم

عید سعید پر آپ کی دو مختصر نظمیں نظم عید اور تثلیث عید ملیں۔ ساوتری اور میری طرف سے آپ سب کو اور خاص کر میری عزیزاؤں (آپ کی بہنوں) اور عزیزوں (آپ کے بھائیوں) کو مبارکباد۔ آپ سب

کی محنت میرے پیش نظر ہے۔

مکرمی! آپ کا ایک قرض مجھ پر باقی ہے۔ اب ضعیفی کا عالم ہے اس لیے اسے چکا دینا چاہتا ہوں۔ مجھ پر آپ اور آپ کی شاعری پر مضمون لکھنے کا قرض باقی ہے۔ آپ مجھے مندرجہ ذیل معلومات جلد سے جلد فراہم کریں (۱) آپ کی کوئی ادبی کتاب جو آپ کی نظر میں آپ کی بہترین کتاب (شعری مجموعہ) ہو۔ صرف آپ کے ایک مجموعے پر لکھوں گا۔ (۲) تمام شعری مجموعوں کے نام جو اب تک چھپ چکے ہیں۔ (۳) آپ کی تاریخ ولادت۔ (۴) تعلیم۔ (۵) پیشہ جو بھی رہا ہو۔ (۶) ادب میں جن سے آپ نے استفادہ کیا اور وہ ادیب و شاعر جن سے آپ متاثر ہوئے۔

مضمون میں ان باتوں کا ذکر بھی ہوگا۔ زیر بحث آپ کی شاعری ہی لائی جائے گی۔

مخلص کالی داس گپتا رضاؔ"

مذکورہ خط موصول ہوا تو میں حیرت میں ڈوب گیا کہ رضاؔ صاحب کو دوستی اور اس کی ذمہ داریوں کا کس قدر احساس تھا۔ اس کا اندازہ خط کی عبارت سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اپنی اوّلین فرصت میں مطلوبہ تمام معلومات موصوف کے نام بھیج دیں۔ رضاؔ صاحب نے میرے شعری اظہار پر اپنے تاثرات بعنوان "رزاق افسرؔ کی شاعری" لکھا جس میں میرے اظہار کا ایک گوشہ نثری نظموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مذکورہ مضمون سہ ماہی اسباق پونہ شمارہ اکتوبر ۱۹۹۵ء، روزنامہ سالار شمارہ ۳ر جون ۱۹۹۶ء، روزنامہ بہار ہردوئی شمارہ ۲۱ر ستمبر ۱۹۹۶ء اور رضاؔ صاحب کی تصنیف "حرفِ دعا" میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں رضاؔ صاحب نے چند خاص ادبی دوستوں پر اپنے تاثرات شائع کیے ہیں۔ اس طرح پوری فراخدلی کے ساتھ رضاؔ صاحب نے مجھ احقر کی ادبی دوستی کا قرضہ چکا کر مجھ پر بڑا احسان کیا جسے میں کبھی فراموش کر نہیں پاؤں گا۔ اس مضمون کا خصوصی پہلو یہ ہے کہ اس کی شروعات رضاؔ صاحب کے میسور اور اوٹی کے سفر کی آئینہ دار ہے جس میں رضا صاحب نے میسور اور اوٹی میں قیام اور مصروفیت کا مفصل حال خود محفوظ کیا ہے جو ایک معتبر حوالہ ہے۔ رضاؔ صاحب کی اردو زبان و ادب سے وابستگی، شعری و نثری اظہار، تحقیق و تصنیف کا ایک طویل عرصے تک جو ٹھوس کام کیا ہے اس کا جائزہ لینے کے لیے پوری ایک کتاب درکار ہے مگر ادب میں ان کی خدمات جلیلہ اور ادب سے وابستگی کا ٹھوس ثبوت موصوف کی ستاون تصانیف اور ایک عظیم الشان ذاتی کتب خانہ ہے۔ اردو زبان و ادب کو اور بہت کچھ مل سکتا ہے لیکن رضاؔ صاحب جیسا خلیق و مخلص شیدائی و شاعر شاید ہی مل سکے۔

رضا صاحب کی رحلت کسی ایک خاندان یا قریبی احباب کی محرومی نہیں بلکہ اردو ادب کی جن سمتوں پر آنجہانی رضاؔ نے فکر و فن کے چراغ روشن کیے تھے ان تمام سمتوں کی محرومی اور اردو دنیا کا شش جہتی خسارہ ہے۔

چاہنے والوں کی یہ آہ طویل　　　تجھ کو واپس لا نہیں سکتی کبھی

☆☆☆

پدم شری کالی داس گپتا رضا، لندن میں

گلشن کھنہ

علامہ کالی داس گپتا رضا اردو کے عظیم شعراء کی صف میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ رضا صاحب سے میرا غائبانہ تعارف اور ادبی رشتہ تو ایک عرصہ سے قائم تھا اور ان کے بھائی لیش پال گپتا جو میرے قریب ہی ہونسلو (لندن) میں ہی قیام پذیر ہیں، سے اکثر اوقات رضا صاحب کے بارے میں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ مگر میں ان سے ذاتی طور پر کبھی نہیں ملا تھا۔ ان سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اگست ۲۰۰۰ء میں یوروپین اردو رائٹرز سوسائٹی کی عالمی کانفرنس میں شرکت کرنے لندن تشریف لائے تھے۔ ہماری پہلی اور رسمی سی ملاقات لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کی برونائی گیلری میں ہوئی تھی۔ کانفرنس کے اختتام پر جب لندن کے معروف شاعر جناب ساحؔر شیوی نے میرا تعارف کرایا تو وہ مجھ سے اس طرح بغل گیر ہوئے تھے جیسے صدیوں سے بچھڑے ہوئے دوست آپس میں ملتے ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ میرے بارے میں مختلف رسائل میں اکثر اوقات پڑھتے رہتے تھے اور مجھ سے ذاتی طور پر ملنے کے خواہش مند تھے۔ اس وقت ان کے ساکھشات درشن کرکے مجھے دلی مسرت کا احساس ہوا تھا۔

رضا صاحب جناب ساحؔر شیوی کے ہاں لیوٹن میں قیام پذیر تھے۔ جب لیوٹن کے عالمی مشاعرے میں ہماری دوسری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ بندہ ان کے اعزاز میں ایک محفل خاص اپنے غریب خانے پر سجانا چاہتا ہے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے میری التجا کو مان لیا تھا۔ اور طے شدہ تاریخ اور وقت کے مطابق وہ جمعرات ۳۱ر اگست ۲۰۰۰ء کی شام کو اپنی اہلیہ محترمہ ساوتری دیوی، جناب ساحؔر شیوی، بیگم ساحر شیوی اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے ساتھ شام سات بجے غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ اس محفل خاص میں لندن کے اور بھی بہت سے معروف اور مقبول شعرائے کرام مدعو تھے۔ رضؔا صاحب کا کلام سن کر ہم سب بہت محظوظ ہوئے تھے اور ان کی سنگت میں بیٹھ کر ہمیں انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع میسر ہوا تھا۔

محفل مشاعرہ کے بعد جب ہم سب دوست بے تکلف ہوکر کھانے کی میز پر بیٹھے تو ان کی شخصیت کے کئی پہلو اجاگر ہوئے۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ صرف ایک مخلص، مشفق اور ہمدرد انساں ہی نہیں تھے بلکہ ایک باغ و بہار اور جادوئی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے لندن میں قیام کے دوراں ہم نے اُنہیں وقت کے مطابق ہر رنگ اور ہر روپ میں دیکھا تھا، کبھی شاعر، کبھی محقق، کبھی ادیب اور کبھی مقرر کے روپ میں۔ وہ ایک ایسے مقرر تھے جو اپنی سادہ سحر بیانی سے بگڑے ہوئے مجمع کو پل بھر میں اپنی گرفت میں کر لیتے تھے۔

بہت سے لوگ بڑی تہہ دار شخصیت اور غضب کی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں اکثر

لوگ ایک وقت میں اپنی ایک ہی صلاحیت کو استعمال کرنے کی قوت رکھتے ہیں لیکن کالی داس گپتا رضا صاحب ایک ایسے فنکار تھے جنھیں اپنی کئی صلاحیتوں کو یک وقت استعمال کرنے پر قدرت حاصل تھی۔ اس کا ثبوت مجھے اس وقت ملا جب ہم نے ان کے اعزاز میں سنیچر ۹ر ستمبر ۲۰۰۰ء کو ہونسلو ملٹی کلچرل سینٹر، ہونسلو، ویسٹ لندن میں ایک ادبی محفل کا اہتمام کیا تھا۔ اس ادبی تقریب میں اردو شعر و ادب اور غالبؔ کے حوالے سے گفتگو ہوئی تھی اور حاضرین جلسہ نے رضاؔ صاحب سے غالبؔ کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں کئی اہم سوال کیے تھے۔ رضاؔ صاحب نے حسن اعتماد، خوش اسلوبی اور فنی مہارت سے تمام سوالوں کے جواب دیے تھے ان سے ان کی علمیت، دانشوری اور سحر بیانی کا سب کو خوب اندازہ ہوا تھا۔

کالی داس گپتا کا نام زباں پر آتے ہی سنسکرت زباں کا عظیم ڈرامہ "شکنتلا" اور اعلیٰ معیار کی شاعری کا تصور ہمارے ذہنوں میں اُبھر آتا ہے۔ شکنتلا کے خالق کا نام بھی مہاکوی کالی داس تھا۔ ہمارے رضاؔ صاحب بھی اردو کے ایسے کالی داس تھے جن کی شاعری میں روایت کے گہرے شعور کے ساتھ ساتھ تجربے کی نئی سمت بھی ہے اور ایک نئی جمالیاتی دنیا کی تشکیل بھی۔

کالی داس گپتا رضاؔ صاحب نے شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی تھی۔ گو انھوں نے ہر صنف میں امتیاز حاصل کیا تھا مگر بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ ان کے ہاں غزل کی روایت ایک رچاؤ کے ساتھ موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کو اس کے تہذیبی سیاق و سباق کے ساتھ بھی سمجھتے تھے اور عصری زندگی کے احوال و کوائف کو غزل کے موضوعات میں شامل کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ کالی داس گپتا رضا کے فن شاعری کا ذکر کرتے ہوئے جناب اسلم انصاری رقم طراز ہیں "رضا صاحب کے ہاں اپنے لہجے کو دریافت کرنے اور اپنی آواز کو پا لینے کی ایسی کامیاب صورتیں موجود ہیں، جو اُنھیں جدید غزل میں ایک منفرد مقام عطا کرنے کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ یہ بات اس لیے بھی صحیح ہے کہ وہ زندگی کے چھوٹے بڑے تجربوں سے گریزاں نہیں بلکہ اپنے شعری یا تخلیقی تجربے کی اساس بنانے کے قائل ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں جدید غزل کے، نئی طرزِ احساس کے فنی اور جمالیاتی نقوش بھی نمایاں ہیں"۔

کالی داس گپتا رضا غزل کے ایسے شاعر تھے جو زندگی کے ہر تجربے کو اپنے فن کا موضوع بنانے میں ماہر تھے۔ ان کی سوچ اپنی تھی اور ان کا ایک منفرد لہجہ اور رنگ سخن بھی تھا جو ہر لحاظ سے جدید اور قابل قدر ہے۔ انھوں نے جدید رجحانات اور نئی قدروں کو اپنایا ضرور تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ روایاتی شان دلکشی اور نغمگی کو بھی برقرار رکھا تھا۔ غزل گوئی کل کی ہو یا آج کی وہ اپنی روایت اور اظہار، بیاں کے مخصوص کلچر کے درمیاں ہی خوبصورت اور بھلی لگتی ہے۔ رضاؔ صاحب کے کلام کا مطالعہ کرکے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی جوہر اس کی غزلوں میں خوب چمکا تھا۔ اس کی غزلوں میں تغزل روایت کے ساتھ ساتھ زندگی کے گہرے شعور سے ابھرتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ میر کی طرح وہ بھی شعر کہنے اور زندگی کرنے کے ہنر کو باہم مترادف

خیال کرتے تھے۔ اس لیے ان کے ہاں تغزل اور شعور حیات ایک ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

ہمارے بگڑے مقدر کو اب سنوارے کون | کسے پکارا تھا ہم نے ہمیں پکارے کون
بہار، پھول، سحر، رنگ، لو، صبا، شبنم | یہ سب تو واقف گلچیں کے ہیں، ہمارے کون

اُڑتا پھرتا ہے غبار ہر سو | یہ دشت رواں کبھی چمن تھا
کیا روح دمک دمک اُٹھی تھی | کندن سے خیال کا بدن تھا

رضا وہ یاس کے کانٹے ہوں یا امید کے پھول | ہم اپنے سینے سے سب کو لگائے جاتے ہیں

اس قسم کے بے شمار اشعار ہیں جو رضا صاحب کے کلام کے شعری آب و رنگ کا سرمایہ ہیں۔ ان کے ہاں میر کا اسلوب اپنی سادگی، نغمگی اور مکالمے کی سی بے تعلقی کی جھلک دکھاتا نظر آتا ہے۔ رضا صاحب کے کلام میں حیات کی صحیح نقاشی اور تاثرات کی مکمل صورت بھی ملتی ہے۔ ندرت مضامین، پرواز تخیل اور حسین استعاروں کی دلفریبی، حق بینی اور فطرت شناسی کے ایسے نمونے بھی ملتے ہیں جو انسانیت کے روشن پہلو ہیں

سراغ منزلِ ہستی کسی کو مل نہ سکا | ہمارے دیکھتے کتنے ہی کارواں گزرے

ادھر دورِ نمو رکھا اُدھر فصلِ خزاں رکھ دی | بشر کی ناتواں ہستی پھر ان کے درمیاں رکھ دی

ہر ایک اشک نے پلکوں پہ آکے یہ جانا | گہر بھی خاک میں اکثر ملائے جاتے ہیں

کہکشاں چاند ستارے ہیں مرے نقشِ قدم | کون کہتا ہے فلک تک مری پرواز نہیں

رضا صاحب نے سستی شہرت اور نام و نمود سے بے نیاز ہو کر زندگی اور ادب کی قدروں کو شعر و فن کے صحیح سانچوں میں ڈھالا اور جدید خیالات کے ساتھ ساتھ قدیم روایتی شان اور دلکشی کو بھی برقرار رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے کلام میں جدید خیالات کو اچھوتے انداز میں اس طرح پیش کیا کہ وہ تیر و نشتر کی مانند ہمارے دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے طرز بیان میں بھی ایک ایسا حسن ہے کہ شعر پڑھتے ہی شراب کی سی مستی دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ رضا صاحب نے بادہ تغزل کے رنگین ساغر کچھ اس طرح چھلکائے کہ ان میں نہ ابہام ہے اور نہ ہی نعرہ ماری۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ رضا صاحب کے کلام میں فنی پختگی، وسعتِ نظر اور ایک خوبصورت شعری آہنگ کے وہ تمام آثار موجود ہیں جو ان کے کلام کو جدید اردو شاعری اور بالخصوص جدید اردو غزل کی دنیا میں ایک مستقل قدر و قیمت عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

☆☆☆

92, Grove Road, Hounslow, Middx - TW 3 - 3 PT (U K)

علامہ کالی داس گپتا رضاؔ، شولاپور میں

نذیر فتح پوری

مہاراشٹر کے علمی، ادبی شہروں میں ایک روشن نام شولاپور کا بھی ہے۔ شولاپور کی ادبی حیثیت کئی طرح مسلّم ہے۔ تاہم حسب اصلاحی و فلاحی تنظیم کے زیر اہتمام شولاپور میں اردو میلہ کا انعقاد عمل میں آیا تو شولاپور اردو کے نقشے میں ایک سورج کی مانند چمکنے لگا۔ یہ میلہ جس کا افتتاح ۱۲ر مارچ کو علامہ کالی داس گپتا رضا کے مبارک ہاتھوں سے ہوا تھا اور مہمان خصوصی کے طور پر مرحوم علی سردار جعفری شریک تھے۔ اب یہ دونوں بزرگ موجود نہیں ہیں تو اس میلے کی تاریخی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہم ۱۴ر مارچ ۱۹۹۹ء کی شب ایک عظیم الشان مشاعرے کے اختتام کے ساتھ ہی ختم ہونے والے اس تاریخی اردو میلے کی تفصیلات یہاں بیان نہیں کریں گے۔ صرف کالی داس گپتا رضاؔ سے متعلق ہی تفصیلات بیان کریں گے۔

آج ۱۱ر مارچ ۱۹۹۹ء کا ایک یادگار دن ہے۔ آج اردو کے نامور شاعر و ادیب، محقق و ناقد، مبلغ و امیر علامہ کالی داس گپتا رضا بذریعہ ریل ممبئی سے اپنی اہلیہ محترمہ ساوتری گپتا کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ شولاپور والے خوش قسمت ہیں کہ انھیں کالی داس گپتا رضا جیسے مہمان میسر آئے اور گپتا رضا صاحب کو بھی اپنے آپ پر ناز ہے کہ شولاپور جیسے شہر نے ان کی میزبانی کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ دونوں طرف خلوص اور یگانگت کا ایک بے کراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے محبتوں کے سارے تار اپنا آخری ساز بجا کر آج ہی ٹوٹ جائیں گے۔ چہروں کی شادابی پھولوں کو شرما رہی ہے، آنکھوں کی چمک اور روشنی اُجالوں کو مات دے رہی ہے۔ کالی داس گپتا رضا اپنی بیگم کے ساتھ جیسے ہی ریل کے ڈبے سے پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہیں انہیں زمین کہیں نظر نہیں آتی۔ تاحد نظر پھولوں کی چادر بچھی ہوئی ہے۔ رضا صاحب پھولوں پر قدم رکھتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔ تکلف فرما رہے ہیں۔ انہوں نے زندگی بھر پھولوں سے پیار کیا ہے۔ ان کا احترام کیا ہے۔ ان کی خوشبو کو سانسوں میں گھول کر اپنی روح کو تازگی بخشی ہے۔ آج وہی پھول ان کے قدموں کے نیچے بچھے ہوئے ہیں۔ میزباں اُن سے پھولوں پر چلنے کے لیے اصرار کر رہے ہیں۔ جو پھول ہمیشہ ان کے گلے کا ہار اور ان کی شخصیت کا سنگھار رہے ہیں وہی آج ان کے استقبال میں زمین کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ پلیٹ فارم سے لے کر ریلوے اسٹیشن کے دروازے تک پھولوں سے بنی سڑک پر چلتے چلتے وہ باہر نکل آئے ہیں۔ باہر کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھوں کی بینائی بڑھ گئی۔ گاڑیوں اور آٹو رکشاؤں کی ایک قطار ان کے پُر تپاک خیر مقدم کے لیے یہاں موجود ہے۔ ان پر اردو زندہ باد اور کالی داس گپتا رضا زندہ باد کے سٹیکر لگے ہیں۔ کچھ نوجوان پلے کارڈ لیے کھڑے

ہیں۔ دھنک رنگوں میں خوبصورت خط کے ساتھ شعر اور مقولے اردو کے تئیں شولاپور والوں کے بے پناہ خلوص کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ فضا میں بھی نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ تمام لوگ یک زباں ہو کر "اردو زندہ باد"، "کالی داس گپتا رضا زندہ باد" کے نعرے لگا رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے پورا ہندوستان ان دو نعروں میں سمٹ کر ایک روشن استعارہ بن گیا ہے۔

"اردو زندہ باد" ، "کالی داس گپتا رضا زندہ باد"

رضاؔ صاحب ایک بڑی سوری کار میں تشریف رکھ چکے ہیں اور اردو کا یہ قافلہ اپنے قائد کے پیچھے پیچھے اس امید پر چلنے لگا ہے کہ آج یہ اردو زباں کو تاریکیوں کے گہرے غار سے نکال کر آسماں کے ماتھے کا جھومر بنا کر ہی دم لے گا۔ شہر کی آنکھوں نے اردو کے رنگ میں رنگا ہوا ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ میلے کی رسمی ابتداء اور باضابطہ افتتاح تو کل ہوگا لیکن آج ہی اردو کے جلوے اپنی تمام تر رونق کے ساتھ دکھائی دینے لگے ہیں۔ قلب شہر سے گزرتا ہوا محبان اردو کا یہ قافلہ جب ہوٹل پریکا پر آکر رکا تو یہاں پہلے سے موجود جم غفیر نے نعرے لگا کر رضا صاحب کا استقبال کیا۔ کار کا دروازہ کھول کر جب رضا صاحب نے قدم زمیں پر رکھے تو یہاں بھی پھولوں کی گداحتی نے ان کے قدم چومے۔ کار سے لے کر ہوٹل کے دروازے تک اور سیڑھیوں سے لے کر اس کمرے تک جس میں رضا صاحب کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ پھولوں کا جال بچھا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شولاپور والوں نے آج کے دن کے لیے کئی دنوں سے پھولوں کا انبار لگا کر رکھا تھا۔ یہ دور جہاں بطور خاص اردو کا شاعر کبھی کبھی ایک پھول کے لیے ترس جاتا ہے۔ وہاں اردو کی ایک شخصیت کے استقبال کے لیے یوں چمن کھل جائیں گے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہاں جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہے یہ کوئی خواب نہیں ہے۔ کسی تصوراتی نظم کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ کسی فلم کا کوئی منظر نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی سچائی ہے جو پوری طرح الفاظ کی گرفت میں نہیں آ رہی ہے۔ ان پھولوں کا تو ذکر بھول گیا ہوں جو ریل سے اُترنے کے بعد کمرے میں داخل ہونے تک رضا صاحب پر اچھالے گئے، لٹائے گئے یا نچھاور کیے گئے۔ ان پھولوں کی گنتی کوئی تجربہ کار گلچیں یا باغباں تاجر بھی نہیں کر سکتا۔ پھولوں کے اس سفر کے دوران رضا صاحب نے کئی تاریخی جملے کہے، ان میں ایک جملہ جس کا مفہوم کس معنویت کا حامل ہے، اندازہ لگایا جا سکتا ہے

"یہ منظر دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے آج سے اردو کا عروج دوبارہ شروع ہو گیا ہے"۔

پونہ سے گیارہ کی شب کو روانہ ہو کر صبح سورج کی کرنوں کے ساتھ میں بھی اس تاریخی میلہ کا ایک حصہ بننے کے لیے جب شولاپور پہنچا تو شہر کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جس آٹو رکشے پر نگاہ پڑی اردو زندہ باد اور کالی داس گپتا رضا زندہ باد کا بینر آویزاں کیے نظر آیا۔ دیواروں پر جگہ جگہ اردو میلے کے پوسٹر اس زوال پذیر دور میں اردو کے تابناک مستقبل کا استعارہ نظر آ رہے تھے۔ ناشتے کے بعد جب میں رضاؔ صاحب کے نیاز حاصل کرنے کے لیے ہوٹل پہنچا اور جب ان کے کمرے میں داخل ہوا تو پھر میری حیرتوں نے مجھے آ لیا۔ رضا صاحب

اور ان کی بیگم اپنے بیڈ پر براجماں تھے اور کمرے میں ملاقاتیوں کا ایک ہجوم۔ جب ایک کونے پر میری نظر پڑی تو وہاں پھولوں کے ہار، کیک اور دستے ایک انبار کی صورت میں دکھائی دیے۔ ۱۱ر مارچ کا منظر شدید تھا لیکن اب میں سب کچھ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ محبتیں، عقیدتیں، نوازشیں، فصاحتیں، ملاحتیں، ہر کوئی رضا صاحب سے اچھی اردو میں گفتگو کرنے کی کوشش ہی نہیں کر رہا تھا بلکہ اچھی گفتگو کر رہا تھا۔ شولاپور والے اپنا اپنا تعارف کرانے میں ذرا تکلف سے کام لے رہے تھے۔ میرے خیال میں ان کا سب سے بڑا اور قابل فخر تعارف تو اردو میلہ ہی تھا جس کی بارونق تصاویر آج بھی ذہنوں میں زندہ ہیں۔ جب بھیڑ کم ہوئی تو میں نے رضا صاحب سے مصافحہ کیا۔ انھوں نے میری خیریت اور سلامتی کے بارے میں دریافت کیا۔ سفر کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے بعد چائے آگئی اور چائے کے بعد میں رضا صاحب سے اجازت لے کر اور مصافحہ کر کے جہاں مجھے تین روز قیام کرنا تھا وہاں آگیا۔ اس دن ڈاکٹر محبوب راہی بھی تشریف لے آئے اور پھر ہم دونوں ایک ہی کمرے میں سکونت پذیر ہوگئے۔

۱۲ر مارچ کی صبح ۸ بجے میلے کے افتتاحی پروگرام کو میں پھر بھول گیا ہوں۔ تاخیر سے پہنچنے کے سبب میں اس "اردو جلوس" میں شامل ہونے سے محروم رہا تھا۔ اس اردو جلوس کا افتتاح اور قیادت کی ذمہ داریاں رضا صاحب ہی نے انجام دیے۔ اردو جلوس کے افتتاح کا منظر بقول رضا ۱۱ر مارچ کے استقبالیہ منظر سے زیادہ سہانا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں اردو اسکولوں کے طلبہ اور طالبات اپنے اپنے اسکولی لباس میں ملبوس ایک ضابطے کے تحت قطار اندر قطار میدان میں استادہ تھے۔ منتظمین نے سب سے پہلے بیگم رضا کو پھول پیش کر کے ان کا استقبال کیا۔ پھر رضا صاحب سے گذارش کی کہ وہ اردو جلوس کا افتتاح فرمائیں۔ رضا صاحب نے چند بلیغ جملوں میں جلوس کا افتتاح فرمایا اور اس کے بعد تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں پہلے رنگ برنگے غبارے آسماں میں چھوڑے تو یوں لگا جیسے یہ غبارے نہ ہوں دعا کے پھول ہوں جو اردو کی بقا اور اس کے تابناک مستقبل کے لیے مانگی گئی ہے۔ اس کے بعد رضا صاحب کے امن پرور دست مبارک سے بھائی چارے اور امن کی علامت کے طور پر کبوتر اڑائے گئے۔ میدان میں ہزاروں بچوں کے علاوہ عمائدین شہر بھی کثرت سے موجود تھے۔ اس کے بعد جلوس روانہ ہوا اور ایک شانِ بے نیازی سے تین چار کلومیٹر کی لمبی مسافت طے کر کے اردو نواز نعروں سے فضاؤں میں گونج بھرتا ہوا اپنی منزل پر واپس آگیا۔

قدیر نگر میں "ہتاتما سرتی مندر" کے خوبصورت اسٹیج پر پہلا استقبالیہ جلسہ ہوا۔ اردو کے کسی جلسے میں سامعین کی اتنی بڑی تعداد میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی۔ حیرت اور مسرت کا مقام ہے کہ خواتین وحضرات اپنے دوپہر کے توشے باندھ کر ساتھ لائے تھے۔

یہاں پہلے جلسے کا افتتاح بھی رضا صاحب ہی کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آیا۔ حکومت مہاراشٹر کے سیاسی رہنما جناب سوشیل کمار شندے اور موہتے پاٹیل خاص مہمانوں کی حیثیت سے موجود تھے۔ شہر کے اہم

ایل اے کامریڈ نرسیا آدم نے شمع جلائی اور سبھی نے اردو کے حق میں تقاریر کیں۔ رضا صاحب نے کہا کہ
"اس شاندار اردو میلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا عروج پھر سے شروع ہو گیا اور شاید اس کی شروعات مہاراشٹر کے اس قدیم شہر شولاپور سے ہو رہی ہے"۔

رضا صاحب نے بطور خاص شولاپور کے اس اردو میلے کے لیے ایک نظم اور نظم کے اختتام پر ایک قطعہ کہا تھا۔

اردو، کہ آج شہر تمنا لیے ہوئے
سر پھوڑتی ہے عظمت رفتہ لیے ہوئے
پھرتی ہے خار و حشت میں کیا کیا لیے ہوئے
ساقی و جام، جادہ و مینا لیے ہوئے
سر میں خیال نو کا تقاضہ لیے ہوئے
دامن میں میر و غالب و انشاء لیے ہوئے
پرچم لیے ہوئے جو اقبال و فیض کا
مومن کا، ذوق و داغ کا طرّہ لیے ہوئے
چکبست اور نسیم پہ ہوتے ہوئے نثار
شب خیزی فراق کا شہرہ لیے ہوئے
ہر لحظہ گفتگو میں پروئے ہوئے گہر
صفحوں میں حسن زیست کا املا لیے ہوئے
تحریر میں چھپائے ہوئے لال، صد ہزار
تقریر میں روانیٔ دریا لیے ہوئے
لیکن کسے پکارے، صدا کس کے در پہ دے
ہونٹوں پہ نازکی کا خزانہ لیے ہوئے

تو ہی رضا سہارا دے اس کو، کہ آئی ہے
کانوں میں تیرے نام کا غوغہ لیے ہوئے

قطعہ

بے شک رضا ہے سارے لبوں پر یہی دعا
اردو کو پھر ملے وہی پہلا سا مرتبہ
سب بند ٹوٹ جائیں زمان و مکان کے
میلے یونہی لگا کریں اردو زبان کے

یہ نظم رضا صاحب نے ۱۴ر مارچ ۱۹۹۱ء کی شب مشاعرے کا افتتاح کرنے کے فوراً بعد پیش کی تھی اور اسی نظم سے مشاعرے کی کامیابی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مشاعرے کی صدارت علی سردار جعفری فرما رہے تھے۔ نظامت کے فرائض عبد الاحد ساز ادا کر رہے تھے۔ ممتاز شعراء کی موجودگی میں اسٹیج جتنا پروقار تھا سامعین کی بے پناہ شرکت نے مشاعرہ گاہ کو بھی اتنا ہی یادگار بنا دیا تھا۔ ہال میں جتنی کرسیاں موجود تھیں ان کے بھر جانے کے بعد باہر سے کرسیاں منگوا کر خالی جگہوں پر سامعین بیٹھے ہوئے تھے یعنی یہ ہال "ہاؤس فل" کی

تعریف سے بھی آگے نکل چکا تھا۔

شولاپور کے اس تین روزہ اردو میلے کی اوّل تا آخر روداد اگر قلمبند کی جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے شولاپور والوں نے بعد میں کوئی کتاب شائع بھی کی ہو۔ لیکن میری نظر سے نہیں گزری۔

۱۴ر مارچ کی شام مشاعرے سے پہلے تقسیم انعامات کا ایک جلسہ بھی ہوا جس میں جعفری صاحب اور رضا صاحب دونوں موجود تھے۔ وہاں رضا صاحب نے مختصر تقریر میں کہا تھا

"اردو زبان دشمنی کا لفظ نہیں جانتی اس لیے ہمارے منہ سے اردو کے متعلق جو بات نکلتی ہے وہ میٹھی اور موافقت ہی کی ہوتی ہے۔ اردو کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے اس کا غبار تو میرے دل میں بھی ہے مگر اردو زبان کا مزاج مجھے روکتا ہے کہ میں غبار نہیں بلکہ شیرینی بانٹوں تو وہی آپ کے پیش نظر ہے"۔

رضا صاحب نے اس اردو میلے کے دوران اپنی ایک تقریر میں یہ بھی فرمایا تھا کہ

"اردو کو غیر ملکی زبان کہنا شدید عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ اگر پاکستان میں اردو کی اتنی پذیرائی ہو رہی ہے تو ہمیں خوش ہونا چاہیے اور اہل پاکستان کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم نے انہیں اتنی نفیس، سلیس اور عمدہ زبان دی۔ اردو ہماری اپنی زبان ہے۔ ہندوستان کی زبان ہے۔ یہ جہاں بھی جس ملک میں بھی بولی جائے گی ہمارے لیے مسرت کا باعث ہوگی"۔

شولاپور کا یہ اردو میلہ جس پر لاکھوں خرچ ہوئے اور شہر کی تمام ادبی، سیاسی اور سماجی تنظیموں نے مل کر جسے کامیابی سے ہمکنار کیا لیکن ادبی طور پر اس کی کامیابی کا سہرا مرحوم علی سردار جعفری اور کالی داس گپتا رضا کی شرکت، ان کے کلمات، ان کی بے پناہ ادبی برکتوں اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلی ہوئی اردو کی محبت کے سر بھی باندھا جائے گا۔ ان سطور کے ذریعہ ہم اپنے دونوں مرحوم بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اردو کی اس طوفاں بدوش کشتی کو ساحل پر لانے کے لیے خدا پھر کسی سردار اور کسی رضا کو پیدا کرے۔

☆☆☆

منظومات ۔ تاریخی قطعات

کالی داس گپتا رِضاؔ

علی سردار جعفری مرحوم

"روشِ رضائے الٰہی کی ہے عجیب و غریب"
ہمارے عہد میں آیا ہے ایک رمز شناس

ہے اس کے علم کے شعلے میں جوہرِ شمشیر
اور اس کے ذوقِ سخن میں ہے جوہرِ الماس

بجھا سکے نہ جسے موجِ کوثر و تسنیم
خدا کرے کہ بڑھے اور اُس کے علم کی پیاس

خدا کرے وہ ملے اُس کو منزلِ تحقیق
پہنچ سکیں نہ جہاں رہروانِ وہم و قیاس

ابھی کچھ اور بھی نقش و نگارِ لوح و قلم
کہ زندگی کا صنم خانہ آج بھی ہے اُداس

کوئی ورق، ورقِ آفتابِ نو کی طرح
ابھی سحر کے ہے تن پر شبِ سیہ کا لباس

جو گُل بہشتِ تخیل میں کِھلتا رہتا ہے
نہ وہ زمین کے دل میں نہ آسمان کے پاس

"سلامتِ 'ہنر و حرف' در سلامتِ اُست"
کہ جزوِ اعظمِ گپتا ہے اسمِ کالی داس

کامل فن تھا جو حاصل فن تھا جو

ڈاکٹر محبوب راہی
بارشی ٹاکلی، اکولہ

رہبر راہ تحقیق گپتا رضا
فکر و فن کا اتالیق گپتا رضا

اس جہان خرابات کو چھوڑ کر
چل دیا رشتے ناطے سبھی توڑ کر

بزم شعر و ادب کتنی سنسان ہے
محفل نقد و تحقیق ویران ہے

وہ اٹھا، فکر و فن کا وقار اٹھ گیا
لفظ و معنی کا اک اعتبار اُٹھ گیا

وہ کہ سچا پرستارِ غالب جو تھا
وہ کہ غواص بحرِ مطالب جو تھا

داغ کے سلسلے سے جو منسوب تھا
جوش کا جو کہ شاگرد محبوب تھا

جیسے آزاد ہے دھن میں اقبال کی
تھی رضا کو بھی غالب سے نسبت وہی

جو تھا دیوانہ غالب کے اشعار کا
اس کے اطوار کا اس کے افکار کا

جس نے دیوان غالب کی ترتیب دی
اک سلیقے سے تاریخی تہذیب دی

کھینچ کر عکس اس کے دواوین کے
تشنگانِ ادب کو عطا کردیے

کچھ تصانیفِ غالب کو روشن کیا
لفظ و معنی، مطالب کو روشن کیا

زندگی کے بھی پہلو اجاگر کیے
رازِ باطن کئی تھے جو ظاہر کیے

جوش استاد تھے ملسیانی جو تھے
ماہر فکر و فن خاندانی جو تھے

ان کے فن ان کے افکار و اطوار پر
زندگی ان کی اور ان کے کردار پر

کلیات و مقالات چکبست پر
فکر و فن اور حالات چکبست پر

ذوق پر داغ پر اور اقبال پر
ان کے افکار و اقوال و اشغال پر

کیسے کیسوں پہ کس درجہ کتنا لکھا
حد نہ کچھ رکھی اس درجہ، اتنا لکھا

ان گنت اس نے اردو پہ احساں کیے
مرحلے کتنے دشوار آساں کیے

نظم لکھی، غزل اور رباعی لکھی
دسترس جس کی ہر صنف پر خوب تھی

ماہرِ فن تھا جو کاملِ فن تھا جو
فن کا نباض تھا حاصلِ فن تھا جو

فن کی باریکیوں پر تھی جس کی نظر
خوبیوں، خامیوں پر تھی جس کی نظر

نیک کردار تھا وہ خوش اطوار تھا
پیکرِ خلق یاروں کا وہ یار تھا

کیا بیاں میں کروں اس کے اخلاص کا
معترف میں بھی ہوں اس کے اخلاص کا

اس سے ملنے کا حاصل مجھے ہے شرف
شہرتیں جس کی دنیا میں ہیں ہر طرف

یاد ہے اس کے لہجے کی وہ نغمگی
اس کی تہذیب اس کی وہ شائستگی

گفتگو عالمانہ وجاہت سے پُر
اور تخاطب کا لہجہ شرافت سے پُر

صوت و الفاظ کی اس کی شرینیاں
گونجتی تھیں سماعت میں شہنائیاں

حسن اخلاق کی اک علامت تھا جو
سر بسر پیکرِ آدمیت تھا جو

علم و عرفاں کا جو ایک معیار تھا
فہم و ادراک کا بحر دخار تھا

وہ تھا ایسا کہ لوگ ایسے کمیاب ہیں
صرف کمیاب ہی کیا ہیں نایاب ہیں

بزمِ ہستی سے ہیہات وہ اُٹھ گیا
ہجر کے دیکھے صدمات وہ اٹھ گیا

بس جو چلتا تو مرنے نہ دیتے اسے
یوں جہاں سے گزرنے نہ دیتے اسے

سب ہیں بے بس کہ قانون فطرت ہے یہ
لاکھ پھر وجہِ کرب و اذیت ہے یہ

اس سے راہِ مفر کوئی راہی نہیں
موت کے ماسوا راستا ہی نہیں

☆☆☆

خراجِ عقیدت

مشتاق جوہر

سب کے دامن کو جھٹک کر چلے جانے والے
اے رضا ڈھونڈتے ہیں تجھ کو زمانے والے

تو وہ ساقی تھا جسے دیکھ کے آجائے خمار
خشک ہونٹوں کے لیے جام بڑھانے والے

بات کچھ اور تھی الفاظ گری میں تیری
یوں تو ہیں اور بھی لفظوں کو سجانے والے

نغمہ سازوں میں ترا نام رہے گا روشن
شہرِ تخلیق میں اے دھوم مچانے والے

فن کی لیلیٰ نے تجھے شہرت و عظمت بخشی
دولتِ فکر خزانے میں لٹانے والے

عمر بھر کون کسے یاد کیا کرتا ہے
بھول جائیں گے تجھے بھی یہ زمانے والے

موت بر حق ہے یہ تسلیم ہے جوہر لیکن
یاد آتی ہے تری چھوڑ کے جانے والے

1/2, H / 15, J K Ghosh Road, Belgachia, Kolkatta - 700 037

بھائی کالی داس گپتا کے لیے

لیش پال گپتا لیشؔ

(رضا صاحب کی لندن آمد پر ان کے بھائی لیش پال گپتا کے تاثرات)

میں کیوں ان کی حمایت میں نہ بولوں — مرے بھائی ہیں کالی داس گپتا
سرِ محفل ہی ظاہر ہے یہ سب پر — چھپانے سے بھی یہ جوہر نہ چھپتا

تعارف اس کا ہے تحقیق و تنقید — یہ انساں بھی نیار و نار کے ہیں
رضا بھائی کے شعروں کی کہوں کیا — سحور یہ بڑے اندار کے ہیں

رضا کا دیکھیے غالبؔ کلیکشن — ہے جاری ہر ورق فیضانِ غالبؔ
بہت ہیں کارنامے گو رضاؔ کے — مگر سب سے بڑا دیوانِ غالبؔ

سدا قائم رہیں گی جس سے قدریں — وہی محفل وہی بزم رضا ہے
رضا بجھنے نہ دے شمع ادب کی — جیے لاکھوں برس لیشؔ کی دعا ہے

محقق ہیں مدبر ہیں سخی ہیں — "جہاں میں ایسے انساں بھی کہاں ہیں"
غضب ہے آپ کی فہم و فراست — "رضا شاعر ہیں اور شیوا بیاں ہیں"

☆☆☆

آہ! رضا صاحب

ماہیے

شارق جمال

دیوانے وہ "اردو" کے
گیتا رضا صاحب
شاعر تھے، محقق تھے

غالبؔ کو پڑھا، پڑھ کر
لکھا ، پھر آپ آئے
"اقبالؔ کی چوکھٹ پر"

شہرت کے نہ تھے طالب
آپ کے خامے نے
غالب کو کیا غالب

☆ ☆ ☆

تحقیق کی ہلچل تھی
"اردو" کے جگت میں
تحقیق مکمل تھی

اِس نارشِ 'اردو' کا
لیکھ معطّر تھا
بھنڈار تھا خوشبو کا

ہاں اہلِ قلم ایسے
آئے ہیں دنیا میں
برسوں میں رضاؔ جیسے

☆ ☆ ☆

تھی خو نہ اُلجھنے کی
طرزِ مخالف کو
عادت تھی سمجھنے کی

'اردو' کو تھا ناز اُن پر
علم کے فن کے بھی
در سب ہی تھے باز اُن پر

ہر طرز ادیبانہ
آپ کا ہوتا تھا
معیار کا پیمانہ

☆ ☆ ☆

تھے طالبِ علم ایسے
جوشؔ کے مکتب کے
خود جوشؔ ہی ہوں جیسے

ہر ایک شناسا کو
آپ کا دکھ ہے
احباب کی دنیا کو

یہ درد و غمِ فرقت
آہ ! رضا صاحب
دنیا سے ہوئے رخصت

☆☆☆

Takia Masoom Shah, Mominpura, Nagpur - 18

نوحہ

(بر انتقال پُر ملال آنجہانی کالی داس گپتا رضاؔ)

مختار ٹونکی

☆

پہلے جیسی محفلیں چرخ ستم گر اب کہاں ۔۔۔ اردو والوں کا تھا جیسا وہ مقدر اب کہاں
چل دیے سردارؔ اور مجروحؔ بھی رخصت ہوئے ۔۔۔ بس یہی دو چار تھے ایسے سخنور اب کہاں
ارتحالِ حضرتِ گپتا سے یہ روشن ہوا ۔۔۔ جو چراغِ انجمن تھا وہ سخنور اب کہاں
درمیاں ہے اب کہاں وہ شاعر اردو رضاؔ ۔۔۔ اور اس کا وہ کلامِ روح پرور اب کہاں
جس کی غزلوں میں نہاں تھے رمزہائے زندگی ۔۔۔ تھے حقائق جس کے شعروں سے اجاگر اب کہاں
جو مجسم سادگی تھا جو سراپا زندگی ۔۔۔ بات کا تھا جو دھنی دل کا تونگر اب کہاں
کشورِ تحقیق پر بھی جس کا سکہ تھا رواں ۔۔۔ فاتحِ شہرِ غزل تھا وہ سکندر اب کہاں
جس کے ہاتھوں میں رہا برسوں قلم گوہر فشاں ۔۔۔ قلزمِ علم و ادب کا وہ شناور اب کہاں
ماہ و انجم شاعری کے ہوگئے بے نور سب ۔۔۔ آسمانِ فکر کا مہرِ منور اب کہاں
فخر تھا جس پر وطن کو، ناز تھا جس پر ہمیں ۔۔۔ شاعرِ یکتا غزل کا وہ پیمبر اب کہاں
جس کی آب و تاب سے روشن تھی یہ اردو زباں ۔۔۔ معدنِ ارضِ وطن کا وہ جواہر اب کہاں

ناگہانی موت ہوگی یہ کبھی سوچا نہ تھا
ہم نے اس کے مرتبے کو آج تک سمجھا نہ تھا

☆☆☆

Kalı Paltan Road, Pul Mohd Khan, Tonk, Rajasthan - 304 001

خراجِ عقیدت

(کالی داس گپتا رضا کے انتقال پر)

مظفر صدیقی

میزاں ذہن و دل کا توازن بگڑ گیا
افسوس ہم سے ایک سخنور بچھڑ گیا
سانسوں کا احتساب خسارے میں پڑ گیا
اردو ادب میں جس کا اثر لا حدود تھا
وہ کالی داس گپتا رضا کا وجود تھا

☆

اک فن شناس، صاحبِ نقد و نظر تھا وہ
ہر منزلت سے پوری طرح باخبر تھا وہ
آئینۂ فنوں کا آئینہ گر تھا وہ
خود کو ہمیشہ جس نے غلامِ ادب کہا
وہ کالی داس گپتا رضا اب نہیں رہا

☆

اس کی نگارشات و تصانیف بے شمار
دونوں میں اُس نے رکھا توازن کو برقرار
جدت پسند، قدرے روایت کا پاسدار
تنقیدِ فن کی آج جو موجودہ ساخت ہے
وہ کالی داس گپتا رضا کی شناخت ہے

☆

اپنے اکابرین کی تعظیم کے لیے
غالب کی اختراع کی تفہیم کے لیے
شعری لوازمات کی تقویم کے لیے
کوئی ادب شناس قلم جب اُٹھائے گا
تب کالی داس گپتا رضا یاد آئے گا

☆

اعزاز باوقار بھی حاصل نہ کر سکا
دنیائے بے ثبات کو منزل نہ کر سکا
وہ اہتمام ضبطِ غم دل نہ کر سکا
پیہم سفر میں رہنا ہی اُس کا پیام تھا
وہ کالی داس گپتا رضا ہی کا کام تھا

☆

اک منفرد ادیب ہو اور خوش نصیب ہو
شاعر جو شر سے دور ہو، حق کے قریب ہو
یکتائے فن ہو، لوح و قلم کا نقیب ہو
ممکن نہیں کہ ایسا دوبارہ ملے کبھی
اور کالی داس گپتا رضا جی اُٹھے کبھی

☆☆☆

/ 70, Mahi Colony, Banswara, Rajasthan - 327 001

گیت خراجِ عقیدت ۔ آنجہانی کالی داس گپتا رضاؔ

سوہن راہی

(یہ گیت ۲۴؍مارچ ۲۰۰۱ء کو آنجہانی کالی داس گپتا رضا کے انتقال پر تعزیتی جلسہ زیرِ صدارت ڈاکٹر عبدالغفار عزمؔ میں پڑھا گیا جو کہ ملٹی کلچرل سینٹر ہسلو، مڈل سیکس، انگلینڈ میں منعقد ہوا تھا)

موت ہی آخر میت ہماری
یہ ہی ہار، یہ ہی جیت ہماری
کر لو کچھ تیاری
راہیؔ کر لو کچھ تیاری
منزل بہت ہے بھاری

ندی کنارے لہریں گننا، کبھی سیپ، کبھی کنکر چننا
موہ مایا موتی کے کارن من کا ہیرا میلا کرنا
اسی لگن میں ساری دنیا
پھرے ہے ماری ماری
کر لو کچھ تیاری

جیتے جی شعلوں پر چلنا، سانس سانس دیپک سا جلنا
رینا اسووں چادر بن کر، پھول سے دل کو اپنا کرنا
یہ ہی دشا ہے جگ میں ہمری
یہ ہی دشا تمہاری
کر لو کچھ تیاری

سپنوں کے جھولوں میں جھولیں، دھرتی سے امبر کو چھو لیں
چھوٹے سے جیون کی خاطر، ہم کیا ہیں یہ سب ہی بھولیں
اس نراش کے دکھ بندھن میں
کٹے عمریا ساری
کر لو کچھ تیاری

☆☆☆

63, Hamilton Avenue,
Surbiton Surrey,
KT 67 PW
England

تعزیتی ماہیے

(کالی داس گپتا رضاؔ کے انتقال سے متاثر ہو کر)

ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ اجمیری

اے کالی داس رضاؔ
دیکھا نہیں ہم نے
فنکار کوئی تجھ سا

پتلا تھا شرافت کا
اور ماہر بھی تھا
تو فنِ بلاغت کا

تو ناز اٹھاتا تھا
شعراء و ادباء کو
سینے سے لگاتا تھا

☆

تو عرش کا پیارا تھا
جوش سے جوہری نے
دن رات تراشا تھا

ہر آنکھ کا تارا تھا
گپتا رضاؔ تیرا
انداز نرالا تھا

مشہور زمانہ تھا
علم و حکمت کا
تو ایک خزانہ تھا

☆

'اسباق' کا ایڈیٹر
اے مرحوم رضاؔ
باراں ہے بڑا تجھ پر

جب آپ نے کوچ کیا
تو یہ لگا سب کو
شعلہ خاموش ہوا

اسلوب یگانہ تھا
لیلائے اردو کا
شیدا و دیوانہ تھا

☆

تاریخ بھی کہتا تھا
اور نصیحت کا
تو درس بھی دیتا تھا

سرشار تھے الفت سے
دور ہی رہتے تھے
نفرت سے کدورت سے

بے لاگ مبصر تھے
کالی داس رضاؔ
اک اعلیٰ شاعر تھے

☆

احسان رضاؔ کا ہے
اردو کی خدمت میں
ہر لمحہ گزارا ہے

غالب سے عقیدت تھی
اور چکبستؔ سے بھی
کس درجہ محبت تھی

تحقیق میں یکتا تھا
اور تنقید میں بھی
تیرا سکہ چلتا تھا

☆☆☆

C/o Mr Mohd, Ali Shah, Near Tazia Chowki,
Mohalla Vyoparian, Bikaner, Rajasthan - 334 001

میرے غم، میرے آنسو .. آہ کالی داس گپتا رضاؔ

اندر جیت گاندھی

رضاؔ! اک مہرباں تھا، نہ رہا ۔۔۔ اُنس و اُلفت کی حال تھا، نہ رہا
آج مغموم ہیں سب اہلِ سخن ۔۔۔ رضاؔ اک نکتہ داں تھا، نہ رہا

رضاؔ، شانِ سخن تھا، نہ رہا ۔۔۔ صاحب علم و فن تھا، نہ رہا
کیوں نہ روئیں سب اہلِ سخن ۔۔۔ رونق ہر انجمن تھا، نہ رہا

محفل شعر و ادب ہوگئی سونی ۔۔۔ اُٹھ گیا جہاں سے اک پیکر
ماہر غالبیات، کالی داس رضاؔ ۔۔۔ ترے غم میں ہے سوگوار ہر سخنور

اُٹھ گیا ، کالی داس گپتا رضاؔ ۔۔۔ شاعر جادو بیاں رُخصت ہوا
پاسبان ادب، زینت محفل ندیم ۔۔۔ راہبر اردو زباں رخصت ہوا

شاہ اقلیم سخن رخصت ہوا ۔۔۔ توڑ کر سب سے لگن رُخصت ہوا
کیوں نہ روئیں آج گاندھیؔ ہم سبھی ۔۔۔ تاجدارِ فکر و فن رخصت ہوا

208، کادمبری، سیکٹر 9، روہنی دہلی 110035

چند رباعیاں

جمال اختر عاصی کانپوری

تھے ناقد فن، ماہر غالب تھے رضاؔ ۔۔۔ آگاہ معانی و مطالب تھے رضاؔ
دن رات بس اردو کے لیے جیتے تھے ۔۔۔ اردو ہے اگر جسم تو قالب تھے رضاؔ

شاعر تھا وہ و اللہ سخنور تھا وہ ۔۔۔ الفاظ و معانی کا سمندر تھا وہ
تھا صاحبِ فن حاملِ فن ماہر فن ۔۔۔ اردو کا سپاہی تھا کہ لشکر تھا وہ

غالب کے طرفدار رضا صاحب تھے ۔۔۔ باوضع طرح دار رضا صاحب تھے
شاعر بھی تھے نقاد و محقق بھی تھے وہ ۔۔۔ اردو کے پرستار رضا صاحب تھے

غالب کا وہ دیوان جو چھاپا اُس نے ۔۔۔ آئینہ زمانے کو دِکھایا اُس نے
غزلوں میں ہے ترتیبِ زمانے کا لحاظ ۔۔۔ یہ کام دِکھایا ہے نرالا اُس نے

C/o Saleem Tailors, 63/67 Ghasyari Mandi, Kanpur U P

ایک قطعہ چند ماہیے

امین حزیں

قطعہ

وہ سخور، وہ محقق، وہ فدائے اردو جس نے پہنچائی زمانے میں صدائے اردو
وہی آواز ہوئی بند رضا کی صورت زندگی جس نے گزاری ہے برائے اردو

ماہیے

☆

تحقیق کے دلدادہ
رُوٹھ گئے ہم سے
سب کو کیا آزردہ

☆

غالب کے ثناخواں تھے
گپتا رضا صاحب
دانشورِ دوراں تھے

☆

بد بخت ہزارہ ہے
مرگِ رضا گپتا
اردو کا خسارہ ہے

آہ! گپتا رضا

نور منیری

غالب کے میکدے کا چھلکتا وہ جام تھا بادہ کشوں میں اس کا بڑا احترام تھا
اس کی بلائیں لیتی تھیں غالب شناسیاں وہ شخص نور گپتا رضا جس کا نام تھا

اُس کا حسیں خواب مکمل ہوا نہیں آئی کسی کو جیتے جی ایسی قضا نہیں
کہتی ہے جھلملا کے یہ شمع ادب کی لو اہلِ سخن ہزار ہیں لیکن رضا نہیں

94 / 234، سنجے پارک، لوہ گاؤں روڈ، پونے 411 032

تضمین بر غزل کالی داس گپتا رضاؔ

دلدار ہاشمی
64، ایروڈا، پونہ 006 411

تلاش عشق میں جب کوئی یار نکلے گا
جہاں کی بھیڑ میں اک انتشار نکلے گا
جسے بھی دیکھئے وہ بے قرار نکلے گا
"لب خرد سے یہی بار بار نکلے گا
نکالے ہی سے دل کا غبار نکلے گا"

سُنی ہے داستاں ہم نے یہ جاں نثاروں سے
اٹھائے جائیں گے انساں جب مزاروں سے
کسی کے ہوش اُڑیں گے انہی نظاروں سے
"اُگیں گے پھول خیالوں کے ریگزاروں سے
خزاں کے گھر سے جلوس بہار نکلے گا"

سماعتوں سے اُترتی ہے جب صدائے جام
لہو میں دوڑتی رہتی ہے تب صدائے جام
زباں سے دور نہ کرنا کبھی ثنائے جام
"کہیں فریب نہ کھانا، یہی فدائے جام
بوقت کار عجب ہوشیار نکلے گا"

زمانے بھر میں یہی وہم اب بھی جاری ہے
ہر ایک دن سے حقیقت میں رات بھاری ہے
یہی سبب ہے سحر ہر کسی کو پیاری ہے
"قرار ہی کا کھلا نام بے قراری ہے
ٹٹولو کوئی بھی دل بے قرار نکلے گا"

دیارِ غیر میں موسم عجب بنائے تھے
کسی کی چاہ میں ہم نے فریب کھائے تھے
دلوں کے کھیت میں سپنے عجب اگائے تھے
"چمن کا حسن سمجھ کر سمیٹ لائے تھے
کسے خبر تھی کہ ہر پھول خار نکلے گا"

کسی کے ساتھ یہاں کوئی ہمسفر نہ چلے
کسی بھی حال میں کوئی ادھر ادھر نہ چلے
یہ شرط ہے کہ کوئی شخص بے خبر نہ چلے
"یہ حکم ہے کہ کوئی شاہ راہ پر نہ چلے
ہوا کے گھوڑے پہ کوئی سوار نکلے گا"

یہ بات ہم کو بتائی گئی بہانے سے
کھلا ہے راز یہ دلدارؔ کے فسانے سے
پتہ چلا ہے ہمیں آج اک دوانے سے
"کسے نہیں ہے شکایت رضاؔ زمانے سے
اُٹھاؤ کوئی ورق داغدار نکلے گا"

تضمین بر غزل کالی داس گپتا رضاؔ

ریاضؔ بجنوری کامراج نگر، ایروڈا، پونہ 411 006

منظر پس منظر پر چھانے والا میں
صحرا صحرا پھول کھلانے والا میں
چاند ستاروں کو شرمانے والا میں
"دھرتی اَمبر سے ٹکرانے والا میں
دُکھ سے مٹی ہو ہو جانے والا میں"

دھرتی کے دل میں سیرابی مجھ سے ہے
ہری بھری رت کی بیتابی مجھ سے ہے
ڈالی ڈالی رنگ گلابی مجھ سے ہے
"سوکھے پھولوں میں شادابی مجھ سے ہے
بے رنگوں میں رنگ جمانے والا میں"

لفظوں کے تارے چمکے میں سو نہ سکا
حوالوں کی دھرتی میں خوشبو ا بو نہ سکا
شبنم کے قطروں سے کلیاں دھو نہ سکا
"پھلواری کے روپ کا ضامن ہو نہ سکا
نوکِ قلم سے پھول کھلانے والا میں"

خواب سے بھاری آنکھوں کا مقروض ہوں میں
نیند سے عاری آنکھوں کا مقروض ہوں میں
پیاری پیاری آنکھوں کا مقروض ہوں میں
"چند کنواری آنکھوں کا مقروض ہوں میں
بحر و بر سے آنکھ ملانے والا میں"

دل کی دھڑکن سننے والا تو ہے رضاؔ
لفظ سے نغمے بُننے والا تو ہے رضاؔ
سر اپنا ہی دھننے والا تو ہے رضاؔ
"شعر کی افشاں چننے والا تو ہے رضاؔ
زلفِ سیہ سے ہُن برسانے والا میں"

تاریخی ثمر ۔ ۲۰۰۱ء

ثمرۂ افکار شارق جمال، ناگپور

آہ ، شاعر گپتا رضا
۱ ۰ ۰ ۲ ء

ہزار حیف ، ماہر غالبیات
۱ ۰ ۰ ۲ ء

مونس ادب، محقق بر صغیر ہند و پاک
۱ ۰ ۰ ۲ ء

ثمرہ افکار - شارق جمال ناگپور
۱ ۰ ۰ ۲ ء

اب کہاں ہم میں گپتا رضا ہو گئے دور غالب شناس
سالِ تاریخِ رحلت لکھو آہ ! مشہور ، غالب شناس
۱ ۰ ۰ ۲ ء

قطعۂ تاریخ

جس کو پایا قلم بردوش
جو ہمیشہ رہا پُر جوش
جو کہ اردو کی تھا آواز
وہ رضا ہو گیا خاموش
۱ ۰ ۰ ۲ ء

مختار ٹونکی

قطعۂ تاریخ

خراج ہے یہ کالی داس گپتا کو
رضا کی ذات ہشت پہلو سے پرکھو
پئے تاریخ یہ مختار کہدو تم
'چراغ دیر' میں بس 'آج' کو رکھو
۱۴۱۸ء ۴

مختار ٹونک

قطعہ

شاعروں میں منتخب گپتا رضا
ناقدوں میں بو العجب گپتا رضا
آہ کے سر نے کہا ہو کر شریک
نازشِ اردو ادب گپتا رضا
۱ ۰ ۰ ۲ ء

حامی بلڈانوی، مالیگاؤں

قطعۂ تاریخ

ابراہیم اشک

(رضا صاحب قطعہ تاریخ بھی کہا کرتے تھے، وہ کہا کرتے تھے یہ فن بڑا مشکل ہے۔ بہت کم شعراء ہی اس میداں میں قدم رکھ پاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ہی میں نے اس میداں میں قدم رکھا۔ چونکہ یہ فن انھیں محبوب تھا اس لیے میں نے بطور خراجِ عقیدت ان کی یاد میں تاریخ قطعہ کہنے کی کوشش کی ہے۔

[مفعول فاعلن فاعلات فاعلات]

اردو کی آبرو گپتا رضا کالی داس

۴۵۱ ۱۴۲۴ ۱۲۶ = ۲۰۰۱

تحقیق و جستجو گپتا رضا کالی داس
جب تلک ہے چرچا اس جہاں میں غالب کا
نام تیرا کو بہ کو گپتا رضا کالی داس

رباعیات

تحقیق کی عظمت کو بڑھانے والے
افکار میں ندرت کو دکھانے والے
لکھتے رہے تاریخِ ادب اردو کی
وہ گپتا رضا سب کو لبھانے والے

اک فکر تھے احساس تھے وہ گپتا رضا
یعنی ادب شناس تھے وہ گپتا رضا
تحقیق کے اوراق یہی کہتے ہیں
اردو کے کالی داس تھے وہ گپتا رضا

تحقیق کو عروج دیا جس نے وہ رضا
غالب کو روشناس کیا جس نے وہ رضا
اردو کے نام پر تو کئی لوگ پل گئے
اک شخص تھا کہ کچھ نہ لیا جس نے وہ رضا

وہ کام کیا ہے کہ سدا یاد رہے گا
وہ نام کیا ہے کہ سدا یاد رہے گا
غالب کا ہر اک گوشہ ذہانت سے رضا نے
یوں عام کیا ہے کہ سدا یاد رہے گا

غالب شناس اہل ہنر اہل فن تھے وہ
گوشے میں اپنے گھر کے بہت ہی مگن تھے وہ
جو اُن کے پاس بیٹھا، ہوا محشر خیال
یعنی ادب کی ایک بڑی انجمن تھے وہ

ممتاز شاعر و محقق، ادیب و مصنف اور ماہر غالبیات پدم شری کالی داس گپتا رضؔا ممبئی

تاریخ انتقال سہ شنبہ ۲۴ر ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ مطابق ۲۱ر مارچ ۲۰۰۱ء بمقام نئی دہلی۔ آخری رسوم ممبئی

آہ چراغ اردو = ۱۴۲۱ھ
حیف عروف آفتاب اردو = ۲۰۰۱ء
جناب رضؔا گم شد = ۱۴۲۱ھ
آہ ! شاعر گپتا رضا = ۲۰۰۱ء
راہیٔ ملک عدم رضؔا = ۱۴۲۱

جو ادب کے حق میں تھا آبِ حیات
حیف اس نے آج پائی ہے وفات
جس کے غم سے سرنگوں اردو زباں
حرف اک اک آہ معروفِ فغاں
نازشِ اردو تھا وہ والا صفات
ذات جس کی تھی ادب کی کائنات
ہر نَفَس جس کا ادب کی واردات
جس سے روشن تھے ادب کے شش جہات
جس سے تھی رنگین اردو کی بساط
تھا ادب کے حق میں وہ آبِ حیات
حیف کالی داسؔ جیسا باصفا
ایک با اخلاق انسان اُٹھ گیا
قدرِ فکر و فن کا عنواں اُٹھ گیا
اُف ادب کا فردِ ذیشاں اُٹھ گیا
شہرِ اردو جس سے تھا آراستہ
اُس کو ڈھونڈے آج اس کا راستہ
فکر و فن کا جو تھا تاباں بانکپن
جو کہ تھا اردو زباں کا جانِ من
جس کی تنہا ذات تھی اک انجمن
انجمن در انجمن در انجمن
جس کے گھر اردو زباں تھی خیمہ زن
جس سے وابستہ تھا اک شہرِ سخن
وقف جس کی زندگی بہرِ ادب
جس کا گھر تھا وقت کا دار الادب
ایسی جامع شخصیت کو اے خدا
چھین کر کیوں لے گئی شامِ قضا
پھر کہاں سے پائیں ایسا دیدہ ور
ایسا شاعر اور ایسا بہرہ ور
پھر کہاں سے پائیں ایسا باہُنر
ایسا انساں ایسی فکرِ معتبر
ہمدم دیرینہ ویسا ہے کہاں
جس سے تھا آباد اردو کا مکاں
اک خلاء پھیلا ہے تا حدِّ نظر
ہے یہاں گم سم ہر اک فکرِ بشر
فکر و فن کی بجھ گئی ہر اک ڈگر
حیف باقی رہ گیا داغِ جگر

☆

رزّاق افسر
۳۹۱۳، بزم اردو
حیدر علی روڈ، لشکر محلّہ،
میسور

مراٹھی سے ترجمہ

علامہ کالی داس گپتا رضا

گلزار

کسی بُری خبر کو سن کر اسے برداشت کرلینا ایک انتہائی ناگوار خاطر بات ہوتی ہے۔ اور اگر یہ بُری خبر کسی کی موت کی ہو تو اسے برداشت کرے یا نہ کرے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ٹیگور نے کہا تھا کہ موت ہی ایک کویتا ہے۔ اس لیے موت کی وجہ سے ہونے والے خلا کو لفظوں سے پُر نہیں کیا جاسکتا۔ کالی داس گپتا رضا کی موت سے میں اور اردو کا ہر چاہنے والا غمزدہ ہے۔

ہندوپاک میں "غالب" پر اگر کسی دسترس رکھنے والے بااختیار محقق کی تلاش کی جائے تو کالی داس گپتا رضا کا نام سرفہرست ہوگا۔ ایک مستند ادیب، محقق، ناقد اور شاعر کی حیثیت سے میں اور مجھ جیسے ہزاروں شائقین کی نظروں میں کالی داس گپتا رضا ایک اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔

گپتا جی ہمیشہ ہشاش بشاش، تازہ و توانا، خنداں پیشانی سے ملنے والے، ایک باغ و بہار انسان تھے۔ اپنے رنج و غم کو کبھی ظاہر نہ ہونے دیتے۔ کم از کم میں نے تو ان کے چہرے پر کبھی بھی کوئی ناراضگی یا مردنی نہیں دیکھی۔ وہ صدا بہار تھے۔

میں جب سے ساہتیہ اکادمی کا ممبر ہوں اس وقت سے اُن کا میرا تعارف اور ساتھ رہا ہے۔ ہماری یہ دوستی صرف دو سال کو محیط ہے اور یہ دو سال میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ انمول سرمایہ دیوان غالب اور میرا کی پریم وانی یہ کتابیں گپتا جی کی شہہ پر مکمل ہوئی ہیں۔ کلام غالب کی تشریح اور غالب کی حیات کی گرہ کھولنے میں وہ غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔

ابھی دو ماہ پہلے ہی انھیں ایک انعام ملا تھا۔ اس کے لیے وہ آگرہ تشریف لے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ پنجاب گئے تھے اور لدھیانہ میں انہیں شرومنی ایوارڈ ملا تھا۔ لدھیانہ، چنڈی گڑھ، دہلی ہوتے ہوئے وہ لوٹے تھے۔ فی الحال وہ فراقؔ گورکھپوری پر کام کررہے تھے۔ ایک حصہ مکمل کرچکے تھے کہ ان کے انتقال کی خبر آگئی۔ ان کی موت سے ہندوستانی ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔

پنجاب جانے سے قبل وہ مجھ سے ملے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں وہاں جاکر شستہ پنجابی زبان سنوں گا۔ پنجابی زبان سیکھنا ہو تو پنجاب کے دیہات اور قریوں میں جانا چاہیے۔ ممبئی میں تو اب اصل مراٹھی بھی ختم ہوگئی، گجراتی کا بھی یہی حال ہے۔ مشینی شہروں میں زبان کا روپ بدل جاتا ہے۔ اصلی زبان مدارد ہوجاتی ہے۔ اگر اصلی مراٹھی زبان سننا ہے تو پونے، ستارا اور کولہاپور جانا ہوگا۔ یہی حال پنجابی کا ہے۔

ہر بھارتی کو کالی داس گپتا رضا کا احسان مند ہونا چاہیے۔ کیونکہ زبان کے معاملے میں وہ بہت وسیع

الفلمی سے کام لیتے تھے۔ ہر رباں سے انہیں پیار تھا۔ مراٹھی سے متعلق ان کا کہنا تھا کہ اگر کوئی پردیسی مہاراشٹر میں آٹھ دس دنوں سے زیادہ سیر و تفریح اور سیاحی کرتا ہے تو اسے مراٹھی سیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ مراٹھی زباں کی خوبی ہے۔

میں نے حت غالب پر سیریل بنائی۔ اس سلسلے میں مجھ سے کہنے لگے کہ آپ نے غالب کی کچھ تاریخیں ادھر اُدھر کردی ہیں۔ پہلی تاریخ کو دوسرے مقام پر اور دوسری تاریخ کو پہلے مقام پر رکھا ہے۔ جو مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔

میں نے پوچھا "کیا آپ کو سیریل ہی پسند نہیں ہے؟"

اس پر اس کا جواب تھا "میں ناراض ہوں، پھر بھی میں دیکھتا ہوں کہ آپ نے غالب کی شخصیت کو ایک الگ زاویہ سے نئی نسل کے سامنے پیش کیا ہے اور سنگیت بھی پسند ہے"۔ پھر وہ کہنے لگے "غالب کے اشعار پڑھنا ایک غار میں داخل ہونے کے مترادف ہے، اس غار میں داخل کوئی بھی ہو سکتا ہے لیکن غار سے باہر نکلنا نہ نکلنا یہ اس کی شعر فہمی پر منحصر ہے۔ کیونکہ غالب کا ایک شعر متعدد معنی اور تفسیر و تفصیل کا حامی و متقاضی ہوتا ہے۔ آپ موقع محل دیکھ کر غالب کا ایک شعر مختلف مواقع پر استعمال کر سکتے ہیں"۔

کالی داس گپتا رضا نے نہایت خوبی اور عرق ریزی سے غالب کے اشعار کی تشریح کی ہے۔

"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

کئی بار گفتگو کے دوران اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ غالب نے اسے اس طرح لکھا ہے

"دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

غالب اپنے اشعار میں رد و بدل خود ہی کیا کرتے تھے۔ الفاظ کو ادھر سے ادھر کرنا، شعر کہنے کے بعد اس پر خود ہی غور و خوض کرنا، یہ باتیں غالب کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھیں۔

یہ باتیں مجھے کالی داس گپتا رضا نے بتائی تھیں۔

غالب کی شاعری میں بھوپال، رامپور اور دہلی کا ادبی رنگ پایا جاتا ہے۔ گپتا صاحب نے ان رنگوں کی تلاش کے لیے بھی کلام غالب کا مطالعہ کیا تھا۔

میں نے آج ہی لاہور میں احمد ندیم قاسمی کو فون کر کے کالی داس گپتا رضا کے انتقال کی خبر دی ہے۔ خبر سن کر احمد ندیم قاسمی کی آواز بھر آئی۔ انھوں نے صرف اتنا کہا کہ "بہت بڑا نقصان ہوا ہے"۔

میں بھی کتنا صبر کرتا۔ اپنا دکھ سکال کے قارئین کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

(مراٹھی سے ترجمہ امین حزیں)

☆☆☆

کالی داس گپتا رضاؔ

سریش چندر ناڈکرنی

"   اُسے شاعری کہتے ہیں   رمانے کے مطابق چوٹی کے اونچے خیالوں اور خدمات کو پانی کی طرح بہاتے ہوئے، نغمہ ریز، مناسب الفاظ میں ادا کرنے کا دوسرا نام ہے"

سفید کرتہ اور پاجامہ جیسے سادہ لباس میں ملبوس، ہاتھ میں چھڑی اور قد آور مضبوط، بھرا بھرا جسم، گیہواں رنگ، ایک مستند عالم کی کشادہ پیشانی، لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے، اور نہایت ادب و احترام کرنے والے جناب کالی داس گپتا رضا۔ یہ اتر بھارت کی خاندانی تہذیب و تمدن کے چلتے پھرتے ثبوت تھے، نمونہ تھے یا یہ کہیے کہ وارث تھے!

انداز گفتگو نہایت شستہ، نرم گو، کبھی آواز چڑھا کر بات کی ہو، دیکھا نہیں گیا۔ آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر مافی الضمیر کا خلاصہ کرنے والے تقریباً عمر کی ۷۵ ویں منزل طے کررہے لیکن چہرے پر عمر کے کوئی آثار نظر نہیں آئے سوائے کچھ سفید بالوں کے۔

رضاؔ صاحب اردو ادب میں محقق، نقاد، شاعر، ادیب کی حیثیت سے مانے جانے والی شخصیت کے مالک تھے۔

آج تک آپ کی ساٹھ (۶۰) سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ایک درجن شعری مجموعے ہیں۔ "مرزا غالب" آپ کی ادبی تخلیقات کا مرکز ہیں۔ 'غالب' سے متعلق آپ کی سترہ (۱۷) تصانیف قبولیت عامہ پاچکی ہیں۔ "غالب" کی شاعری پر ان کی تحقیقات اردو ادب میں مخصوص درجہ رکھتی ہیں۔ دنیائے اردو میں بھارت کے ساتھ ساتھ پاکستان، بانگلہ دیش، ملیشیا اور امارات میں مستند تحقیق کا درجہ حاصل کیا ہے۔

رضاؔ صاحب کی زندگی پر بھی مختلف حضرات نے پندرہ (۱۵) کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ڈاکٹر راہیؔ قریشی نے رضا صاحب کی ادبی خدمات پر علیگڑھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ محترمہ عصمت بیگم نے رضا صاحب کی تخلیقات پر لاہور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی حاصل کی ہے۔

اردو ادب میں بھی سنگیت اور فن رقص میں استاد و شاگرد کے سلسلہ کی طرح سلسلہ جاری ہے اور ان سلسلوں سے خاندانی سلسلہ اور بھی پسندیدہ سلسلہ ہے جن میں مشہور و معروف شعراء کرام و ادباء کی تربیت و ہمت افزائی ہوتی رہتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ کہ ادب میں ماہر فنکار، استاد شعراء اور عالم و فاضل افراد اس میدان میں اپنے مراتب ودرجات پر فائز نظر آتے ہیں۔

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد حضرت ابراہیم ذوق دہلوی اور انہیں کے شاگرد حضرت داغ دہلوی۔ داغ کے معتبر و عزیز شاگرد جوش ملسیانی تھے۔ اور جوش ملسیانی کے شاگرد عزیز کالی داس گپتا رضا ہیں۔

دولت علم و ادب کے علاوہ "دولت زر" بھی رضا صاحب کی ہم نوا تھی۔ آپ کے ذخیرۂ کتب میں

ایک سے ایک قلمی نسخے، نایاب مجموعات شعر و سخن، تاریخی قلمی نوادرات کا چالیس ہزار سے زائد ذخیرہ موجود ہے۔ بی بی سی ٹی وی نے اس موضوع پر ایک ٹیلی فلم بھی جاری کی تھی۔ عرب امارات حکومت سال میں ایک بار "عالم فروغ اردو" کے نام سے دنیائے اردو کی خدمات کے سلسلہ میں ڈیڑھ لاکھ روپئے اور توصیفی سند سے نوازتی ہے۔ اردو دنیا کا یہ سب سے اعلیٰ انعام مانا جاتا ہے۔ اس انعام کے لیے بھارت، پاکستان، بانگلہ دیش، شری لنکا، ملیشیا، انڈونیشیا اور عرب کے ممالک سے انعام کے لیے لوگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

اس سال جناب کالی داس گپتا رضا صاحب کو متفقہ طور پر اکتوبر ۱۹۹۹ء میں دوحہ کے مقام پر ایک پُر وقار و شاندار جلسہ میں یہ انعام تفویض کیا گیا۔ اس سے قبل اسٹار ٹی وی اور زی ٹی وی نے اس خبر کو مشتہر کیا لیکن بھارت یا دوردرشن نے اب تک اس طرف توجہ بھی نہیں دی۔

۹۸-۱۹۹۷ء میں شاعرِ اعظم مرزا غالب کی دوسری صد سالہ سالگرہ منائی گئی۔ پاکستان، بانگلہ دیش ان دونوں پڑوسی ممالک میں مختلف مقامات پر اور مشہور شہروں میں سالگرہ کے جشن منعقد کیے گئے۔ اُن میں سے کئی شہروں میں کالی داس گپتا رضا صاحب کو اصرار کر کے مدعو کیا گیا تھا۔

حکومت پاکستان نے سالگرہ کے موقع پر مرزا غالب کی سوانح اور شاعری پر محصر معلومات چار جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے اور اس منصوبہ کے لیے رضا صاحب کو ہی ذمہ دیا گیا۔

اس معیار کے ادیب، شاعر، محقق، نقاد گزشتہ دو دہوں سے ممبئی میں مقیم رہے مگر "ڈی لٹ" جیسے خطاب جو حیرات کی طرح ممبئی، پونے، اورنگ آباد، کولھاپور، ناگپور وغیرہ یونیورسٹی ہی کیا بلکہ حکومت مہاراشٹر کو بھی رضا صاحب بحال کرنے کا خیال نہ آنا اردو کی بدقسمتی ہے یا حکومت مہاراشٹر کی؟ !!

لاہور یونیورسٹی سے عربی اور فارسی مضامین میں کامیابی سے اعلیٰ درجہ میں امتحان پاس کر کے بیرسٹری کے لیے لندن میں اقامت پذیر ہوئے مگر وا ہوری قسمت! بار ایٹ لا کا پہلا ہی سال مکمل نہ ہوا کہ خاندانی اور نجی کاروبار کی حصہ داری سنبھالنے کے لیے جنوبی افریقہ جانا پڑا۔ وہاں سے بھی رضا صاحب نے خط و کتابت کے ذریعہ اپنے استاد جوش ملسیانی سے رہنمائی اور اصلاح سخن لیتے رہے۔ طویل عرصہ سے جنوبی افریقہ میں مقیم رہنے کے بعد آپ ممبئی میں آکر بس گئے۔ اپنی "وظیفہ یاب" زندگی میں رضا صاحب نے اپنے آپ کو شاعری، تحقیق، تنقید اور تصنیف و تالیف میں معروف کر لیا۔ مشاعرے، جلسے، جلوس، نشستوں میں حاضری دینے کے بجائے آپ نے گوشۂ تنہائی میں رہ کر لکھنے لکھانے کو ترجیح دی۔ کلاسیکل سنگیت میں وہ دلچسپی رکھتے تھے۔ ستار بہت ہی ماہرانہ انداز میں بجاتے تھے۔

رضا صاحب کی تقریباً ساٹھ کتابیں شاعری کی جن میں خود کی نو (۹) تصانیف شامل ہیں، شائع ہوئیں۔ روایتی ترقی پسند اور جدید ادب اس طرح سبھی اصناف ادب و سخن میں آپ نے اپنے قلم کی روشنائی پھیلائی ہے۔
(مراٹھی سے ترجمہ : میں حزیں)

☆☆☆

اردو ادب کے 'کالی داس'

سنجے گوڑبولے

علامہ اقبال نے فرمایا تھا

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ — یا جاں پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں

اردو شاعری کی نزاکت سے دوسری کسی بھی زباں کا جانے والا انکار نہیں کر سکتا۔ اردو دکن میں پیدا ضرور ہوئی لیکن شمالی ہند کی آب و ہوا میں اس زبان نے پرورش پائی۔ مہاراشٹر میں اردو شعر و ادب کے چاہنے والے کثرت سے موجود ہیں۔

۲۱ مارچ ۲۰۰۱ء کی تاریخ اردو شعر و ادب کی دنیا کے لیے ایک اندوہناک خبر لے کر آئی کیونکہ اسی دن اردو کے معروف شاعر، ادیب اور ماہر غالبیات کا حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ ان کا نام پدم شری کالی داس گپتا رضا تھا۔ سوگوار سنجے گوڑبولے

کالی داس گپتا رضا ماہر غالبیات، محقق اور شاعر تھے۔ بیسویں صدی کے چند صف اوّل کے محققین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جنھوں نے رضا صاحب کی صحبتوں میں بیٹھ کر ان کی زبان سے جو کچھ سنا ہے، اسے دیکھ ایسا لگتا تھا جیسے ہم غالب اور ذوق کی محفل میں بیٹھے ہوں۔ رضا صاحب خالص پنجابی تھے۔ جالندھر کے پا مکند پور میں وہ ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی پیشہ ساہوکاری تھا۔ ان کے والد اپنے زمانے ڈگری یافتہ تھے۔ وہ فارسی زباں کے بھی جانکار تھے۔ ادب کے پرستار تھے۔ لاہور میں رضا نے بی اے کیا۔ ا کے بعد فارسی سینئر کیمبرج امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ لاہور ہی سے ادیب فاضل اردو اور منشی فاض فارسی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ لندن کے نامور انسٹی ٹیوٹ میں ان کو پڑھائی کرنے کا موقع میسر آیا۔ وہ بیر بنا چاہتے تھے لیکن بیرسٹری کی تعلیم کا وہ صرف ایک سال ہی مکمل کر سکے۔ بعد میں ان کو اپنے بزنس کے سل میں افریقہ جانا پڑا۔

بھگت سنگھ نے اپنے وطن کے لیے جاں قرباں کر دی۔ اس سے رضا صاحب کو تحریک ملی۔ انھوں ابتدا میں "جاں تک قربان کردوں میں وطن کے واسطے" یہ گیت لکھا۔ حسینہ کلاونت نے اس گیت کو گا کر پنجا کی فضاؤں میں آزادی کا جوش بھر دیا۔ گپتا رضا، گیانیشور اور شیواجی کو بھی پسند کرتے تھے۔ ان دونوں پر آ نے نظمیں لکھ کر ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ رضا صاحب نے کافی کتابیں لکھیں۔ آخری دنوں میں انھو

ے لکھنے کے لیے ایک منشی بھی رکھ لیا تھا۔ جو اُن کے مسودے صاف کر کے خوشخط لکھا کرتا تھا۔

رضا صاحب کو نایاب کتابوں کا ذخیرہ جمع کرنے کا بیحد شوق تھا۔ مخطوطات اور قلمی نسخے بھی۔ ان میں ۱۳۸۰ء کا ایک نایاب مخطوطہ فارسی کا بھی موجود ہے۔ ابو الفضل کے نواسے کا لکھا ہوا مخطوطہ انشائے ابو الفضل موجود ہے۔ دیوانِ غالب کی ۱۸۰ کاپیاں الگ الگ صورتوں میں ان کے پاس تھیں۔ غالب کلکش میں غالب کی ایک مثنوی "دعائے صباح" کا مخطوطہ حاصل کیا جس پر غالب کے دستخط تھے۔

غالب کے بھائی کی شادی کا شائع رقعہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔ ۱۸۶۲ء میں غالب نے علائی کو ایک خط لکھا تھا۔ یہ خط بھی رضا صاحب کے ذخیرہ میں تھا۔ ۱۸۴۱ء کا غالب کا پہلا دیوان جس پر سر سید احمد خاں کے بھائی کے دستخط تھے، اسے عکسی شائع کرنے کا اعزاز (پیش لفظ کے ساتھ) بھی رضا صاحب کو حاصل تھا۔ رضا صاحب نے غالب کے کل دو ہزار اشعار جمع کیے۔ ان میں وہ شعر بھی تھے جو خود غالب نے قلمزد کر دیے کیونکہ یہ شعر غالب کو پسند نہیں تھے۔

میں نے رضا صاحب کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔ وہ میرے استاد تھے۔ علم اور دولت دونوں کی دیوی ان پر مہرباں تھی۔ پونہ جب وہ تشریف لاتے تھے تو روز ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اردو کے علم عروض پر انھیں مہارت حاصل تھی۔ جب میں ان کو اپنا کلام سناتا تو وہ پل بھر کے لیے آنکھیں بند کرتے اور دوسرے ہی پل مصرع میں ترمیم کر کے اسے قابل بنا دیتے۔

موسیقی کے شیدا تھے۔ دوپہر کھانے کے بعد میری ان سے موسیقی پر کھل کر باتیں ہوتی تھیں۔ ستار دلربا اور طاؤس خوبی سے بجاتے تھے۔ اکثر میں انھیں کلاسیکل سنگیت کے کیسٹ سنایا کرتا۔ سن کر وہ سنگیت کی اچھائیوں اور خامیوں پر سیر حاصل تبصرہ فرماتے تھے۔ جب میں ان کے سامنے کوئی ساز بجاتا تو فوراً غلطی پکڑ لیتے جس طرح وہ شاعری کی غلطی پکڑتے تھے۔ آواز بہت اچھی تھی۔ جب میں کسی گیت کی دھن بجاتا تو وہ اس کے بول گا کر بتاتے تھے اور اس گیت کے بارے میں دیگر معلومات فراہم کرتے۔

افریقہ میں رہنے کے بعد ان کو سواحلی زباں بولنے کی عادت ہو گئی تھی۔ کبھی میرے ساتھ بولتے بولتے سواحلی بولنے لگتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ مراٹھی بول لیتا تھا۔

انہیں پرانی چیزیں دیکھنے کا شوق تھا۔ پرانے قلعے (مہاراشٹر کے) تمام انھوں نے دیکھے تھے۔ میرے ساتھ ان قلعوں کی تعمیرات اور ان کے تاریخی پس منظر سے لے کر ان کی فنی حیثیت پر کھل کر گفتگو کرتے تھے۔ پرانے قلعوں کی تصاویر کے زیراکس محمہ سے منگوایا کرتے تھے۔ ذوق کی طرح وہ علم نجوم سے بھی واقف تھے اور پامسٹری بھی جانتے تھے۔ میرے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر ستاروں کی پوزیشن بتاتے تھے جس کے لیے ان کو جنم کنڈلی دیکھنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ جب میں کوئی سوال کرتا تو مجھے ایک کورا کاغذ دیتے اور کہتے کہ اس پر لکیریں کھینچوں۔ یہ لکیریں تمہارے من کی لکیریں ہیں۔ میری کھینچی لکیروں کو دیکھ کر میرے

آنے والے دنوں کا حال بتاتے تھے۔ ان کو ہومیوپیتھی کا بھی اچھا علم تھا۔

کتاب لکھنے کے لیے وہ ممبئی سے پونہ آتے تھے۔ دن بھر لکھنے کا کام کرتے تھے۔ شام میں ان کے فلیٹ پر اکثر محفلیں جمتی تھیں۔ کبھی شاعری کی محفل، کبھی سنگیت کی محفل، کبھی تاریخ پر تبادلہ خیال، کبھی کسی کتاب کے اجراء کا پروگرام بنتا تھا۔

کالی داس گپتا رضا کی انفرادی خوبیوں کو بیاں کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ ایک بھی یونیورسٹی کو توفیق نہ ہوئی کہ ان کو "ڈی لیٹ" کی ڈگری تفویض کرے۔ ایک ملاقات میں رضا صاحب نے فرمایا تھا

ملک الشعراء خاقانیٔ ہند شیخ ابراہیم ذوقؔ دہلوی

پچھلے چند ماہ قبل کی بات ہے، سوسائی نامی انگریزی رسالے میں ذوق کے مزار اور غالب کے گھر کی تصویریں ایک رپورٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ ذوق کے مزار کا منظر اور غالب کے گھر کو لکڑیوں کی ٹال بنا دیا، یہ سب حال کر اردو زباں کے ایک ادنیٰ سے قاری کو بھی قلبی رنج پہنچ سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک ملاقات میں میں نے رضا صاحب سے ان کے تاثرات معلوم کیے۔ رضا صاحب نے بتایا "یہ بہت پرانی بات ہے۔ ذوق کے مزار کے پاس چار گھنے پیڑ تھے۔ ان پیڑوں کی چھاؤں کے درمیاں مزار ذوق تھا۔ یہ آرام گاہ ذوق کی ہے اس کی نشاں دہی کے لیے ایک پتھر آویزاں کیا گیا تھا جس پر فارسی میں ایک قطعہ لکھا تھا۔ یہ منظر میں نے خود دیکھا تھا۔ آج پہلے کی بہ نسبت منظر بدلا ہوا ہے۔ آج انگلینڈ میں شیکسپیئر کا گھر دیکھنے کے لیے دنیا سے ہزاروں لوگ انگلینڈ کا سفر کرتے ہیں۔ اور اپنے محبوب فنکار کا گھر اور اس کا ذاتی کمرہ جس میں بیٹھ کر شیکسپیئر کاروبار قرطاس کرتا تھا اسے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے یہاں یہ حال ہے کہ ہم اپنے پرانے شاعروں اور ادیبوں کو فراموش کرتے جارہے ہیں۔ ایسے میں ان کے گھر اور مزارات کے لیے فکرمند ہونے والا کون ہے"۔ رضا صاحب فرماتے تھے

"ذوق اپنے زمانے کے بڑے شاعر تھے۔ استادی میں تو کوئی ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ ذوق کا مزاج ظاہر ہے کہ پیدائشی شاعرانہ تھا۔ تصوف، فلسفہ، علم نجوم، خواب کی تعبیر اور علم منطق کے علاوہ علم موسیقی اور یونانی طب کا بھی علم رکھتے تھے۔ ذوقؔ نے جتنی بھی فارسی کتب کا مطالعہ کیا ہے اس کا حوالہ اپنی گفتگو میں دیا کرتے تھے۔ مشاعرے میں جب غزل سناتے تو ان کی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی۔ ذوقؔ فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ ذوق کی فکر پر اپنے وقت کے معروف شاعر سوداؔ کا اثر تھا۔ ذوق نے فرمایا تھا

سوئے قائل ہیں اب، اہل نظر ایسے نہ ہوتے تھے

ذوق جیسے فنکار کو ہم بھلاتے چلے جارہے ہیں۔ آج ذوق کا کلام کتنوں کو ازبر ہے"۔

(مراٹھی سے ترجمہ مدیر فتح پوری)

☆☆☆

علامہ کالی داس گپتا رضا کے فن اور شخصیت پر شائع شدہ کتابوں پر تبصرے

کالی داس گپتا رضاؔ
تحقیق و تالیف کی روشنی میں

مصنف ظفرادیب مبصر نیاز اعظمی

کالی داس گپتا رضاؔ، اردو کے ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر، صاحب طرز انشاء پرداز ادیب اور محقق ہیں۔ تحقیقی مقالہ یا تنقیدی جائزہ قلمبند کرنے سے قبل، جملہ مواد کا غائر مطالعہ کرتے اور نہایت حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ان کی تصنیفات، تالیفات اور تحقیقی یادداشتیں ان کی فکر رسا، فنی مہارت، باریک بینی اور کثرت مطالعہ کا مکمل و مدلل ثبوت ہیں۔ مطالعہ و تحقیق کے اس شوق میں انھوں نے ایک ذاتی کتب خانہ قائم کر رکھا ہے جو بجائے خود نادر و نایاب کتابوں، تذکروں، لغات، دواوین، قدیم رسالوں اور مخطوطات کا ایک شہر ہے۔ رضاؔ صاحب کے پاس غالبؔ پر سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ غالبا برصغیر ہند و پاک میں یہ امتیاز صرف کالی داس گپتا کو حاصل ہے کہ ان کے پاس صرف غالبیات پر تقریباً ۹۰۰ر کتابیں موجود ہیں۔ ظاہر ہے اس کتب خانہ کے لیے کثیر سرمایہ صرف ہوا ہوگا۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کالی داس گپتا بہت بڑے سرمایہ دار بھی ہیں اور سرمایہ کار بھی۔ ان کا اپنا ایک کاروباری دفتر ہے لیکن اس دفتر میں وہ صرف تین گھنٹے بیٹھتے ہیں اور اپنی ذاتی لائبریری میں دس گھنٹے روزانہ مطالعہ اور تحقیق و تدقیق میں گم رہتے ہیں۔ گیسوئے اردو کے سنوارنے میں یہ عرق ریزی جہاں اردو شعر و ادب پر ان کی دسترس و دستگاہ اور اردو سے ان کے والہانہ عشق کا ثبوت ہے وہیں اردو کے طالب علموں کے لیے ایک سبق ہے جاں نثاران اردو شرمسار ہوں گے کہ وہ کالی داس گپتا جیسی "جاں نثاری" کہاں سے لائیں۔ رضاؔ نے خاموشی کے ساتھ مطالعہ و تحقیق کے نتیجہ میں اردو شعر و ادب کو جو سرمایہ دیا ہے وہ دوسروں سے ادبی اجتماعات اور شعر و سخن کی محفلوں میں حاضری دے کر ممکن نہ ہوا۔ کالی داس گپتا رضا اردو کے محسن ہیں۔ اپنے اس محسن کو نہ اردو بھول سکتی ہے اور نہ اردو داں طبقہ۔ وہ اردو کے رشتہ سے آنے والی نسلوں کی ادبی و علمی رہنمائی کا فرض ادا کرتے رہیں گے۔ اردو کا یہ کالی داس رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔

چند سطریں ان لوگوں کی خدمت میں بھی پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو اردو کو کسی مخصوص فرقہ و طبقہ سے وابستہ کر کے خوش اور مطمئن ہو رہے ہیں۔ رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، منشی دیا رام نگم، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت برج موہن، تاتریہ، منشی پریم چند، کرشن چندر، پنڈت بالمکند عرش ملسیانی، جوش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، رگھوپتی سہائے فراق، راجندر سنگھ بیدی، رام لعل ڈاکٹر گیان چند اور کالی

داس گپتا رضا جیسی بے شمار شخصیات کی اردو دوستی کے باوجود کیا اردو زبان و ادب کو کسی مخصوص خانے میں محدود رکھا جاسکتا ہے؟ حقیقت سے چشم پوشی کی بجائے خود لاعلمی کی سند بن جاتی ہے ادب کو سیاست کے تاریک کمرے میں محبوس نہیں کیا جاسکتا۔ زبان کوئی بھی ہو کسی فرقہ یا طبقہ کی میراث نہیں ہوتی۔ یہ تہذیب و تمدن کلچر و ثقافت کے اظہار کا محض ایک ذریعہ ہے اظہار بیان کی صلاحیت جب تک انسانوں میں باقی رہے گی یہ وسیلہ بھی برقرار رہے گا۔ اس لیے اس پر کوئی مخصوص لیبل لگانا ممکن نہیں ہے۔

آخر میں زیر نظر کتاب کے تعلق سے مزید چند سطریں۔ ظفر ادیب صاحب نے فی الواقع کالی داس گپتا رضا کی شعری، علمی، ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں کا اجمالی جائزہ اس کتاب کی شکل میں پیش کر کے بلاشبہ گراں قدر خدمت انجام دی ہے لیکن مصنف نے کتاب کے ظاہری حسن پر کماحقہ توجہ نہیں دی۔ کتابت و طباعت پر مزید توجہ اور احتیاط کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کتابت و طباعت کے دوران بعض تکمیلی اور فنی مراحل جہاں دقت طلب ہیں وہاں زائد اور کبھی کبھی ناقابل برداشت مصارف بھی چاہتے ہیں جس کا متحمل کم از کم اردو مصنف نہیں ہو پاتا۔ اس سلسلہ میں ناشرین و طابعین توجہ دیں اور مصنفین کے ساتھ تعاون کریں تو عین ممکن ہے کہ یہ دشوار طلب مراحل بھی بحسن و خوبی طے ہو جائیں۔

کتاب کی اہمیت اور افادیت کا جہاں تک تعلق ہے یہ تصنیف ہر لائبریری، دار المطالعہ، ذاتی کتب خانوں اور کلکشن میں شامل ہونی چاہیے تاکہ اس گرانقدر تصنیف سے انہیں بھی خاطر خواہ فیض پہنچ سکے جو ذاتی طور پر اس کو خرید کر پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

☆☆☆

نمونۂ سعادت مندی : جہانِ گیتا رضاؔ

مصنف نذیر فتح پوری   مبصر ڈاکٹر معین الدین شاہینؔ اجمیری
صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈونگر پی جی کالج، بیکانیر

نذیرؔ فتح پوری ہمہ جہت اور ہمہ گیر ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی ادبی فتوحات اہل ذوق و نظر سے بھرپور حسنِ قبول حاصل کر چکی ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے تاہم یہ توقع وابستہ کرنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اردو کو آئندہ بھی مختلف موقر تصانیف و تالیف سے مالا مال کریں گے۔

نذیر فتح پوری اُن سعادت مند حضرات میں شامل ہیں جنھوں نے ہمیشہ اپنے اساتذہ کو قدر و منزل کی نگاہ سے دیکھا۔ اس امر کی غمازی ان کی مختلف تحریروں سے ہوتی ہے۔ "جہاں گیتا رضاؔ" بھی اسی قسم کی سعادت مندی کا نمونہ ہے۔ یہ کارنامہ کالی داس گیتا رضاؔ صاحب کی ۷۵ ویں سالگرہ (اگست ۱۹۹۹ء) کے موقع پر بطور خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔ رضاؔ صاحب ایسے اہل قلم کی خدمت میں اس سے بہتر ارمغاں اور کیا ہو سکتا تھا۔

"جہاں گیتا رضاؔ" کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے نذیر فتح پوری رقم طراز ہیں کہ

"اس کتاب کی تصنیف (کذا) کا خیال ۱۹۹۰ء میں اُس وقت آیا تھا جب میں محترم کالی داس گیتا رضاؔ صاحب کی کتاب "سہو و سراغ" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ رضاؔ صاحب کی تحقیق اور شاعری پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اُن کی نثر پر الگ سے کوئی کتاب نہیں ہے۔ یہی سوچ کر میں نے کتاب کا نام 'کالی داس گیتا رضاؔ کے نثری پارے' طے کیا تھا، لکھتے لکھتے درمیاں میں رضاؔ صاحب کی شاعری اور ان کے دیگر ادبی کارناموں کا ذکر آنے لگا تو مجھ سے دامن نہیں بچایا جا سکا۔ جب کتاب کی نوعیت بدل گئی تو مجھے نام بھی بدلنا پڑا۔ نیا نام "منثورات و شعریات گیتا رضا" طے پایا۔ لیکن قدرت کو اور ہی منظور تھا۔ انتہائی کوشش اور خواہش کے باوجود میں اپنے منصوبے کو آخری شکل نہیں دے سکا۔ اس درمیاں میری دوسری شعری اور نثری کتابیں منظر عام پر آتی رہیں۔ لیکن جس کتاب سے میرا روحانی تعلق تھا، میں اس کی تکمیل میں ناکام رہا۔ اس عرصے میں اتنا ضرور ہوا کہ جتنا کچھ لکھا تھا اس کی کتابت ہو گئی۔ پھر موقع محل کی مناسبت سے میں رضاؔ صاحب کی شخصیت اور شاعری پر مختلف مضامین بھی لکھتا رہا۔ یہ مضامین رسائل اور اخبارات میں شائع بھی ہوتے رہے اور یوں آٹھ نو سال کا طویل عرصہ بیت گیا۔ دوسری طرف رضاؔ صاحب کی زندگی اور ادبی کارناموں پر قمر جلال آبادی، مترنکودری اور اعجاز سیمابی کی کتابیں شائع ہو گئیں۔ ان کتابوں کی اشاعت نے پھر مجھے تازہ دم کر دیا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ موجودہ صدی کے اختتام سے پہلے پہلے اپنے پرانے خواب کو نئی صورت میں پیش کر دوں۔ پرانا مسودہ (کتابت شدہ) تلاش کیا۔ دیکھا تو مواد ایک کتاب کی ضخامت سے کم پایا۔ اب حالات اور وقت نئی تحریر کی اجازت نہیں دے

رہے تھے۔ میں اسی فکر میں غلطاں تھا کہ کیا کروں؟ موجودہ صدی ریت رتی کی طرح ہاتھوں سے پھسلی جارہی ہے۔ مزید تاخیر ہوئی تو ایک صدی پیچھے رہ جاؤں گا۔ تب قدرت نے رہنمائی کی۔ اچانک ذہن میں بات آئی کہ کیوں نہ مختلف اوقات میں لکھے ہوئے مضامین جمع کر کے کتاب کو مکمل کر لیا جائے۔ خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تمام مضامین جمع کر کے کتابت کیلئے دے دیئے۔" (جہاں گیتا رضا (نعت ماہی، صفحہ ۶، ۵، اسباق پبلی کیشنز، پونہ ۱۹۹۹ء)

اور اس طرح "جہاں گیتا رضا" کو منظر عام پر آنے کا موقع ملا۔ گو کہ "جہاں گیتا رضا" مستقل تصنیف نہ ہو کر مضامین کا مجموعہ ہے لیکن اس کے مشمولات ادبی حیثیت سے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور یہی سبب ہے کہ کالی داس گپتا رضا صاحب کے فکر و فن کی تفہیم میں یہ تمام مضامین ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

"جہاں گیتا رضا" کا پہلا مضمون "پونہ کا موسمی احوال" اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ مہاراشٹر اسٹیٹ کے دیگر اضلاع کے مقابلے پونہ کا موسم متوازن ہے اور اس قسم کا موسم شاعروں اور ادیبوں کو زیادہ راس آتا ہے تبھی تو مدیر صاحب نے لکھا ہے کہ "مجھے پونہ کے موسم بہت پسند ہیں۔ ہر موسم اپنی دلکشی، دلفریبی، خوشی اور خوش باشی کے سبب پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے، خصوصاً موسم باراں کی تو کیفیت ہی نرالی ہے۔ جب جولائی کے مہینے میں جھڑی لگتی ہے تو پورا ہفتہ دن رات بادل برستے ہیں لیکن اس انداز سے کہ کاروبار زندگی متاثر نہیں ہوتا۔ کبھی پھواریں گر رہی ہیں کبھی ننھی ننھی بوندیں برس رہی ہیں"۔ (صفحہ ۱۸)

غرض یہ کہ یہ مضمون پونہ کی دلکشی اور دلفریبی کو اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ قاری خود کو اسی ماحول کا ایک حصہ سمجھنے لگتا ہے اور ایسی ہی کیفیت یہ سطور قلم بند کرتے وقت مجھ پر بھی طاری ہو رہی ہے۔ اگلے مضمون میں کالی داس گپتا رضا صاحب کے مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختصر لیکن بھرپور تعارف پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مدیر صاحب نے اُن بیش قیمت لمحات کو بھی صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا ہے جب اُن کی کالی داس گپتا رضا صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس مضمون میں صاحب قلم کا لہجہ از حد متاثر کن ہو جاتا ہے۔ رضا تھے ہی ایسے شخص، کہ جو بھی اُن سے ایک مرتبہ نیاز حاصل کرتا، وہ تا دم حیات اُن لمحات کو اپنی زندگی کے خوشگوار لمحات قرار دیتا رہتا ہے۔ چنانچہ مدیر صاحب پر اسی نوع کے اثرات مرتب ہونا فطرت کے عین مطابق ہے۔ بقول خود "میری دستک پر دروازہ اتنی سرعت سے کھلا جیسے صاحب خانہ میرا ہی انتظار کر رہے تھے، دروازہ کھولنے والے خود رضا صاحب ہی تھے۔ میں نے صرف اپنا نام بتایا تو وہ پہچان گئے، انتہائی شفقت اور محبت سے ہاتھ ملایا اور مجھے ہال میں لے گئے۔ رضا صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ گویا تینوں کریڈٹ مجھے ہی جاتے ہیں، پہلی بار میں نے اُن کو خط لکھا، پہلی انھوں نے مجھے جواب لکھا اور پہلی بار شرف ملاقات بھی میں نے ہی حاصل کیا"۔ (جہانِ گپتا رضا، صفحہ ۳۱)

"کچھ رضا صاحب کی شاعری سے متعلق" عنوان سے لکھے گئے مضمون میں نذیر فتح پوری صاحب نے

بعض معاصرین ناقدین و مشاہیر کی تحریروں کی روشنی میں رضاؔ صاحب کی شاعری سے سیر حاصل بحث کی ہے۔
اس مضمون میں موصوف کا اسلوب مائل بطرنقاد ہونے کی گواہی دیتا ہے، چنانچہ عابد مامدوی، ملراج کومل، ڈاکٹر تاراچرن رستوگی، عبداللہ کمالؔ، صدر آہؔ، وارث علوی، اسلم انصاری وغیرہ کی تحریروں سے حرح کرتے ہوئے مدیر صاحب نے استنباط نتائج کی ایسی نظیر پیش کی ہے جو انھیں اردو کے متوازن ناقدوں کی فہرست میں قابل لحاظ مقام دلانے میں معاون ثابت ہوتی ہے، اور بجا طور پر یہ کہنے پر اکساتی ہے کہ وہ کسی بھی طرح کی انتہا پسندی سے محفوظ ہیں گو کہ رضاؔ صاحب سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے لیکن انھوں نے ہر قسم کی عقیدت و عصبیت سے دامن بچاتے ہوئے حق بجانب رائے دی ہے۔

رضاؔ صاحب نے جہاں اردو کی مروجہ اصناف میں ادب تخلیق کیا ہے وہیں مذہبی شاعری بھی کی ہے، اس کا ثبوت ان کی تخلیق کردہ حمد، نعت، منقبت، نوحہ، سلام وغیرہ اصناف سے بھی فراہم ہوتا ہے۔ نومبر ۱۹۷۹ء میں رضا صاحب کا ایک شعری مجموعہ بعنوان "غم حسین" شائع ہوا تھا۔ جس میں بقول مدیر فتح پوری سلام، نوحے، رباعیات، قطعات اور مناقب شامل ہیں اور یہ تمام تخلیقات امام حسین اور اہل بیت اطہار کے متعلق ہیں۔ اس مجموعے پر مختلف ناقدوں نے اپنے اپنے طور پر رائے قائم کی تھی۔ یہاں اس کی تفصیل کا محل نہیں لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مدیر فتح پوری کے مندرجہ ذیل بیان پر غور فرمائیے تاکہ اہل بیت اطہار سے رضاؔ صاحب کی گہری عقیدت کا اندازہ ہو سکے، چنانچہ مدیر فتح پوری رقم طراز ہیں کہ

"جہاں تک رضاؔ صاحب کی اہلبیت سے محبت کا سوال ہے، اس بات کا سب سے بڑا ثبوت تو رضاؔ صاحب کا تخلص ہی قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اہل بیت کے لیے "صبر و رضا" لازم و ملزوم استعارے ہیں اور انہی میں سے ایک کو رضاؔ صاحب نے اپنے نام کا جزو بنالیا ہے۔ یہ تخلص کالی داس گپتا کے نام کے ساتھ ایسا چسپاں ہوا ہے جس کا جواب نہیں یعنی "کالی داس گپتا رضا"۔ (جہاں گپتا رضا، صفحہ ۵۲،۵۱) مضمون میں جابجا رضاؔ صاحب کے اشعار سے عالمانہ بحث کی گئی تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے پائے۔

"شعلۂ خاموش" رضاؔ صاحب کی اوّلیں شعری تخلیق تھی جو تصنیفی صورت میں منظر عام پر آئی تھی۔ جب یہ مجموعہ منظر عام پر آیا تو ہند و پاک کے سنجیدہ اور باضابطہ قارئین چونک پڑے اور مطالعے و مشاہدے کے بعد اُن حضرات نے قلم برداشتہ ہو کر "شعلۂ خاموش" کے محاسن پر سیر حاصل مضامین و مقالات سپرد قلم کیے جو ہند و پاک کے موقر رسائل و جرائد میں طبع ہوئے اور رضاؔ صاحب کے شاعرانہ کمال کو قدر دانی کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ "جہاں گپتا رضا" میں دو اہم مضامین شامل ہیں جن میں ایک کا عنوان ہے "شعلۂ خاموش ہندوستانی مبصرین کی نظر میں" اور دوسرے کا "شعلۂ خاموش پاکستانی مبصرین کی نظر میں" ہے۔ دراصل نذیر فتح پوری صاحب نے ہند و پاک کے متعدد رسائل و جرائد کی ورق گردانی کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے مبصرین نے "شعلۂ خاموش" کے متعلق کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا اور جب انھوں نے دونوں

ممالک کے مصرین کے مضامین کا مطالعہ و مشاہدہ کرلیا تو اپنے تئیں دو الگ الگ عناوین کے تحت ان تمام مصرین کی رایوں سے اتفاق و اختلاف کرتے ہوئے منصفانہ اور صحت مندانہ رائے قائم کرنے کی سعی فرمائی۔

مذکورہ مضامین میں جن ہندوستانی مصرین کی آراء سے بحث کی گئی ان میں جناب محبوب الرحمٰن (شب خون الہ آباد)، اعجاز صدیقی (شاعر، ماہنامہ شاعر)، محمد اکبر الدین صاحب صدیقی (سب رس، حیدر آباد)، جناب طالب کاشمیری (شیرازہ سرینگر)، جناب آغا حشر کاشمیری، جناب ع م ش (نقش کوکن، ممبئی)، جناب گوپال متل (تحریک دہلی)، جناب مختار احمد مطاہری (دوام ٹانڈہ)، جناب شمس کول (گگن ممبئی)، مشہور نغمہ نگار جناب شکیل بدایونی مرحوم، علامہ آرا حسی گوری، اور بعض دیگر معروف و غیر معروف مصرین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اسی طرح پاکستانی مصرین میں مولانا ماہر القادری (فاران کراچی)، کامل القادری (افکار)، جناب س ل (معلوم نہیں مکمل نام کیا ہے راقم) ہمدرد صحت ڈائجسٹ) وغیرہ حضرات کے نام شامل ہیں۔ اس مضمون میں مدیر صاحب نے اس قدر اختصار سے کام لیا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کرنے والی کہاوت صادق آتی ہے، لیکن خوشی کا مقام ہے کہ اختصار کے سبب جامعیت متاثر نہیں ہوئی۔

رضا صاحب کی تاریخ گوئی سے متعلق لکھا گیا مضمون "گپتا رضا اور تاریخ گوئی" کے زیر عنوان زیر بحث کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ رضا صاحب کی تاریخ گوئی سے متعلق مدیر فتح پوری صاحب کا یہ بیان وثوق سے خالی نہیں کہ "مشہور شاعر اور رضا صاحب کے برگزیدہ خواجہ تاش یعنی جناب جوش ملسیانی کے شاگرد، جناب ساحر ہوشیار پوری کا دہلی (فرید آباد) میں انتقال ہو گیا۔ میں نے (جبکہ میں بمبئی میں ان کے دولت کدے پر حاضر تھا) رضا صاحب سے تاریخ وفات کے لیے گذارش کی اور یہ بھی عرض کیا کہ آپ نے اپنے بزرگ دوست جناب مالک رام کی وفات کی تاریخ بھی نہیں کہی۔ رضا صاحب نے فرمایا کہ "کل پونہ کو جاتے ہوئے لیتے جایئے گا"۔ دوسرے روز میں نے تاریخی قطعہ تو حاصل کر لیا مگر گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا کہ آپ نے تاریخیں تو بہت کہی ہوں گی۔ آپ نے ہاں میں جواب دیا مگر یہ بھی فرمایا کہ میں نے ان کا ریکارڈ نہیں رکھا۔ البتہ استاذی قبلہ کی وفات پر جو تاریخی قطعات کہے تھے وہ کتاب میں چھپ چکے ہیں"۔ (صفحہ ۱۲۴، ۱۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ رضا صاحب نے بکثرت تاریخی قطعات کہے لیکن ریکارڈ محفوظ نہ ہونے کے سبب ان کی تعداد کا اندازہ دشوار ہے لیکن نذیر فتح پوری نے اپنے محولہ بالا مضمون میں مختلف موقعوں پر کہی گئی تاریخیں درج کی ہیں، اُن سے رضا صاحب کی کہنہ مشقی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں خصوصاً قاضی عبد الودود، ظ انصاری اور ساحر ہوشیارپوری کی وفات سے متاثر ہو کر کہی گئی تاریخیں قابل قدر ہیں اور جگر جالندھری کے مجموعہ کی تکمیل اور نذیر فتح پوری صاحب کے مکان سائرہ منزل کی تعمیر کے موقع پر کہی گئی تاریخ بھی رضا صاحب کی استادانہ صلاحیت کی گواہی دیتی ہے۔

کالی داس گپتا رضا صاحب کی شاعری سے قطع نظر "جہاں گپتا رضا" میں ان کے بعض نثری فن پاروں

پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ رضا صاحب کے نثری فن پاروں کے متعلق مدیر فتح پوری لکھتے ہیں کہ

"رضا صاحب نے اپنے ان نثری فن پاروں کے ذریعہ یہ ثابت کردیا ہے کہ فلسفہ کی شمولیت کے بغیر بھی فن پاروں کو روح پرور اور حیتی جاگتی زندگی کا ترجماں بنایا جاسکتا ہے، لیکن علمی ادبی بھائش کے ساتھ ساتھ اس کام کی تکمیل کے لیے خود شناسی اور خود آگہی کی اشد ضرورت ہوتی ہے جو ادیب رشتوں کی خوشبو، پھولوں کی مسکراہٹ، حسن کی شادابی اور جمالیاتی قدروں کا عرفاں حاصل کرنے کا مجاز نہیں ہوتا وہ ادب و شعر اور فنون لطیفہ کے کسی بھی شعبے میں قابل قدر یا قابل رشک دستگاہ نہیں رکھ سکتا رضا صاحب کے اسلوب سے متعلق میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ ان کے نثری فن پاروں کا اسلوب دلچسپ بھی ہے اور لطافت سے بھرپور بھی، سطر سطر میں بے ساختگی اور رواں دواں انداز محسوس ہوتا ہے"۔ (جہاں گیتا رضا، صفحہ ۸۵، ۸۴)

مدیر فتح پوری نے کالی داس گپتا رضا کے نثری شہ پاروں کے تحت اُن کے سوانحی مضامین کے مجموعے "یگانے بیگانے" میں شامل چند سوانحی خاکوں یعنی "ماں"۔ "گھسیٹا" اور "درگا دیوی" کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اسی ذیل میں "عدل بابا" کا سوانحی خاکہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ فاضل مؤلف نے نہ صرف مذکورہ خاکوں کا تجزیہ ہی پیش کیا ہے بلکہ بعض خاکوں کا اصل متن بھی درج کیا ہے تاکہ اصل متن اور تجزیے کی روشنی میں متعلقہ خاکوں کی خصوصیات واضح ہو سکیں۔ "درگا دیوی" کے خاکہ کے متعلق مدیر فتح پوری رقم طراز ہیں کہ

"درگا دیوی رضا صاحب کے اپنے خانداں کی کہانی ہے۔ یہ کردار پرایا نہیں بلکہ رضا صاحب کے والد بزرگوار کی لاڈلی بہن کا کردار ہے۔ اس کردار کو رضا صاحب نے اوّل تا آخر ملاحظہ کیا ہے۔ دیکھا بھالا ہے آخری دنوں میں اس کے ساتھ رہے ہیں اور اس کے سامنے کھیلے ہیں"۔ (جہاں گیتا رضا، صفحہ ۱۰۰)

"عدل بابا" ایک ایسے شخص کی کہانی (سوانحی خاکہ) ہے جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا زندہ و جاوید مظہر ہے۔ "عدل بابا" قومی یکجہتی کے جذبے سے سرشار ہے اسی لیے اُس کی شخصیت نے رضا صاحب کو متاثر کیا اور یہ خاکہ عالم وجود میں آگیا۔

"گھسیٹا" کے خاکے کے متعلق مدیر صاحب کا بیاں ہے کہ

"گھسیٹا کا تعلق بھی اسی گاؤں سے ہے جو رضا صاحب کا گاؤں ہے۔ رضا صاحب کے بیاں کے مطابق گھسیٹا ایک گویّا تھا، ایک اچھا فنکار تھا، ایک غریب آدمی تھا، رضا صاحب امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن دونوں میں ایک ایسا رشتہ تھا جسے ہم آفاقی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رضا صاحب بھی ایک شاعر تھے ایک فنکار تھے اس لحاظ سے دونوں میں ایک شاعر اور گلوکار کا رشتہ تھا"۔ (جہاں گیتا رضا، صفحہ ۸۷) اور شاید یہی وجہ تھی کہ رضا صاحب نے قلم برداشتہ ہو کر گھسیٹا کی تمام تر خوبیوں اور شخصی اوصاف کو شاعرانہ ہی نہیں بلکہ فنکارانہ طریقے سے بے نقاب کیا ہے۔

"ماں" کے متعلق رضا صاحب نے اپنے جن قلبی جذبات کا اظہار کیا ہے، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ

رضا صاحب کس درجہ حساس طبیعت کے مالک تھے۔ اُن کی تحریر کو پڑھ کر یہ بات اور بھی پختہ ہو جاتی ہے کہ رضا صاحب گہری حد ماتیت اور حساس طبیعت شخص تھے۔ "ماں" کے تعلق سے ان کا یہ بیان قابل قدر ہے

"اے پیاری ماں! تو نے اپنی گود میں مجھے کھلایا، تو نے اپنے دودھ سے میری رگاں دھوئی، میری لڑکھڑاتی ہوئی اوّلیں چال کو سنبھالا۔ اس انوکھی دنیا کے اجالوں میں میری آنکھوں کے سپوتے وا کیے۔ تو جو پتھروں، تالابوں، ندیوں کے گیلے اور پھسلنے والے کناروں پر ندروں، شوالوں اور آسمانوں کی چوکھٹوں پر میرے لیے منتیں مانتی پھری، تو نے میرے آنسو پونچھے اور میری نس نس میں قہقہیں بھر دیے۔ میں آج بھی کتنا چاہتا ہوں کہ ایک بچہ بن کر تیری ماتا بھری گود کی گرماہٹ میں ڈوب جاؤں اور پھر آنکھ نہ کھولوں"۔ (ص ۱۵۵،۱۵۴)

"کالی داس گپتا رضا ایک کرم فرما۔ ایک رہنما" کے زیر عنوان یہ وضاحت کی گئی ہے کہ رضا صاحب ایک قابل قدر شاعر اور فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے شخص ہیں جن کی شخصیت طرح طرح کے انسانی اوصاف لیے ہوئے ہے اور اسی وجہ سے ایک عالم اُن کا والہ و شیدا رہا ہے۔ مدیر صاحب نے اس سلسلے میں کیا خوب وضاحت فرمائی ہے کہ

"رضا صاحب ایک بڑے سرمایہ کار رہے ہیں۔ کروڑوں میں کھیلنے والے، مگر انھوں نے کبھی اپنی دولت کی نمائش نہیں کی۔ وہ معمولی سے معمولی آدمی کو بھی اپنے ساتھ بٹھائیں گے اور برابری کا موقع دیں گے۔ ایک ساتھ کھائیں گے، پئیں گے، ایک ساتھ اٹھیں بیٹھیں گے۔ ان کے دکھ درد میں اپنے دکھ درد کی طرح شریک رہیں گے اور یہ صفات ان کی بیگم میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں"۔ (صفحہ ۱۳۷) غرض کہ رضا صاحب کی شخصیت تمام تر اعلیٰ انسانی اقدار سے عبارت ہے۔

"جہانِ گپتا رضا" کا ایک مضمون "کچھ تلامذۂ رضا سے متعلق" کے عنوان سے درج کتاب کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں اُن کے غیر معروف تلامذہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ لوگ جو آج ادبی دنیا میں مشہور و معروف ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی ادبی حیثیت کو بنانے میں رضا صاحب کی محنت اور کوشش بھی شامل رہی ہے، لیکن کوئی دو چار لوگ ہی ہوں گے جنھوں نے دیانت داری سے رضا صاحب کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے۔ رضا صاحب خود بھی اس بات کا اعلان کرنے سے کتراتے ہیں کہ ان کے تلامذہ میں کون کون شامل ہیں اور اُن کی تعداد کتنی ہے، کیونکہ رضا صاحب نے اپنے بزرگوں کے سب لوگوں کو دیے گئے استادانہ مشوروں اور اصلاحوں کو مشورۂ محض قرار دیا ہے گوکہ یہ عمل شاگردی اور استادی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جنھوں نے ایمانداری سے رضا صاحب کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے وہ قابل تعریف ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل درست ہے کہ اگر ان کے تمام معروف و غیر معروف تلامذہ کا ذکر کیا جائے تو ایک مبسوط تحقیقی مقالہ درکار ہوگا۔ استادی اور شاگردی سے جڑی ہوئی ایک چیز وہ بھی ہوتی ہے جسے مشورہ یا اصلاح کا نام دیا جاتا ہے۔ مدیر صاحب نے اس ذیل میں اپنے مضمون "رضا صاحب کی اصلاحیں" کے تحت اپنے کلام پر کی گئی بعض اصلاحوں کی نشاندہی کی

ہے۔ نذیر فتح پوری دیانت دار اور فراخدل شاعر و فنکار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے واضح طور پر اپنے ایسے اشعار نقل کیے ہیں جن پر رضا صاحب کی بھرپور اصلاح ہوئی اور اُن اشعار نے آگے چل کر مقبول عام کا درجہ حاصل کیا۔ اس مضمون کے متعلق نذیر صاحب کی یہ وضاحت بڑی اہم ہے کہ

"رضا صاحب کی اصلاحوں پر لکھنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن میں نے نمونے کے لیے ایسے ہی شعر پیش کیے ہیں جو میرے موضوع کی تکمیل کے لیے کافی تھے" (جہاں گیتا رضا، صفحہ ۶)

"جہانِ گیتا رضا" میں ایک مضمون وہ بھی شامل ہے جس کا عنوان "رضا صاحب" ہے۔ دراصل یہ مضمون سہ ماہی "تناظر" دہلی کے "گیتا رضا نمبر" (۱۹۷۷ء) کے لیے سپردِ قلم کیا گیا تھا لیکن موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے زیر بحث کتاب میں بھی جوں کا توں درج کیا گیا ہے تاکہ وہ قارئین جن کی نظر سے 'تناظر' کا شمارہ نہ گزرا ہو وہ بھی رضا صاحب کے متعلق بعض اہم معلومات سے آگاہ ہو سکیں۔ دراصل یہ ایسا مضمون ہے جو رضا صاحب کی سوانح، شخصیت، شاعری، شری فتوحات اور بعض دیگر فنکارانہ اوصاف کو بے نقاب کرتا ہے۔ میری نظر میں یہ مضمون ایسا تحفہ ہے جو ایک شیدائے اپنے کرم فرما کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

اس جائزے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کالی داس گپتا رضا صاحب کے فکر و فن پر لکھی گئی تمام کتابوں اور رسائل و جرائد کے خصوصی شماروں اور مضامین کے مجموعوں کی طرح "جہاں گیتا رضا" بھی امتیازی اہمیت، حیثیت کا حامل ہے بلکہ اس میں بعض ایسی معلومات یکجا کی گئی ہیں جو دوسرے ذرائع سے معلوم نہیں ہوتیں۔ رضا صاحب اور نذیر فتح پوری صاحب میں دیرینہ تعلقات تھے۔ رضا کو نذیر صاحب نے قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا، اور ان کے متعلق انھوں نے جو کچھ محسوس کیا اُس کا ذکر اس قدر موثر انداز میں کر دیا کہ ہر ایک قاری مسرور و مسحور ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی بھی ادیب یا اہل قلم کی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے جو نذیر فتح پوری صاحب کا مقدر رہی۔ اہل اردو پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نذیر صاحب کی مساعی کو ہاتھوں ہاتھ لیں اور اُن کی تحریروں کا گرم جوشی سے خیر مقدم کریں۔

☆☆☆

उनका जो फर्ज है अरबाबे सियासत जाने
मेरा पैगामे मुहब्बत है जहाँ तक पहुंचे

शायरी की दुनिया

पूना मे शाय होने वाला एक अदबी रिसाला

चीफ एडिटर : सुरेश चंद्र सुरतवाला

एक्झीक्यूटिव एडिटर : सय्यद आसिफ

कीमत फी शुमारा : १५ रूपए

शोअरा से [illegible]

अपनो ताजा [illegible] एं

SURESH CHANDRA SURATWALA
112/B, Patil Plaza, 493, Parvati, Pune - 411 009
Ph. : 4441264